پہچانتے تو ہوں گے ندا فاضلی کو تم
(سورج کو کھیل سمجھا تھا چھوتے ہی جل گیا)

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

Weston
PRESENTS
Insight
GEET DOHE
NAZM GHAZALS
by Jagjit Singh
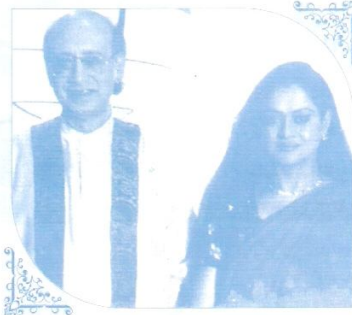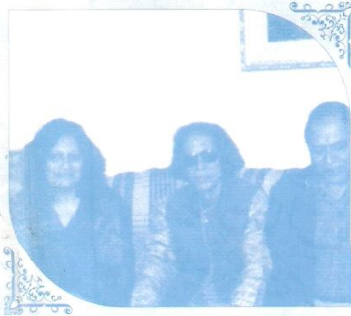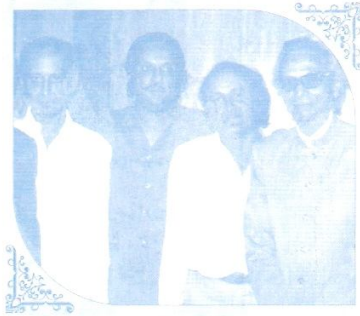
زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسو

جلد:۱۵ شمارہ:نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء

مجلس مشاورت

قارئین چہارسو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شکیبانہ

چہارسو کا زیرِ نظر شمارہ'

محبت کے اُن ازلی' ابدی

رشتوں سے منسوب ہے

جو ہر طرح کی بندش اور قدغن

سے ماورا' آفاقیت کی

دلیل ہیں!

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

مدیر معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537، ویسٹرج-III، راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، ٹرنک بازار، راولپنڈی

متاعِ چہارسُو

ورق در ورق......... شعیب زیدی

قرطاسِ اعزاز......................ادارہ

گونجِ آواز................وفا نقوی 4

گلوں کے دریاں................قاری شا 5

شبستانوں کے عاشق..........عذرا اصغر 8

براہِ راست................ محمد ارشد جاوید 11

آئینہ خانہ سے دور..........ڈاکٹر شمیم حنفی 14

کوئی ترمیم نہیں..........پروفیسر شفیق اللہ 16

منتظر کرگت کار..........ڈاکٹر پریکی رومانی 21

زندگی کی کشتی.............انور ظہیر خاں 24

مولا تیری دہائی ہے......پروفیسر قاسم امام 32

دیواروں کے بیچ...............رتن سنگھ 34

ڈالیوں پہ پھول..........عبدالاحد ساز 36

روپ روشن..................عذرا اصغر 43

تم سے محبت ہے............مصطفیٰ ملک 45

افسانے

چکر.............................جتیندر بلو 47

تحفہ..............................مشتاق عقلی 55

داغ نہ لگ جائے...........فرخندہ شمیم 56

سانجھ ڈھلے....................رینو بہل 58

تقدیس کا رشتہ..............محمد ارشد جاوید 61

قلبِ سلیم

عبدالعزیز خالد.......................... 67

گلشنِ تازہ

مشکور حسین یاد، انور سدید، امجد اسلام امجد، محمود الحسن، یوگیندر بہل تشنہ، سرور انبالوی، صابر آفاقی، یزد ساغر، اکبر حمیدی، غلام مرتضیٰ راہی، صدیقی شاہد، تالب عرفان، خیال آفاقی، حمیدہ معین رضوی، فراغ روہوی، انور فیروز، ماجد سرحدی، ملک زادہ جاوید، حفیظ انجم، خورشید انور رضوی، دل نواز دل، سہیل غازی پوری، نصیر کجاہی، کرامت بخاری، صابر عظیم آبادی، علی آذر، ارمان نجمی، سیفی سرونجی، حسیر نوری، مشتاق شبنم، اکرام تبسم، شگفتہ نازلی، سیف الرحمن، انور جاوید ہاشمی، عزم بہزاد، طالب انصاری، احمد ظہور، جاوید ہمدانی، پرویز ساحر، اور کنہا حجلی۔ 68

نشانِ راہ 85

اردو زبان اور لسانیات ..ڈاکٹر مشتاق صدف 90

نیم عصر تحریک.......... حمیدہ معین رضوی

آئینۂ فن 94

طوفان کی آہٹ.............ارمان نجمی

سرمایۂ امم 97

توکل فنا پہ اثر..........ڈاکٹر انور سدید

نظمِ عصر 99

محسن بھوپالی، ستیہ پال آنند، امجد اسلام امجد، تالب عرفان، یونس صابر، یوگیندر بہل تشنہ، دل نواز دل، علیم صبا نویدی، عادل حیات، ماجد سرحدی، رب نواز مائل، وفا چشتی، حسیر نوری، مشتاق شبنم، شگفتہ نازلی، ناصر شہزاد

تخلیقِ عصر 108

نازو مصائب کا تعارف...... عطیہ سکندر علی

رس رابطے 113

جستجو ترتیب و تدوین..........اعجاز کھوکھر

O O O

○○○

قرطاسِ اعزاز

ندا فاضلی

کے نام

○

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی

☆

کہیں کہیں سے ہر چہرہ تم جیسا لگتا ہے
تم کو نہ بھول پائیں گے ہم ایسا لگتا ہے

☆

اور تو سب ٹھیک ہے لیکن کبھی کبھی یوں ہی
چلتا پھرتا شہر اچانک تنہا لگتا ہے

☆

جو ساتھ ہے وہی گھر کا نصیب ہے لیکن
جو کھو گیا ہے اُسے بھی مکان میں رکھنا

☆

وہ ایک خواب جو چہرہ کبھی نہیں بنتا
بنا کے چاند اُسے آسمان میں رکھنا

☆

وہ میری پرچھائیں ہے یا میں اُس کا آئینہ ہوں
میرے ہی گھر میں رہتا ہے مجھ جیسا ہی جانے کون

☆

جانے کیا کچھ بول رہا تھا سرحد پیار کتابیں خون
کل میری نیندوں میں چھپ کر جاگ رہا تھا جانے کون

گوش بر آواز

وقار قادری

نام: عزنا فضلی

پتہ: B/201، سن رائز، آرام نگر II، ورسوا، اندھیری

(ویسٹ) ممبئی۔ 400 061

پیدائش: 12 اکتوبر 1940ء (گوالیار)

تعلیم: ایم۔اے (اردو، ہندی)، وکرم یونیورسٹی، اُجین

تصنیفات:

(شاعری۔اردو) لفظوں کا پُل [اشاعت اول] ۱۹۷۱ء

لفظوں کا پُل [اشاعت دوم] ۱۹۹۸ء

سورا ج۔ دسمبر ۱۹۷۸ء

آنکھ اور خواب کے درمیان ۱۹۸۲ء

کھویا ہوا سا کچھ ۱۹۹۶ء

شہر تو میرے ساتھ چل ۲۰۰۲ء

(نثر۔اردو) ملاقاتیں (تنقید) ۱۹۸۶ء

دیواروں کے بیچ (ناول)

دیواروں کے باہر (ناول) ۲۰۰۰ء

چہرے (مشاعروں کے شاعروں پر خاکے) ۲۰۰۲ء

(شاعری۔ہندی) سورا ج

آنکھوں بھرا آکاش

کھویا ہوا سا کچھ

سفر میں دھوپ تو ہو گی

ہم قدم

عزنا فضلی کی شاعری (انتخاب، ترتیب کے۔ایل

تدن)

(گھر لوٹی) ترتیب، پیش لفظ داغ دہلوی

جگر مرادآبادی

جاں نثار اختر

نریش کمار شاد

حسن نعیم

فراق گورکھپوری

احمد فراز

محمد علوی

بشیر بدر

عزنا فضلی

اعزازات: غالب ایوارڈ (برائے ادب)

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (برائے "کھویا ہوا سا کچھ")

ایم۔پی شاسن ساہتیہ پرشد پرسکار (برائے "ملاقاتیں")

بے۔ دیال ہارمونی ایوارڈ دہلی (برائے شاعری)

روٹری ایکسیلینس ایوارڈ (برائے ادب)

اکرتی ایوارڈ، بہترین نظموں کے لئے (برائے قلم "سحر")

اس کے علاوہ جناب عزنا فضلی کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے مختلف ریاستوں مہاراشٹر، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان اور بہار نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

کئی فلموں میں گیت تحریر کیے اور فلمی دُنیا کو کئی معیاری گیت دیے۔

مختلف ٹی وی سیریل تحریر کیے اور ای۔ٹی وی کے پروگرام اُردو بازار اور یوٹی وی کے شاعری پروگرام کی نظامت بھی فرمائی۔ ان کی شاعری کئی بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

آپ نے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، برطانیہ اور یو۔اے۔ای میں ہندوستانی ادب کی نمائندگی کی ہے۔

گُلوں کے درمیاں

قاری نامہ

شمس الرحمٰن فاروقی
۲۹ جولائی ۱۹۹۹ء الہ آباد

کچھ دن ہوئے تمہارا خط اور نظمیں ملی تھیں بہت خوشی ہوئی۔ جو نظمیں ترجمے کے لئے زیادہ مناسب معلوم ہوئیں ان کا ترجمہ سری نیتی نے کر دیا ہے میں نے بھی دیکھ کر اطمینان کر لیا ہے امید ہے تم پسند کرو گے ترجمے اشاعت کے لئے بھجوا دئیے ہیں ایک نقل تمہارے لئے مرسل ہے پرسوں تمہاری کتاب "آنکھ اور خواب کے درمیاں" بھی مل گئی بہت بہت شکریہ..... ! "سوغات" میرے پاس موجود ہے اس کے لئے تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جمیلہ نے تمہاری نظمیں بہت پسند کیں سلام لکھوا رہی ہیں۔ "شب خون" کے لئے تمہارے کلام کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر کرامت علی کرامت
۲۸ فروری ۱۹۹۹ء

"دیواروں کے بیچ" کا حسین تحفہ موصول ہوا آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے سوانحی حالات قلم بند کئے ہیں۔ شاعری کی طرح آپ کی نثر میں بھی بڑی شگفتگی اور دلکشی ہے بہت کم لوگ ہیں جو انشائیے کے انداز میں اس قسم کی نثر لکھ سکتے ہیں۔ یوں تو ہر سال اردو میں متعدد کتابیں چھپتی رہتی ہیں لیکن اس قسم کی کتاب بہت کم نظر سے گذرتی ہے قرۃ العین حیدر نے "کارِ جہاں دراز ہے" میں ناول کی شکل میں اپنے سوانحی حالات قلم بند کئے تھے۔ انشاء اللہ میں اس کتاب پر "نئی شناخت" میں تبصرہ دوں گا۔ نئی شناخت کیلئے اپنی کوئی تازہ تخلیق مرحمت فرمایئے ممنون ہوں گا۔

آصف فرخی
۲۳ مئی ۱۹۹۹ء گلشن آباد کراچی

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ جواب دیر سے لکھ رہا ہوں کہ میں تین ہفتے کے لئے امریکہ گیا ہوا تھا۔ نیویارک میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ اس دوران ہندوستان میں کیا کچھ لکھا جا رہا ہے اور قابلِ ذکر کتاب کون سی چھپی ہے انہوں نے آپ کی کتاب "دیواروں کے بیچ" کا ذکر کیا اور اس قدر تعریف کی کہ میرے دل میں اس کے پڑھنے کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ اس سے پہلے "شاعر" میں اس کی کئی قسطیں پڑھ چکا تھا پھر یہ سوچا کہ ہندوستان کی کتاب کراچی میں تو مشکل سے ملے گی آپ کو خط لکھ کر اس کی فرمائش کروں گا۔ خیال آیا کہ آپ کا پتہ پاس نہیں "شاعر" ہی کے پتے پر لکھوں گا۔ یہ مصمم ارادہ کر کے واپس آیا۔ گھر آ کر ڈاک دیکھی اور آپ کی کتاب نظر آئی تو نہ پوچھئے کس قدر خوشی ہوئی۔ اس رات Jet lag کے مارے نیند نہ آئی۔ Jet lag کا ترجمہ داؤد رہبر صاحب نے (اڑن خمارہ) کر رکھا ہے تو کتاب پڑھنا شروع کر دی اور پھر تو یہ کیفیت ہو گئی کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ صاحب! کمال کی کتاب ہے۔ زندگی کے تجربے سے دھڑکتی اسلوب بیان کی تازہ کاری سے چمکتی ہوئی اور دیکھنے والی نظر کے اجالے سے بھری ہوئی یہ کتاب کیا ہے سرشار کر دینے والی ایک کیفیت ہے۔ غرض اس کو پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ اتنی عمدہ کتاب دی اور جرأت مندانہ کتاب لکھنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے اور مجھے اس کتاب کی لذت انگیز مسرت میں شریک کرنے پر بے حد شکریہ!

وارث علوی
۱۵ جولائی ۱۹۹۹ء احمد آباد گجرات

تمہاری کتاب "دیواروں کے بیچ" حال ہی میں شائع ہونے والی نثری کتابوں میں ایک امتیازی مقام کی مستحق ہے اسے میں نے بہت دلچسپی اور یکسوئی سے پڑھا احباب میں کتاب پر چھینا جھپٹی رہی اور کتاب بالآخر امریکہ محمد عمر میمن کے پاس چلی گئی کہ میری تعریف پڑھ کر وہ بھی اس کا منتظر تھا۔

"دیواروں کے بیچ" تمہاری شائستہ فکر، رچی ہوئی زبان اور دلپذیر اسلوب کا بے مثال نمونہ ہے ایک اچھے نثر نگار کی اتنی خوبیاں تمہاری ذات میں جمع ہو گئی ہیں کہ داد دیتے ہوئے قلم رکتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ نثر نگار شاعر سے قد آور نظر آنے لگے تم اُن چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہو جن کی شاعری اور نثر دونوں دل کو چھوتے ہیں۔ انسان اور زندگی کی طرف تمہارا گمبھیر، گہرا، دانشمندانہ رویہ بہت اچھا لگا۔ تمہارے والد، والدہ، سلام مچھلی شہری کے خاکے غیر معمولی ہیں۔ اب میا موضوع تو تمہارے ہاتھ آنے سے رہا لیکن میں چاہوں گا کہ اب تم شاعری پر لکھنا شروع کرو۔ میں تمہاری تنقیدی صلاحیت کا اُس وقت سے قائل ہوں جب کہ میں نے فیض پر تمہارا مضمون شخصیات نمبر (صابر دت) میں پڑھا تھا۔ ادھر شہر یار پر بھی اچھی چیز لکھی ہے امید ہے تم خیر و عافیت ہو گے۔

بیدار بخت
۷ مئی ۱۹۹۹ء کینیڈا

خدا آپ کو خوش رکھے ایک بار پھر آپ نے جی خوش کر دیا۔ مجھے کے لوٹ کر دلی میں رات گئے ٹیلی ویژن پر ایک صاحب کے گانوں، غزلوں کا پروگرام دیکھ رہا تھا انہوں نے ایک نظم شروع کی ہے "مل" شاعر کا نام انگریزی قاعدے کے مطابق Small Print میں تھا جس کا ہونا قانونی طور پر اہم ہوتا ہے مگر عام طور پر پڑھا نہیں جاتا۔ اگلے روز بہت کم تلاش کے بعد گانوں کا وہ کیسیٹ مل گیا کینیڈا میں۔ گھر آ کر جب دوبارہ سنا تو اندازہ ہوا کہ پہلا رد عمل ٹھیک نہ تھا نظم اچھی تھی بہت اچھی تھی۔

بھائی تشبیہیں تو جوشؔ بھی لکھ لیتے تھے مگر فن کی تشبیہیں پڑھ کر آدمی مرعوب ہو جاتا ہے لکھنے والا بڑا قابل ہے آپ کی نظم نے تو ایک پیکر تراشا ایسا کہ یقیناً میرے دل میں تھا یہ تصویر تو میں دیکھ چکا ہوں نہ صرف دیکھ چکا ہوں بلکہ شکر گذار ہوں اس وسیلے کا جس نے یہ تصویر ایسی مصور کر دی کہ میں سب کچھ بھول کر اس میں ایسا کھویا ہوں کہ نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ خیال بھی نہیں آیا کہ شاعر کو اس کی نادر تشبیہات پر داد دینی چاہئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو لاکھ بار سن چکا ہوں اور

آپ کی نظم کے طفیل ابن صاحب کی غم بھری کو بھی معاف کر چکا ہوں جنھوں نے
اسے گلایا۔ دوستوں کو نہ صرف سنایا بلکہ اس کی کاپیاں بنا کر بھی دے چکا ہوں (یہاں
آپ کے پبلشر کی درگذری بھی درکار ہے) کوپی جتنا رنگ بہتیں آئے ہوئے تھے۔
وہ بھی میری رائے سے متفق ہیں اور شمس الرحمٰن فاروقی بھی جو آج کل امریکہ میں
ہیں اور جن سے بات ہوتی رہتی ہے لکھتے رہئے۔

مشفق خواجہ

۲ جون ۱۹۹۷ء ناظم آباد کراچی

آپ کی کتاب "دیواروں کے بیچ" جو آپ نے کئی ماہ پہلے بھیجی تھی وہ
اب کہیں دست بدست مجھ تک پہنچی ہے۔ جن کرم فرماؤں نے یہ آپ بیتی حاصل کی ہے
انہیں کسی اور نے دی تھی اور یہ صاحب جو تاخیر کا سبب ہیں تو کتاب ان کے پاس کئی
مہینے پڑی رہی اور وہ اسے اس کی منزل تک پہنچانا بھول گئے۔ اس تاخیر کی معذرت
میں ہی کئے لیتا ہوں کہ اصل مجرم کو اس کا احساس ہی نہیں کہ انہوں نے اس
کتاب کو مجھ تک تاخیر سے پہنچا کر کتنے برے اخلاق کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

اس آپ بیتی کی کچھ قسطیں ماہنامہ "شاعر" میں پڑھیں تو اسی وقت
احساس ہو گیا تھا کہ یہ کچھ مختلف سی کتاب ہے اور اب مکمل کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم
ہوا کہ اردو میں اچھی کتابوں کا لکھا جانا انہونی سی بات نہیں ہے۔ زمانۂ حال میں بھی
ایسا ہونا ممکن ہے۔ ہمارا تو نے اس کتاب کو ایک یادگار کتاب بنا دیا ہے۔ ایک بیان
واقعہ ہے اور دوسرا اسلوب بیان۔ آپ نے بڑی جرأت سے بعض ایسے ذاتی
واقعات بھی لکھ دئے ہیں جو کوئی دوسرا لکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ سچ لکھنا بہت مشکل
کام ہے اور جب سچ لکھا جاتا ہے تو یا تو اپنی گواہی خود دیتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں
کہ آپ کا سچ "سچ" ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔

اسلوب بیان کے اعتبار سے آپ نے آپ بیتی نہیں لکھی ادب تخلیق
کیا ہے۔ یہ اسلوب دوسروں سے مختلف بھی ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد
بھی۔ آپ نے سیدھی سادی وقائع نگاری نہیں کی، ادبی رنگ پر واقعہ کی بازیافت کا کام
انجام دیا ہے۔ ایسے ہی کام "کارنامہ" کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں آپ کے
ذاتی حالات سے قطعاً ناواقف ہوں، اس لئے مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے کون کون
سے واقعہ کو بیان نہیں کیا۔ لیکن دوران مطالعہ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہاں
کچھ "چھوڑ" دیا گیا ہے۔ خصوصاً عشرت کے حوالے سے آپ نے جو کچھ لکھا ہے
اُسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے کچھ درمیانی کڑیاں چھوڑ دی ہیں۔ اس کے
باوجود پڑھنے والے کو آپ سے نہیں عشرت ہی سے ہمدردی ہوتی ہے۔ یہ بھی آپ ہی
کی کامیابی ہے۔ آپ سے ممبئی میں جو ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان کی یادیں ہنوز تازہ
ہیں۔ خدا کرے سب خیریت سے ہوں۔

ڈاکٹر محمد حسن

۲۳ ستمبر ۱۹۹۷ء دہلی

آپ کا تازہ مجموعہ "کھویا ہوا سا کچھ" موصول ہوا۔ اس کی اشاعت پر
بار ور کہنے کا شکریہ۔ بعض حضرات نے دامن کھینچ لیا۔ یہ اطمینان ہوا کہ اب آپ نے
اپنا طرز پا لیا ہے اور اسے حالات کے موافق اور اپنے مزاج کے موافق بنانے کا گر
بھی جان لیا ہے۔ البتہ تعجب اس بات پر ہوا کہ آپ بھی اب نظموں سے دست کش ہو
رہے ہیں اور آپ کی فکر کی دھانی غزلوں میں اور تو اور دوہوں میں زیادہ ابھر کر سامنے
آ رہی ہے۔ البتہ ان حضرات میں جو خاصے کی چیز نظر پڑی وہ دوہوں والے [illegible]
پر آپ کا "خود اعتمادانہ" رد عمل ہے جو ایک نئی ہوئی سی کی کہانی ہے۔ "غلط نشانہ جو
ہوا سو ہوا" والی غزل میں نمایاں ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور اردو شاعری کی معتبر
آواز۔ مبارکباد قبول کیجئے کہ اس رد عمل کو اتنے دھیرج اور اتنے فن کارانہ تحمل سے
بیان کر پائے ہیں۔ بہرحال آپ کا یہ مجموعہ آپ کے پچھلے مجموعوں سے ایک قدم
ضرور آگے ہے اور آج کل کی ..... شاعری میں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

"معاصری ادب" بند ہو گیا اور آپ کا گوشہ نکلنے کا ارمان بھی یونہی رہ
گیا۔ نئی بات البتہ کھٹکتی رہ گئی کہ اپنی نظموں کی فکر کر ذرا کشادگی اور وسعت دیجئے اور
آپ کے ایک پُراشتیاق پڑھنے والے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ نظموں کو ذرا اور
وسعت دیجئے کہ اتنے اختصار سے جی نہیں بھرتا۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن

■ اکتوبر ۱۹۹۸ء گڑگاؤں ہریانہ

"کھویا ہوا سا کچھ" اور "دستکوں کا پل" خوبصورت تحفے ہیں۔ میرے
لئے شوق سے پڑھوں گا۔ یوں آپ کو پڑھتا رہتا ہوں منفرد انداز ہے آپ کا۔ اکثر یہ
محسوس ہوا ہے کہ آپ بات کہہ دیتے ہیں، زبان سے بے اختیار نکلتا ہے You
said it! کیا آپ ہی نے کہا تھا؟

گھاس پر کھیلتا ہے ایک بچہ
پاس ماں بیٹھی مسکراتی ہے
مجھ کو حیرت ہے جانے کیوں دنیا
کعبہ و سومنات جاتی ہے

اس طرح بات کہہ دینے کے انداز نے آپ کے کلام کو منفرد حیثیت
دی ہے۔ یہ شاعری بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جو شاعری سوچنے پر مجبور
کرتے ہوئے جمالیاتی انبساط بخشے وہی اچھی شاعری ہوتی ہے۔ آپ کی شاعری
یقیناً اچھی شاعری ہے۔

[illegible] دلی آئیے تو فون ضرور کیجئے۔ پچھلے برس آپ کی خود نوشت
سوانح حیات "دیواروں کے بیچ" ملی تو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اُسے پڑھ کر آپ نے
میری خود نوشت سوانح حیات "آشرم" نہیں پڑھی۔ اُسے پڑھئے تو یقیناً کچھ کہہ
دیجئے۔ ایک مختصری نظم ہو جائے۔ خوش رہئے، مسکراتے رہئے۔ بابا سائیں سے ملنے کی
ضرور کوشش کیجئے گا۔ بچوں نے میرا نام بابا سائیں رکھ دیا ہے۔ جس نے اس نام سے
اُن کے لئے ۱۲ کہانیاں لکھی تھیں۔ آس پڑوس کے بچے بھی مجھے اسی نام سے پکارتے

ہیں۔ اب دوست احباب بھی مجھے بابا سائیں کہتے ہیں (بابا سائیں/ بابا سائیں)۔ یہ نام مجھے بہت پسند آیا اس لئے کہ یہ نام بچوں نے دیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ عبادت میں مصروف رہتا ہوں اور دنیا بھر کے لوگوں کو دعائیں دیتا رہتا ہوں۔ میرے مر جانے کے بعد میری قبر پر جو بھی اپنی آرزو لے کر آئے گا اس کی آرزو پوری ہوگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ مزار کے پاس آ کر اردو یا فارسی کا کوئی خوبصورت شعر سنائے۔ شعر سن کر بابا سائیں جھوم گیا یعنی اُس کی روح جھوم گئی تو سمجھئے آرزو پوری ہوگی۔ اس کے لئے نعمان فاضلی صاحب آپ کو بہت سے اچھے اشعار کی تخلیق کرنی ہوگی۔ ان لوگوں کے لئے جو بابا سائیں کے پاس آئیں گے۔ ظاہر ہے بابا سائیں میر و غالب کے اشعار نہیں سنیں گے انہیں تو وہ عمر بھر اوڑھنا بچھونا بنا چکے ہوں گے۔ اچھے اشعار سنیں گے تو نعمان فاضلی اور ایسے دوسرے اچھے شعراء کے۔ آپ کا بابا سائیں۔

اقبال مجید

۱۰ جنوری ۲۰۰۹ء، بھوپال

ابھی میں آپ کو مبارکباد دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اخباروں میں بشیر بدر کو پدم شری ملنے کی خبر پڑھی۔ ظاہر ہے کہ آپ کی شاعری اور بشیر بدر کی شاعری میں وہی فرق ہے جو اکادمی کے انعام اور ملکی قومی اعزاز میں ہو سکتا ہے۔ آپ کی مثال کندملی ہوگی اور بشیر کی مثال خالص کشمیری شیشے کی۔ خیر اعزاز تو بہر حال اعزاز ہی ہے۔ ہمارا کام مبارکباد دینا ہے سو قبول فرمائیے۔

مصطفیٰ کریم

[illegible] اپریل ۲۰۰۹ء، [illegible]

آپ کی کتابیں ”دیواروں کے بیچ“ اور ”دیواروں کے باہر“ مجھے بہت پسند آئیں۔ ان کا اسلوب تہہ داریاں لئے ہوئے گرد و پیش کے انوکھے رُخ اور جگہ جگہ خوبصورت اور بامعنی اشعار۔ ان سب نے آپ کی تخلیق کو ادب کا گراں قدر سرمایہ بنا دیا ہے۔ افسوس ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے۔ اس ملک میں اُردو دنیا چراغِ سحری ہے اور پاکستان میں ادب پر دانشوری لادی گئی ہے اور اس کی آنکھ پر سبز چشمہ چڑھا دیا گیا ہے۔ اس لئے مشکل ہے ان کتابوں کو پاکستان میں وہ شہرت ملے جس کی یہ مستحق ہیں۔

یہ صرف میرا نہیں آپ کا بھی المیہ ہے۔ کتابوں کے چند اشعار میں مجھے اپنی زندگی کی جھلکیاں نظر آئیں اور کئی چند باتیں مشترک ہیں۔ میری والدہ بھی کراچی میں دفن ہیں، میں بھی اپنے نام کے ساتھ سید نہیں جوڑتا۔ جہاں کہیں بھی آپ کی تخلیق نظر آتی ہے میں ضرور پڑھتا ہوں۔ میں نقاد نہیں لیکن یہ لکھنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ آپ نے ترقی پسند ادب کا شاندار تسلسل برقرار رکھا ہے اور اپنی شاعری کو وہ موضوع دیا ہے جس سے بیشتر شاعری محروم رہی ہے۔ ایک دو نکات لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

کولمبیا میں بان سین ڈن (کاگا) ہیں (دیواروں کے بیچ میں اس کا ذکر نہیں ہے)۔ اسی لئے کولمبیا میں بہت بڑا انگیت کمپلیکس ہوا کرتا تھا۔ جہاں آپ نے رومیلا تھاپر اور ہربنس مکھیا کا سیکولر تاریخ دانوں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے وہاں آپ عرفان حبیب کا ذکر کرنا بھول گئے۔ جہاں آپ کی دلچسپ محبتوں کا ذکر آیا ہے وہاں

قاری کو آپ کی شاعری میں دلچسپی ہونے لگی ہے کیا اس کی نوبت نہیں آئی؟ پھر بھی آپ کا خانہ آباد رہا تو یہ اور بھی بڑا فخر کا ہوگا آپ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ اس لئے بے تکلف لقب استعمال کیا ہے۔ امید ہے آپ نے برا نہیں مانا ہوگا؟ خوش رہئے۔ کسی اُردو ادیب کا قلم کے سہارے نقارے زندگی گزار دینا آسان نہیں ہے۔

رشید حسن خاں

۱۲ جنوری ۲۰۰۹ء، شاہجہاں پور، یوپی

کتاب کا تحفہ ملا۔ آپ نے یاد رکھا اور یاد کیا اس کے لئے ممنون ہوں اور شکر گزار بھی۔ لکھنے پڑھنے والوں کے لئے کتاب سب سے اچھا تحفہ ہے، خاص کر اُس صورت میں جب وہ دلچسپ بھی ہو۔ میں نے کتاب پوری کی پوری پڑھ لی۔ دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوا کہ جب تک کتاب ختم نہ ہوگئی کوئی دوسرا کام یاد ہی نہیں آیا۔ خط میں اپنی رائے کیا لکھوں، جب وہاں آنا ہوگا (چند ماہ بعد) تب زبانی عرض کروں گا اور تفصیل کے ساتھ اور بعض جملوں کی خاص طور پر داد بھی دوں گا۔

عذرا پروین، لکھنؤ

آپ کو عید کی مبارکباد کے ساتھ ساتھ ”کھویا ہوا سا کچھ“ کے لئے بھی شکریہ۔ اس کتاب کے کور پر خاص دھیان دینے کا شکریہ، اچھی غزلیں، نظمیں کشی کرنے کا شکریہ۔ میرے خیال سے شکریوں کا اچھا خاصا بجٹ ہو گیا ہے۔ ارے ہاں یہ فلیپ نگار بندہ کون ہے جس نے نام نہ دے کر ایک اور تجسس پر ابہام کی ہے۔ یہ کس مصور کے پردے میں ادب کا کون سا غذا انڈیل دیا ہے اور بول دیا ہے تو چھپ چھپ کر کیوں بول دیا ہے؟ اسے ذرا میری طرف سے گا دیجئے۔

ذرا سامنے تو آؤ چھلیے

چھپ چھپ چھلنے میں کیا راز ہے؟

جب فلیپ نگاری اختیار کر ہی لی تو اب کیسا شرمانا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ فلیپ نگاری اپنی کتاب پر آپ کو خود کرنی چاہئے تھی اور وہ نظم جو میری نظم کے نام سے آپ نے تمہید میں درج کی ہے وہی فلیپ کے کنارے میں درج ہو جاتی تو کیا خوبصورت منظر ہوتا۔ خیر خوش رہئے کہ آپ نے میری ماں کو چنا، چکی بنا دیا، جس کی مانند ہم بہت ڈرتے ہیں۔ مرغے کی آواز پر کنڈی کی طرح کھلنے والی مائیں نہیں ہیں بلکہ اور بند ہو جانے والی مائیں ہیں۔ اللہ میرے معصوم بچوں پر رحم کرے اور بچوں کی ماں پر بھی۔ آپ کی کتاب کا کور پہلے والی کتاب ”دیواروں کے بیچ“ سے بہت اچھا ہے کیا کریں یہ میری کمزوری ہے کہ ہم کور کے رنگوں میں جتنا گھل مل جاتے ہیں اسی طرح کتاب سے تعلق استوار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ بچپن میں پڑھایا گیا تھا کہ Dont judge a book by its cover ہم کو آپ کی ایک غزل کا ایک ہی شعر بہت اچھا لگا

بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں، جانے کہاں گئیں

بچے پرانے اِک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

شبستانوں کے عاشق

ندا فاضلی

بھیڑ کے شور وغل سے اُکتا کر اُس نے ایک سوئی تلاش کر کے سامنے طاق میں رکھ دی اور وہ ہر روز اُس کے سامنے بیٹھتا رہا۔ اور ہر روز وہ سوئی بڑھتی رہی .... پھیلتی رہی۔ اور پھر یوں ہوا کہ اُس کے دونوں ہاتھ آکاش کے دونوں کناروں کو چھو رہے تھے اور پوری دھرتی کے آسمانی پھیلاؤ کو ناپ رہے تھے .... ایک دن خود اس کے پڑوس کے کھیت میں فصل مرجھانے لگی۔ دُور دُور تک کہیں بادل نظر نہیں آئے۔ اُترے ہوئے چہرے سوکھی ہوئی گٹھڑیاں۔ وہ اُس دن بھی حسبِ معمول سوئی کے سامنے جا بیٹھا لیکن اُس دن سوئی اور اُس کے رشتہ کی نوعیت عام دنوں جیسی نہ تھی۔ اب سوئی اور اُس کے درمیان سوکھا ہوا کھیت بھی آ گیا تھا۔ اُسے اِس تبدیلی کا احساس نہیں تھا ... مگر جیسے ہی وہ سامنے گیا اُس کا سر چکرا گیا۔ بڑھتی گھومتی رہتی تھی سوئی اپنے آفاقی پھیلاؤ کو سمیٹ کر اپنے اصلی سائز میں واپس ہو چکی تھی۔ اُس نے غصے میں آ کر سوئی کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ لیکن جب اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو عجیب عالم تھا .... سوئی اُسی طرح چھوٹے طاق میں کھڑی ہوئی مُسکرا رہی تھی اور خود وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھرا پڑا تھا۔

سوئی نے اُسے دھوکا دیا تھا یا اُس نے اپنے آپ سے فریب کیا تھا یا آج تک معمہ ہی ہے۔ مگر جب اُس نے فرش پر بکھرے ہوئے اپنے ٹکڑوں کو سمیٹ کر اٹھایا تو چہرہ مہرہ و مطلع تو اُسی کا تھا مگر اب بھی اُسی سوئی کے قریب بیٹھتا ہے لیکن اب وہ اُس میں آکاش اور دھرتی کے پھیلاؤ کے بجائے نقوش کا تناسب اور چہرے کے کٹاؤ کا حسن تلاش کرتا ہے۔

ہم جب کسی سے ملنے جاتے ہیں تو اُس شخص کو جس سے ہمیں ملنا ہے اپنے گھر سے ساتھ ہی لے کر چلتے ہیں۔ یہ ملاقات نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ لائے آدمی کو دوسرے کی کرسی پر بٹھانے کی زبردستی ہوتی ہے اور اتفاق سے اگر کوئی آپ کے ساتھی کے لئے کرسی نہیں چھوڑتا جو اکثر ہوتا ہے تو آپ فوراً ناراض ہو جاتے ہیں، کیا ایسا نہیں ....؟

سردار جعفری سے میں پچھلے ایک سال سے تقریباً ہر روز مل رہا ہوں۔ وہ جہاں پہلے دن بیٹھے ہوئے ملے تھے وہیں اب بھی ملتے ہیں اُسی کرسی پر بیٹھ کر جوتے بھی اتارتے ہیں اُسی کے پاس کھڑے ہو کر کبھی بالوں میں کنگھا بھی کرتے ہیں اور جاتے وقت احتیاطاً اپنی بُش شرٹ یا واسکٹ بھی اُسی پر لٹکا جاتے ہیں۔ وہ شخص یا دونوں کے نام سردار جعفری .... وہ ایک کرسی اور وہ بھی جب دیکھو بھری ہوتی۔ یہ پہلے دن تو عجیب اُلجھن محسوس ہوئی اور پھر ایک دن جب "اردو منزل" کی پانچویں منزل کے دوسرے زینے پر ہی جعفری صاحب نے پھولی ہوئی سانس میں کہا

"آپ آگے چلئے میں ذرا رُکا ہوا آتا ہوں" تو مجھے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ آدمی جو ہر روز میرے ساتھ گھر سے چلتا ہے وہ تو ایک دم نروان پا گیا تھا، ایک شرارہ جو ہر کسی کو جلا دینے کے در پے تھا جو سورج کی مانند بے چین تھا اور جو قائل

پہلے مجاز اور سبط حسن کے ساتھ لکھنؤ کی سڑکوں پر دن دن بھر گھوم کر بھی نہیں تھکتا تھا اور اب پانچویں منزل کے دوسرے زینے پر ہی اُس کی سانس پھول رہی تھی۔ سردار جعفری نے اپنے نئے شعری مجموعہ میں جگر کے ایک شعر ۔

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

کے حوالے سے اپنی اِس کمزوری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وقت بھی کتنی جلدی گزر جاتا ہے میری کھولی کے کیلنڈر میں اِس برسات میں کتنے سوراخ جھانکنے لگے ہیں۔ وہ ایک سال کی ترقیات ہے کتنی تیزی اور ستمبر لگتی ہے ...... برسات ایسے گزر جاتی تھی جیسے کوئی نئی نئی بیاہی لڑکی پائل چھنکاتی قریب سے گزر جائے .....!! اب میں سردار جعفری کے گھر اکیلا ہی جاتا ہوں، اب میں صرف سامنے بیٹھے ہوئے سردار جعفری سے باتیں کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ... سردار جعفری ... سیتا محل کے فلیٹ کا ایک کمرہ، آٹھ نو کتابیں، دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی نیند، بکھرے ہوئے بہت سارے کالے سفید بال، 555 برانڈ کی سگریٹیں، فرش، کھڑکیاں، دیواریں .... فریج، ٹیلی فون، پنڈت نہرو کی تصویر، پدم شری کی دستاویز .... سردار جعفری کتنی ساری چیزوں سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن تک پہنچنے کے لئے اب بہت کچھ پھلانگنا پڑتا ہے۔ جیسے سیتا محل کا راستہ تو بہت لمبا نہیں مگر اُن کے کمرے سے اُن تک پہنچنے کا راستہ اکثر بری طرح تھکا دیتا ہے۔ تقریباً ساٹھ سال لمبا راستہ .... کہانیاں، پہاڑ، میدان، جنگیں، فسادات، انقلابات، جیل، انقلاب، محفلیں، جلسے، پہچانیں، سیاسی اقتدار .... اور نہ جانے کیا کیا .... ! .... مجھے لگتا ہے خود سردار جعفری بھی اپنے آپ سے کم ہی مل پاتے ہوں گے۔

"یہ پائپ والے دن بھر میں کتنا کما لیتا ہوگا؟"

"یہی سات آٹھ روپے"

"ساری پائپ کے دس پیسے، سات روپے میں ستر ہوتے ہوئے سات سو پیسے، اِن اٹھنیوں ہی جاتے ہوں گے"

"اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے جعفری صاحب!"

"نہیں ایک روپیہ تو بے چارے کا خرچ ہی ہو جاتا ہوگا"

"بے چارہ .... مجھے لگا یہ لفظ پائپ والے کے لئے بیکار استعمال ہوا ہے۔ اُس کا جائزہ درست ساتھ کھڑا ہوا سفید پوش نوجوان ہے جس کے کانوں میں عمر سے پہلے وقت نے انگلیاں ڈال دی ہیں۔ گرانٹ روڈ اسٹیشن پر چرچ گیٹ کی گاڑی شاید کچھ لیٹ تھی۔ جعفری صاحب نے نئی نئی مگر ہے مشغلہ کرائی مشکل سے دو منٹ ہی لئے ہوں گے کہ سامنے بیٹھا ایک پائپ والے کی پیٹی میں وہ ڈال رہے تھے کی کوشش کرتے لگے۔ وہ فٹ کی لکڑی کی چھوٹی سی پیٹی اور شاید ساڑھے پانچ فٹ کے سردار جعفری، آٹھ نو کتابیں، فرش، کھڑکیاں، دیواریں۔ مجھے ڈر لگا کہیں بے چارے کی لکڑی کی پیٹی پائپ کی ڈبیہ اور تمہ وغیرہ اِس بوجھ سے ٹوٹ پھوٹ نہ جائے .... شاید انقلاب جو تیغ کا دی اِس ٹوٹ پھوٹ کے لئے اپنی مثال آپ ہیں۔ (ملاحظہ ہو "پتھر کو منہ مانگی آگ")

عہد قدیم سے مغربی فکر کی یہ روایت رہی ہے کہ عالم اشیا اور اس کے

سردار جعفری عادتاً کے بولتے رہتے ہیں۔ وہ گفتگو کے دوران ہی کچھ لفظوں کو روک لیتے ہیں۔ کہیں سے کم زیادہ کر دیتے ہیں، کبھی آواز کی پچ کی تبدیلی سے معنی میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر یہ عمل ذرا پرومتھین کے ذہن میں ہی چلتا رہتا ہے۔ سننے والے کو ان باتوں کا پہاڑ تو خاطر آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بولتے وقت آنکھ، ذکر، نو ب، بحیثیت چاروں دشاؤں کو تول رہے ہیں۔ "ترقی پسند ادب" کے دیباچے میں سردار جعفری نے ایک جگہ لکھا ہے "ہم عصر ادیبوں پر تنقید کرنے سے زیادہ مشکل کوئی دوسرا کام نہیں ہے اور اگر مصنف خود بھی ادیب ہے تو مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے"

"جعفری صاحب! ترقی پسند شاعری میں امیج کا استعمال عام طور سے نہ کیا گیا یا Static ہے۔ اس میں ذہن کی مختلف سمتوں کو بہ یک وقت الفاظ میں سمیٹنے کے ابعاد کم نظر آتے ہیں۔ امیج شعور کی سطح پر لاشعور کی پیچیدگیوں کا اظہار کرتی ہے جس میں انجانے میں شخصیت کے سارے رنگ گھل مل جاتے ہیں۔"

"درست ہے مگر اس میں شعری رویئے کا بھی فرق ہے۔ آج کل شاعری خارج سے باطن کی طرف مڑ رہی ہے۔ میں ادب کو خارجی مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔"

"جعفری صاحب! آپ نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں حسرت، فانی کے مقابلے میں جگر کی شاعری سے زیادہ بحث کی ہے۔ جگر ان تینوں میں کمزور شاعر بھی ہیں اور پھر جن شعروں میں آپ نے سماجی شعور کو تلاش کیا ہے وہ بھی جگر کی شاعری میں کچھ زیادہ اہم نہیں۔"

"یہ سچ ہے۔ حسرت، یگانہ اور مجاز کا ذکر بھی وضاحت سے ہونا چاہیئے تھا۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس کا خیال رکھوں گا۔ جگر کی شاعری کے بارے میں میری رائے بہت صاف ہے۔ میں نے لکھا بھی ہے۔ حسرت کے مقابلے میں جگر کی شاعری زیادہ گھٹی ہے۔ "ترقی پسند ادب" سے اب تک میری سوچ کی بنیادی سطح تو وہی ہے ہاں! اس کے اطلاق میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ کچھ شاعروں اور ادیبوں میں بھی خیالاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میرا جی کے بارے میں میری جو رائے پہلے تھی وہی اب بھی ہے۔ منٹو نے کچھ بڑی کہانیاں بھی لکھی ہیں جیسے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" وغیرہ۔ یہاں وہ اپنے کرافٹ میں دوسروں کو اپنے قریب تک نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ عالمی معیار کی کہانیاں ہیں۔ مگر "سرکنڈوں کے پیچھے" اور "بو" گھٹیا کہانیاں ہیں۔ مجھے آج بھی یہ کہانیاں بری لگتی ہیں۔"

"جعفری صاحب! موت کے چنگل سے وقت لینے والے میرا جی اور "بو" لکھنے والے منٹو ہمارے سماجی اور تہذیبی کھوکھلے پن کی علامتیں بھی تو ہیں۔ مجھے تو میرا جی کی اس کج روی میں، برسوں بعد سماج اپنی تمام بدہیئتی کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہم آئینے میں اپنے چہرے دیکھتے ہوئے گھبرا رہے ہوں؟"

"لیکن اس میں صرف سماج ہی نہیں فرد بھی قصوروار ہے۔ سماج کے آگے ہتھیار ڈال دینا اور اس کے خلاف لڑنا، دونوں میں بہت فرق ہے۔ بغاوت کے بھی نغمے اور نئی وہ پہلو ہوتے ہیں۔ میرا جی کے ہاں نئی رجحان کا ذکر ملتا ہے جن میں مرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ شکست خوردگی غالب ہے جو نئی نئی بیماریوں میں ظاہر ہوتی ہے۔"

"اچھا عمرا صاحب! میں تو کھانے کے بعد تھوڑا سونے کا عادی ہوں۔ آپ جب تک پڑھیئے "سیپ" میں قمر ثمارہ کی کہانی پڑھ کے اپنی رائے دیجیے۔ اس بار تو نئی کہانیوں کا ٹوٹا ہے۔"

کہانیوں کا ٹوٹا ہے۔ چاروں طرف کہانیاں ہی کہانیاں تو بکھری ہوتی ہیں۔ سامنے پڑی ہوئی لکڑی کی کرسی، چٹائی، بڑی بڑی الماری، سامان کے جھولتے گیت ... ننھی منھی چڑیوں کے گھونسلے ... ٹوٹے پھیلے موسم ... خریدے ہوئے ہاتھ ... چلتا ہوا آرا ... لکڑیوں کے جھولتے ٹکڑے ... کیلیں ... لوہے کی ادھوری کانٹیں ... پیٹ کے بل رینگتے ہوئے مزدور ... چھوٹی چھوٹی کھولیاں، رشتے ٹوٹتی بکھرتی ... سرحدیں، جنگیں، فسادات۔ صرف ایک کرسی میں کتنی ساری کہانیاں چھپی ہوتی ہیں۔ ایک کرسی کو لکھنے میں کئی نسلیں گزر جائیں ... معمولی سے معمولی چیز میں بھی کتنے گہرے گہرے غار چھپے ہوتے ہیں۔ شاید ہمارے ادیب آج کل ہوتے زیادہ ہیں، کسی چیز پر نظر نہیں ڈالتے۔

"کہیے آپ نے کہانی پڑھ لی، کیسی ہے؟"

"جی ہاں مگر مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آئی ...!"

"جعفری صاحب! آپ نے نئی شاعری پر کبھی تفصیل سے کچھ نہیں لکھا۔"

"نئی شاعری پر لکھنا ان نقادوں کا حصہ ہے جو ساتھ ہمارے نقاد بھی پیدا ہوئے تھے۔ ہر عہد کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ میں نئی شاعری کا مخالف بالکل نہیں ہوں۔ مجھے بھی دوسروں کی طرح کچھ نئے شاعر پسند ہیں، کچھ وقت نہیں لگتے۔ میں جدید اردو ادب کا انتخاب بارہ جلدوں میں شائع کر رہا ہوں۔ اس میں ایک جلد نئی شاعری کا انتخاب ہو گی۔ نئی شاعری، شاعری سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ پچھلی شاعری کی توسیع Extension ہے۔"

"جعفری صاحب! کافی میں تو بہت بھیڑ ہے۔"

"دیکھئے کوشش کرتے ہیں" ... اور دیکھتے ہی دیکھتے چوپاٹی گیٹ کی لوکل کے ڈبے کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے جعفری صاحب مجھ سے پہلے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ چاروں طرف بھیڑ ہی بھیڑ۔ گھومتی ہوئی آنکھوں کی بھیڑ، تھکے ہوئے جسموں کی بھیڑ، اترے ہوئے چہروں کی بھیڑ ... اور بیچ میں لوہے کی سلاخ پکڑے ہوئے سردار جعفری، چپ، خاموش ... مجھے لگا ہے، سردار جعفری بھی کئی سال اور نظمیں کہتے رہیں گے ... وہ آدمی جو خود کو اور خود کے ساتھ اپنے گرد کے ماحول کو بدلنے کی جرأت رکھتا ہے اس کی تخلیقی عمر کافی طویل ہوتی ہے۔

خشکیِ لب ہے نہ لب ہے وہ تر باقی ہے
جانے کیا ہو گئے وہ عہد گزشتہ کے رفیق
وقت نے چھین لیا بھوک کا فاقوں کا غرور

براہِ راست

ہر دور کے تقاضے، مفاہیم اور مطالب یکساں مزاج کے حامل نہیں ہوا کرتے۔ لیکن چیز، ہیں مگر ایک چیز ایک رنگ، ایک روپ اور شکل میں آج بھی دستیاب ہے۔ محبت، خدا اور سچائی...... ایک ہی شے ہوتے ہوئے بھی مختلف عنوانات اور مختلف احساس کے ساتھ ازل سے بنی نوع انسان کی ضرورت تھی اور ابد تک رہے گی......!

جب جب جہاں جہاں محبت، خدا اور سچائی کا ذکر ہو گا، تب تب ہمارے "آپ کے محبوب" انسان دوست، انسان نواز محترم فدا فاضلی اور محبت، خدا و سچائی کے خمیر میں گندھی اُن کی شاعری کا ذکر لازم تصور ہو گا.....!!

آپ بھی ذیل کے صفحات کا محبت، خدا اور سچائی کے حقیقی احساس کے ساتھ مطالعہ کیجئے اور ہمارے دعویٰ کی حقیقت میں شامل ہو کر ایک بڑے تخلیقکار اور بڑے انسان کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں ہمارے ہمنوا بن جائیے......!!!

گلزار جاوید

☆ شاعری سے آپ کا عشق اور اس کی آبیاری کا ذمہ کس کو جاتا ہے؟

☆☆ گھر کا ماحول شاعرانہ تھا۔ میرے والد ڈاما ڈبائیوی داغ اسکول کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کی وجہ سے بہت سے اساتذہ، ناطق گلاؤٹھوی، نوح ناروی، نارائن پرشاد مہر، جگر مراد آبادی وغیرہ کو نزدیک سے دیکھنے کی سعادت حاصل رہی۔ گھر کے باہر کا ماحول ہندی، مراٹھی ادب کی چہل پہل سے روشن تھا۔ میری شاعری میں اردو کے کلاسیکی ادب کے ساتھ دوسری علاقائی زبانوں کے اثرات بھی شامل رہے ہیں۔ کالج کی تعلیم کے دوران یہ اثرات انگریزی کے واسطے ہی سے کئی یوروپی زبانوں سے بھی جڑتے رہے۔

☆ ہم آپ کی اس جدوجہد سے آگاہی کے خواہش مند ہیں جس کا مقابلہ کر کے آپ نے زندہ رہنے کا فن سیکھا ہے؟

☆☆ میری جدوجہد، برصغیر کے عام آدمی کی جدوجہد سے مشابہ ہے۔ میں نے اپنے زندہ رہنے کے طور طریقوں کا ذکر اپنی دو کتابوں دیواروں کے بیچ اور دیواروں کے باہر (ان کے ایڈیشن "آج" پبلی کیشنز کراچی سے بھی شائع ہو چکے ہیں) میں تفصیل سے کیا ہے۔ سیاست کا عذاب بہت سوں کی طرح میرے نصیب کا بھی حصہ رہا ہے۔ اس "نصیب" نے مجھے بہت کچھ وہ سکھایا ہے جو اسکولوں اور کالجوں میں نہیں پڑھایا جاتا۔ میرا ایک مطلع ہے:

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

☆ ہم آپ کی آئیڈیالوجی سے آگاہی کے اس طور خواہش مند ہیں جس میں مذہب، معاشرت، ثقافت اور سیاست کی بابت کوئی ابہام باقی نہ رہے؟

☆☆ اس کے جواب میں پیش کردہ اصطلاحات سے دور ہو کر میں مرزا غالب کا ایک شعر دہراؤں گا۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی سے انسان بننے کے سفر کو میں ضروری سمجھتا ہوں۔ مذہب، معاشرت، ثقافت اور سیاست کو میں اس سفر کی بینائی کے ذریعے جانتا پہچانتا ہوں۔ ہر آدمی، ایک ہی زندگی میں مسلسل تغیر و تجربے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ اس کائنات میں تبدیلی سے بڑی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تبدیلی بھی تبدیل ہوتی ہے، شاید اس سے بڑی حقیقت ہے ڈاکٹر اقبال کے لفظوں میں:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

☆ آپ ذات، جنس، نظریہ کسی چیز کے اسیر نہیں، آپ کا طرزِ زیست کیا ہے؟

☆☆

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں
وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

☆ یہ الزام کب اور کس کی جانب سے آپ پر لگایا گیا کہ آپ اپنی قلمی قوت کے برتے پر کسی بھی طرز احساس کا حسب آسانی جوڑ دیتے ہیں؟

☆☆ لفظوں سے میری وابستگی، میری قوت نہیں میرا پیشہ ہے۔ اس پیشے کے علاوہ بھی میں بہت کچھ ہوں، جس کو میں نے اپنی نثر و نظم میں بیان کیا ہے۔ اپنی طرح سوچنا، میری آزادی ہے جسے میں اپنے جینے کے لیے ضروری مانتا ہوں۔

☆ آپ کبھی کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتے، یہ امر کس جذبے یا احساس کی علامت ہے؟

☆☆ زندگی سفر ہے اور سفر میں ہر منظر دوسرے منظر کے بدلنے تک آنکھ میں رہتا ہے پھر اوجھل ہو جاتا۔ ان میں سے کچھ یادیں بن جاتے ہیں۔

☆ طویل بھیڑ کے سلسلے سے متعلق ہو کر بھی آپ کے ہاں اکیلے پن کا احساس کیوں ہے نیز کچھ لوگ آپ کو روایات سے بغاوت کا مجرم بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ ناروے کے (Norway) ڈرامہ نگار اپسن نے کہا تھا اکیلا ہونا قوت کی علامت ہے۔ اسی بات کو گرودیو ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا۔ ایکلے چلو۔ میرے خیال میں اپنی نظر سے دیکھنا اور اپنی طرح سے سوچنا ضروری ہے اس رویہ کا انجام تنہائی ہے مگر یہی زندگی کو اس کے مفہوم سے روشناس بھی کرتی ہے۔

☆ آپ کے ہاں جس قسم کی "اکتاہٹ"، بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے اس سے آپ کے مزاج میں ترقی پسندی اور مارکسزم کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے؟

☆☆ میں ترقی پسند بھی ہوں، انسان پسند بھی ہوں، مذہب پسند بھی ہوں، صوفیانہ مزاج پسند بھی ہوں۔ میں اس سب کو اپنی وراثت میں شامل مانتا ہوں جو میرے وجود سے پہلے وجود میں تھا اور وہ بھی جو میرے ساتھ ہم سفر ہے۔ نا معلوم کیا کہاں سے ہوں کہاں تک، زمیں پر وقت ہے جب سے جہاں تک۔

☆ آپ کے ہاں عربی، فارسی زدہ اردو کے بجائے ہندوستانی زبان کا استعمال ارادی عمل ہے یا غیر ارادی۔ اردو ادب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

☆☆ میری شعری و نثری زبان، اس رشتے سے صورت پذیر ہوتی ہے، جو فرد اور معاشرہ کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ اردو کا ابتدائی روپ جو امیر خسرو کے یہاں ملتا ہے، کبیر داس کے یہاں نظر آتا ہے، جسے رحیم کے دوہوں میں دیکھا جا سکتا ہے، برصغیر کی ملی جلی تہذیب کی علامت ہے۔ یہ زبان کے دو چہرے ہوتے ہیں۔ ایک اشرافیہ کا چہرہ، دوسرا وہ جو عام آدمی کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔ میری ادبی زبان اس لوک وراثت سے ہم رشتہ ہے جسے اردو کے اشرافیہ مزاج نے کبھی قابل توجہ نہیں سمجھا۔

☆ آپ کو جو شہرت و عزت حاصل ہوئی ہے اس کا کریڈٹ اردو، ہندی میں زیادہ کس کو جاتا ہے؟

☆☆ لسانی اعتبار سے ہندی اور اردو میں سوائے رسم الخط کے کوئی فرق نہیں۔ جیسے امرتسر میں بولی جانے والی پنجابی اور لاہور میں بولی جانے والی پنجابی میں، ایک زبان ہوتے ہوئے دو مختلف خطوں میں لکھی جاتی ہے اسی طرح میری کتابوں میں بھی ہندی اور اردو کے حرفوں کے علاوہ دوسرا کوئی فرق نہیں ہے۔

☆ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ آپ اپنے بچپن کی محرومیوں، مایوسیوں اور تنگ دستیوں کا ازالہ بچوں کے لئے اشعار کہہ کر کر رہے ہیں؟

☆☆ جس عہد میں ہر جگہ ملاوٹ ایک حقیقت ہو۔ انسانیت سے انسانیت غائب ہو، محبت سے محبت غائب ہو، شرافت سے شرافت غائب ہو، اس عہد میں، ملاوٹ کے بغیر اگر کچھ باقی بچا ہے تو وہ بچہ ہے، بچے کی مسکراہٹ ہے، اس کی آنکھوں کا تحیر ہے۔ میں نے بچے کو گم ہوتے معاشرہ میں، معصومیت کی علامت کی طرح پہچانا ہے اور اسے اپنا موضوع بنایا ہے۔

☆ آپ کی شاعری میں چھپے احتجاج کو احباب، بھارت کے ہندو مسلم فسادات کا ردعمل گردانتے اور کچھ اس کا سلسلہ گوالیار میں لٹنے والے آپ کے گھر سے جوڑتے ہیں؟

☆☆ ہر ادیب و شاعر کے لفظوں کے پیچھے اس کی اپنی زندگی جھلکتی ہے میں نے جو کچھ دیکھا اور دیکھتے ہوئے جس طرح گزرا وہ سب کچھ میری شخصیت کے تعمیری عوامل ہیں۔ اس میں صرف فسادات ہی نہیں، ان فسادات کے دائیں بائیں بھی جو بہت کچھ ہے وہ بھی پوری طرح اس میں شامل ہے۔

☆ اردو شاعری میں جس کرافٹ مین شپ کی بنیاد آپ رکھ رہے ہیں اس کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ میری نظر میں نیت کوشش کی ہے۔ اس کوشش کو میں حال اور مستقبل کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا۔

☆ آپ نے لوک گیتوں خاص کر گانگی کی دھن کو کب اور کیونکر اختیار کیا اور اس کے آپ کے فن پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

☆☆ لوک تہذیب اور اس کا ادب، ہماری مشترکہ ثقافت کا حصہ ہے اس سے دوری اپنی جڑوں کی نفی کے مترادف ہے۔ بابا فرید، بلھے شاہ، وارث شاہ، کبیر، تلسی، میرا، رحیم، ملا داؤد تک سب نے اس زبان کی آبیاری میں محنت کی ہے جو آج ہمارا ذریعہ اظہار ہے۔ عربی و فارسی اور علاقائی بھاشاؤں کے میل ملاپ سے جو ذریعہ اظہار ڈھلا ہے وہی میرے خیال میں زندہ اور پر اثر ذریعۂ اظہار ہے۔

☆ کہتے ہیں، جس قدر کھلا اظہار آپ نے اپنے کھلنڈرے لہجے میں کیا ہے کسی اور شاعر نے نہیں کیا؟

☆☆ خدا کے وجود سے میں انکاری ہرگز نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے میں اسے محدود کر کے نہیں دیکھتا۔ میں اسے رب العالمین مانتا ہوں۔ وہ ہر جگہ ہے، ہر شے میں ہے۔ بچے کی مسکراہٹ میں بھی وہی ہے، ماں کی جھڑکیوں میں بھی، جگمگاہٹ میں بھی وہی ہے، تیتر کی گڑگڑاہٹ میں بھی وہی ہے، وقت کی آہٹ میں بھی وہی ہے، مومنوں کی عبادت میں بھی وہی ہے، درختوں کی لہلہاہٹ میں بھی وہی ہے۔

ہمیشہ مندر و مسجد میں وہ نہیں رہتا، سنا ہے بچوں میں چھپ کر وہ کھیلتا بھی ہے
وہ اک امیر جو جوڑی رساں ہے عالم کا، فقیر بن کے کبھی بھیک مانگتا بھی ہے

☆ آپ اپنی نثر کو شاعری کے مقابلے میں کیا مقام دیتے ہیں؟

☆☆ تخلیق سے تخلیق کار کا رشتہ اسی وقت تک رہتا ہے، جب تک وہ مکمل نہیں ہو جاتی۔ تکمیل کے بعد تخلیق کار کی موت ہو جاتی ہے اور قاری پیدا ہوتا

ہے میں قارئین کی رائے کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

☆ یہی سوال اگر ہم آپ کی کالم نگاری کے حوالے سے کریں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ میں نے ہندی اور اردو میں ادبی کالم لکھے ہیں۔ ادب اپنی ہر صنف میں لکھنے والے سے مقابلتاً زیادہ سنجیدگی کا تقاضہ کرتا ہے لیکن لکھنے کے بعد کمی کمی کا سا احساس بھی ستاتا رہتا ہے اس احساس کا اعتراف میں نے اپنی کتاب تماشہ میرے آگے (ہندی) میں کیا ہے

کوشش کے باوجود یہ الزام رہ گیا
ہر کام میں ہمیشہ کوئی کام رہ گیا

☆ آپ نے اپنی کتاب "چہرے میں کیا ہے" پورے ہوم ورک کے ساتھ لکھی ہے۔ کیا دیگر تخلیقی کام بھی اسی طرح کے ہوم ورک اور پلاننگ سے کیا کرتے ہیں؟

☆☆ جی ہاں

☆ جو قلموں میں چلا جاتا ہے وہ ادب سے نکل جاتا ہے یہ مقولہ آپ پر کیوں لاگو نہیں ہوا؟

☆☆ یہ اپنی اپنی ترجیحات پر منحصر ہے

☆ کیا یہ تاثر درست ہے کہ حالات کو بدلنے اور وقت سے مقابلہ کرنے والا فاضل وقت کہ آگے پر ڈال چکا ہے؟

☆☆ وقت سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ حالات کو لفظوں سے بدلنا، ترقی پسندوں کی خوش فہمی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے جس معاشرہ میں ہم ہیں اس میں تعلیمی معیار کیسا ہے؟ ادب کی رسائی اس میں کہاں تک ہے یہ سوال بھی اہم ہیں۔

☆ ہم آپ کے اُن احساسات سے آگہی کے خواہش مند ہیں جن کے زیر اثر آپ نے پاکستان کے بجائے ہندوستان کا انتخاب کیا تھا؟

☆☆ اس وقت بھی جب میرے خاندان والے ہجرت کا ارادہ کر رہے تھے اور آج بھی جب اس ہجرت کو کافی عرصہ گذر چکا ہے میرا خیال یہی ہے کہ زمینی تقسیم مسائل کا حل نہیں ہے۔ برصغیر کی تقسیم کی وجہ کچھ بھی ہو اب یہ ایک حقیقت ہے لیکن ایک انسان کی حیثیت سے مجھے یہ پوچھنے کا حق ضرور ملنا چاہیے کہ کیا اس تقسیم سے عام آدمی کی غربت اور پریشانی میں کوئی فرق نظر آیا ہے کہ نہیں۔

اتنا ہے بدل وجاں سے دھواں دونوں طرف ہی
یہ میر کا دیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی

☆ اُس وقت کے فیصلے کی بابت آج آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ میرا ایک شعر ملاحظہ کریں:

ملکِ خدا میں ساری زمینیں ہیں ایک سی
اس دور کے نصیب میں ہجرت نہیں رہی

☆ ہندوستان، پاکستان بلکہ پوری دنیا میں اردو زبان کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ زبانوں کا تعلق اس کے بولنے پڑھنے اور سیکھنے والوں سے ہوتا ہے میر، غالب، اقبال اور فراق کی یہ زبان بہت خوبصورت ہے اس کا مستقبل بھی اس کے حسن کی طرح پرکشش ہے

☆ بھارت کے سیکولرازم کی بابت آپ کس طرح کی رائے اور حسنِ ظن قائم کئے ہوئے ہیں؟

☆☆ بھارت کا دستور سیکولر ہے اس سیکولر جمہوریت میں، سب کے دستوری حقوق یکساں ہیں۔ جس کے لیے قانونی لڑائی کی آزادی بھی ہے اس آزادی کا استعمال بھارت کی اقلیتیں کرتی رہی ہیں۔ ہندو بنیاد پرستی کی مخالفت بھی یہاں بیدار ذہن ہندو ہی کرتا ہے

☆ بھارت کے ایک سو بیس کروڑ اور دنیا کے سات سو کروڑ انسانوں کے لئے آپ کس طرح کے خواب اور اُن کی کیا تعبیر دیکھنا پسند کرتے ہیں؟

☆☆ ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو، اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو۔

☆ چہاتھر برس کی عمر میں جو مقام و مرتبہ آپ کو حاصل ہے آپ اس سے مطمئن ہیں یا کچھ شکوے شکایات ناقدین سے آپ کے ہاں بھی گھر کئے ہوئے ہیں؟

☆☆ مجھے اپنے کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ شکایتوں کے لئے وقت درکار ہے اور میرے پاس وقت کی کمی ہے

☆ جو فتوحات آپ نے حاصل کر لی ہیں، اُس سے کس حد تک اطمینان محسوس کرتے ہیں اور مستقبل میں کیا کچھ کرنے کے ارادے رکھتے ہیں؟

☆☆ لکھنا اور لکھنا لکھتے ہی رہنا۔

☆ آخر میں ہم آپ سے آپ کی ایسی خواہش کی بابت دریافت کرنا چاہیں گے جس کی بابت آپ کے دل میں ابھی تک جستجو ورنگ وبو پائی جاتی ہو؟

☆☆ میں عام آدمی کی صف کا آدمی ہوں اور عام آدمی کی خواہش رہنے کے لیے تھوڑی زمین، پیٹ بھرنے کو اناج، اور سانس لینے کو خوف ووحشت سے پاک سماج ہوتا ہے

پہلے جیسا ہی دکھی ہے آج بھی بوڑھا کبیر
کوئی آیت کا مخالف کوئی سورت کے خلاف
قتلِ سرمدؔ، خون دارا کے علاوہ شہر میں
کون ہے جو سر اٹھائے بادشاہت کے خلاف

گذرے ہوئے کل میں کوئی ترمیم نہیں

پروفیسر عتیق اللہ

"کوئی سچ مکمل سچ نہیں ہوتا۔ سارے سچ آدھے ادھورے سچ ہیں۔ انہیں مکمل سچ منوانے کی کوشش کے حق شیطان کے چنگل میں پھنسنے کے ہیں۔" (الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ)

"گذرے ہوئے کل میں کوئی ترمیم ممکن نہیں۔ آنے والا کل غیر یقینی ہے۔ صرف آج ہی یقینی ہے، اس کو جب تک تمہارے ساتھ ہے جیسا چاہو جی لو۔" (زرتشت)

اردو میں سوانح نگاریوں اور خودنوشت سوانح عمریوں کی تعداد سوانحی ناولوں سے یقیناً کئی گنا زیادہ ہے۔ ان خودنوشتوں میں بھی پردہ داری اور اعتراف کی جرأت کا مظاہرہ کم اور پردہ پوشی اور خودآرائی کا پہلو زیادہ حاوی ہے۔ اکثر خودنوشتیں محض یادداشتوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ جنہیں یادنگاری کے ذیل ہی میں شمار کرنا چاہیئے۔ سوانحی ناول سوانح بھی ہوتا ہے اور جس میں اپنے یا کسی دوسرے کے سوانح کو کسی ایک کے بندھے یا ڈھیلے ڈھالے پلاٹ میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوانح نگاری یا خودنوشت نگار چونکہ ناول کے آرٹ سے کم واقف ہوتے ہیں اس لئے ان سے پلاٹ کے نظم وضبط اور واقعات کے تانا بانا جوڑنے کی اس فسانوی فن کی توقع بے سود ہوگی جسے ایک فکشن نگار بڑی مہارت کے ساتھ کوئی خاص ذیلی تنظیم دے دیتا ہے۔ ذیلی اس لئے کہ اسباب و علل کے منطقی سلسلے کے مطابق ناول کی ظاہری ساخت کو تشکیل دینا اب ناول کے ترقی یافتہ سیال فارم کے عین منافی ہے۔ عزیز احمد، عبداللہ حسین اور قرۃ العین حیدر سے لے کر عبدالصمد اور مستنصر حسین تارڑ تک ناول کی ظاہری تنظیمی ساخت کو بار بار شکست کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ اب ناول انسانی فطرت اور انسان کے بے ہنگم سفر حیات کی اس رَو کا زیادہ مظہر ہے جس کی منطق خارج کی تعین کردہ زمان کی رَو کے برخلاف ترتیب اور نظم کے ایسے متنوع قواعد سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ اسی بظاہر بدنظمی نے ناول کو ایک وسیع تر داخلی میدان کا راز بھی فراہم کیا ہے۔ جواز میں جو توضیح اور استدلال کا پہلو چھپا ہوا ہے اس سے یقیناً ہمارے قارئین کو بڑی تشفی حاصل ہوتی ہے لیکن جواز کی جستجو اور قاری کو قائل کرنے کی عجلت میں ہم ایسے بہت سے قاریوں سے محروم بھی ہو جاتے ہیں جو واردات اور واقعات کے اسباب و جواز کی کسی ایک منطق ہی کو آخری وسیلہ نہیں مانتے۔ ہر قاری اور عہد کے ساتھ استدلال کی منطق بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جدید ناول کا فن پہلے کی بہ نسبت زیادہ پہلودار، زیادہ سیال اور زیادہ وسیع ہوا ہے۔

امراؤ جان ادا، علی پور کا ایلی، الکھ نگری اور غالب جیسے ناولوں میں سوانح اور ناول کا فارم ایک دوسرے میں حل ہو گئے ہیں۔ ناول نگار اگر نفسیاتی بصیرت بھی رکھتا ہے تو وہ زیادہ بہتر طریقے سے اس کردار کی روح اور فطرت کے ان متنوع اطراف کی تفصیلات کو پہنچا سکتا ہے جو بہتوں کے لئے نامعلوم کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس حق میں ممتاز مفتی کو ہم بغیر کسی لاگ لپیٹ کے Naturalist of Souls کا نام دے سکتے ہیں۔ اس ذہب کا فن کار اظہار کی غیر معمولی جرأت سے بھی کام لیتا ہے، اعتراف کے حوصلے بھی جہاں تہاں آزماتا ہے اور خودکشائی کی اس توفیق کے مظاہرے کی ہمت بھی رکھتا ہے جسے ایک خاص تہذیبی تناظر میں پرورش یافتہ انا اپنی تائید میں رکھنے کے درپے رہتی ہے۔

خودگذشت یا خودسوانحی ناولوں کا معاملہ تو سوانحی ناولوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اکثر خودگذشت نگار اپنی ذات اور کسی حد تک اپنے تعصبات سے پرے ہو کر چیزوں کو دیکھنے کے باوجود خوداحتسابی کی ایک حد قائم کر لیتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ چیزوں کی بہتر فہم کے لئے معروضیت ہی سب سے بہتر اور واحد راستہ ہے۔ بعض اوقات وہ دھند اور وہ اسرار بھی زیادہ معنی خیز ثابت ہوتے ہیں جن پر دلیل کا بھاری بوجھ ڈالنے سے معنی کی متوقع قدر کے کم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تجزیہ کر چیزوں سے روحانی رابطہ پیدا کرنے کی راہیں بھی سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ "کارِ جہاں دراز ہے" میں قرۃ العین نے جہاں خودکشائی کی ایک حد قائم کی ہے وہاں ان بہت سے کرداروں کو بھی اپنے اپنے طاقوں سے اترنے کا موقعہ کم ہی دیا ہے جن سے ان کی یا ان کے قرابت داروں کی زندگی کے کسی دورانیے میں ایک خاص نسبت رہی ہے۔ سوانحی ناولوں میں بھی تاریخی ناولوں کی طرح Facts جب فکشن کا روپ دھارن کرتے ہیں تو ان کی اصل بڑی حد تک ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی سب سے بڑی وجہ ناول کا وہ فن ہے جس کے اپنے کچھ تکنیکی مطالبے ہوتے ہیں۔ ہر ناول کے ساتھ ان مطالبات کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ قرۃ العین کا ناول خودگذشت ہونے کے باوجود ایک تجسیم تو کرنے کا حکم بھی رکھتا ہے۔ تاریخ، تہذیب اور انسانی رشتوں کی رنگارنگی سے اس کی بافت تیار ہوئی ہے۔ اس بلند کوش نا تجلیاتی تصویر کی بالائی سطح کی تہہ میں

بغور دیکھا جائے تو کارِ جہاں کی درازی کے باوجود ناکارگی اور بالآخر لاحاصلی اور نا آسودگی کی ایک زیریں لہر کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جسے قرۃ العین کے معروف تصور کی روشنی میں وقت کے جبر کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جبر نے گیان سنگھ شاطر کے یہاں سماجی جبر کی شکل اختیار کر لی ہے جو کہیں کہیں نفسیاتی جبر میں بھی بدل جاتا ہے۔ شاطر کے یہاں ناسٹلجیا کی وہ کیفیت نہیں ہے جس میں کسی بیش قیمت ساعت کے کھو جانے کا تاسف پنہاں ہوتا ہے یا یہ ملال کہ یہ جو اتنا برا ہوا ہے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ شاطر نے Glorify کرنے کے بجائے چیزوں کو ان کی "جو ہے اسی صورت میں" بیان کرنے پر ترجیح دی ہے۔ نفسیاتی ادراک نے شاطر کے تجزیوں کو زیادہ دلچسپ، فکر انگیز اور معنی افزا بنا دیا ہے۔

ترا فضل نے اپنی سوانح کے لئے اس ضمیر متکلم کا سہارا نہیں لیا ہے جو بالعموم خود سوانحی ناول نگاروں کا سب سے مرغوب صیغہ کہلاتا ہے۔ اس ترجیح کی پشت پر ان کا یہ منشا بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں "میں" کی پردہ بنا، اظہار، احتساب اور اعتراف کی راہ میں حائل نہ ہو جائے اور وہ معروضیت بھی پیدا نہ ہو سکے جو حقائق کو بحال رکھنے کا ایک بڑا سبب بھی ہوتی ہے۔ ترا اپنی شاعری میں مختصر لمحوں کا شاعر ہے جنھیں وقت کو وسیع بساط پر پھیلانے سے اسے کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ جب کہ "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" کا زمان کم و بیش ۲۰ برسوں پر محیط ہے۔ ترا کے یہ ۲۰ برس کسی ایسے شخص کے ۲۰ برسوں کا عرصہ رواں نہیں ہیں جسے اپنے ماضی پر گھمنڈ ہو، حال پر فخر ہو اور مستقبل پر اعتماد۔ جو اخلاقیات کی نام نہاد فرہنگ کی ہر اس برائی سے اپنے پاک ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہو جس سے اس کے کمال کی عظمت پر کوئی حرف آ سکتا ہے۔

ترا کہیں برائی کرنے کو برائی سرزد ہونے کا نام نہیں دیتا اور نہ ہی برائی کے تصور کو اتنا برا خیال کرتا ہے جتنا برا ہم نے اسے اپنے اخلاقی و مادی میں نام دے رکھا ہے۔ وہ شخص جس نے اپنی تقریباً تمام عمر تن تنہا گزاری ہو اس کے لئے انسانی اور جذباتی رشتوں کی بڑی قیمت ہو جاتی ہے یا وہ اس قسم کے جذبوں سے عاری ہو کر انتہائی خود غرض، بے حس اور سخت دل بھی واقع ہو سکتا ہے لیکن ترا ایک ایسا کردار ہے جس نے اپنے اکیلے پن کو ٹوٹے پھوٹے اور وقت کے مارے ہوئے یا حالات سے جوجھتے ہوئے انسانوں کے دکھ دردوں سے آباد کر لیا ہے۔ ماضی کی بازیافت اس کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ماضی اس کے لئے کسی تفاخر کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ماضی جیسا ہے اور جو کچھ ہے اسی حالت میں اس کے ذہن نشین بھی ہے وہ نہ تو اپنی اس بد اعمالی پر پشیمان ہوتا ہے جسے سیدھے سادے لفظوں میں ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں اور نہ اپنے والد کی اس بے راہ روی پر کوئی لعن طعن کرتا ہے جو اس کی رسوائی و تحقیر ماں کی حق تلفی، تنہا بسری اور فانی الاولاد کا باعث بنی ہے۔ ترا کے اس شعار پر حافظ کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔

فاش می گویم و از گفتہ خود دلشادم
بندۂ و از ہر دو جہاں آزادم

ترا نے ایک غیر از خودکشی کے طور پر اپنا کردار خلق کر کے خود گزشت کو ناول کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ غیر از خودکشی کے طور پر ترا کا کردار زیادہ جاندار، زیادہ دلچسپ اور زیادہ حرکی ہے۔ اس کا سبب اس کی ذہنی و ضمیری آزادی ہے اور زندگی کو اس کی تلچھٹ تک پی جانے کی راہ میں نہ تو کہیں مانع آتا ہے اور نہ کہیں تذبذب لگتا ہے۔ ایک بچپن اسپرٹ ہے جو بچپن سے لے کر پکی ہوئی عمر تک اس کی رگ و پے میں رواں رہتی ہے جس کے بجائے ماں، اس کے لاشعور کے نہاں خانوں میں جا گزیں ہے جسے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی جھٹک نہیں پاتا۔ کیونکہ یہ احساس ہمیشہ ایک خون میں تر بتر زخم کی طرح اس کے وجود کے علاوہ ایک احساس زیاں اور تقاضا فطرت سے دوری کے باعث اس کی روح کی تہہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ بڑے پھول اور پودے اکثر اس کے لئے انسانی ذلالتوں، کمینگیوں، مکاریوں، خود غرض مندیوں، نفرتوں اور ریاکاریوں سے بھری ہوئی دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے فراغت کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ویسے ترا کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان سے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور نہ انسانوں سے وہ بہت زیادہ توقع باندھتا ہے کہ نفرت یا کمینگی پیچیدہ شکل ہوتی ہے جو پوزیشن بدلنے کے ساتھ اس کے رخ اور اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔

"دیواروں کے بیچ" کا ترا اتنا "دیواروں کے بیچ" نہیں ہے وہ ایک آزاد رو اور آوارہ پنچھی ہے، اقرار کے بجائے انکار اس کی شخصیت کا وہ رخ متعین کرتا ہے جسے ہر چیز بے وقعت نظر آتی ہے اور وہ ہر چیز میں تحلیل ہونے کے درپے بھی دکھائی دیتا ہے۔ حیات و کائنات کی اسرار ذاتی کا عرفان اسے اپنے لڑکپن میں ہو جاتا ہے۔ اس لئے رشتوں کے معنی بھی اس کے یہاں کچھ اور مفہوم اختیار کرتے جاتے ہیں وہ پانے کے لئے کھوتا نہیں ہے بلکہ کھونے اور پانے کے احساس ہی سے اپنی ذات کو پرے رکھ کر دنیا کا ایک ایسے تماش بین کے طور پر مشاہدہ کرتا ہے جو وجودی اور جسمانی سطح پر اس میں پوری طرح شامل بھی ہے اور روحانی اور ذہنی سطح پر اس سے علیحدہ بھی جسمانی سطح پر حواس کے تئیں ایک مستقل بیدارگی زندگی کے ایسے بہت سے نئے معنی اس پر وا کر دیتی ہے جنھیں انکشاف کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہی معنی ترا کے حق میں روحانی اور ذہنی سطح پر ذات، حیات، کائنات، فطرت، مذہب، نیکی، بدی، جرم،

گناہ اور انسانی رشتوں کی ایک نئی فرہنگ کے موجب بن جاتے ہیں۔

"انسانوں کے علاوہ کسی کے الگ الگ نام نہیں ہوتے تو وہ سب اپنی قسم کے اعتبار سے ایک ہی نام سے جانے جاتے ہیں جیسے چوہا کہیں کا ہو صرف چوہا ہوتا ہے کبوتر صرف کبوتر ہوتا ہے گائے دودھ دے یا قصائی کا گوشت بنے ایک نام سے پکاری جاتی ہے۔ شاید اسی لئے ان میں موت کا ماتم اور پیدائش کا جشن نہیں ہوتا۔"

"دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں سے باہر" کے بعض کردار بہت کم عرصہ کے لئے نمودار ہوتے ہیں لیکن ان میں کوئی ایک ایسا پہلو ضرور ہوتا ہے جو ان کے غیاب میں چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ذہن میں گشت کرتا رہتا ہے۔ اس کی کوئی لغزش، اس کا کوئی عیب، اس کا کوئی فریب، ہمیں یاد نہیں رہتا، یاد رہتی ہے اس کی وہ شخصیت جو خوابوں سے لدی پھندی مگر شکستوں سے چور ہے، ہر آدھے ادھورے ٹوٹے پھوٹے غریب انسان میں ندا کو اپنی خانہ خرابی کی کوئی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے اور کچھ وقتوں کے لئے وہ اس کی رفاقتوں میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے۔

انسانی دردمندی کا یہ وہ درس ہے جو اس کی آوارگیوں کے سبب سے پہلے ٹریک ہیر سنگھ سے اسے ملا ہے جو خود مصیبت کا شکار ہے لیکن اپنی بیوی شیلا کے ہاتھ ندا کو فیس کی رقم مہیا کرانا نہیں بھولتا۔ یہ سبق اسے اس پنجابی شرنارتھی سے بھی ملا ہے جو لٹا پٹا ہونے کے باوجود گل کی تجہیز و تکفین کے لئے امداد کے طور پر سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے۔ وہ مندر کا پجاری اُسے انس اور دیالوئی کے معنی سکھاتا ہے جو ندا کو اس کے بچپن میں روز آواز دے کر بلاتا ہے اور ایک تازہ گلاب کا پھول مورتی سے اٹھا کر ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ اسکول کے ساتھی الطاف کی محبتوں سے اسے جسم و جنس کی رغبتوں اور تقاضوں کا علم ہوتا ہے۔ مس ہنٹن کی حادثاتی موت اس کے اندر ایک خالی درز سی چھوڑ دیتی ہے۔ کچھ دنوں کے لئے عشرت اس خالی درز کو پر ضرور کر دیتی ہے لیکن زندگی بڑی ظالم چیز ہے جس کے مطالبے جنس و جسم کے مطالبوں کو پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ عشرت اس کی پہلی اور آخری محبت ہے۔ باقی تمام جنسی اور جسمانی رشتے عشرت کے انتظار کے وعدے کی خالی جگہ کو بھرتے رہتے ہیں۔ وہ پھر اپنے پاپا انگریزی شراب چھوٹ بولے یا امانت میں خیانت کرے، چوری کرے یا جگی جھونپڑی کے آلودہ ماحول میں بسر کرے، نیدی اس پر ترس کھا کر پاگل کا رول اختیار کر لیں یا جنس و جسم کی ترغیبات اسے الجھائے رکھیں۔ وہ کہیں کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ ندا کے کردار کا یہی پہلو بے حد جیوٹ اور متاثر کن ہے۔

"انہی دنوں میں اس (ندا) کی ملاقات ہیرکار کی طوائف شیلا سے ہوتی ہے، ہیرکار کا کچھ دن سوگ منانے کے بعد اب وہ مستقل کوٹھے پر بیٹھنے لگی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کے گہنے اور چہرے پر خوشحالی کی چمک ہے۔ شیلا اپنے مرحوم عاشق کو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی بھول نہیں پائی ہے۔ وہ جب بھی ندا کے ساتھ ہوتی ہے تو پرانی یادوں سے آنکھیں ضرور بھگوتی ہے۔ ان یادوں کے سہارے وہ اکثر جسمانی دوریوں کو عبور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ پیشہ ور ہونے کے باوجود ان مشترک یادوں کے احترام میں ندا سے فیس نہیں لیتی۔ وہ جب پیسے دینے پر اصرار کرتا ہے تو شیلا سنجیدگی سے صرف اتنا کہتی ہے "تم میرے دوست ہو۔ وہ (ہیرکار) تمہیں بہت چاہتا تھا، میرے تمہارے بیچ تالی کیسے ہوگی، گھر کے لوگوں سے بھی کوئی لین دین کرتا ہے...؟"

ندا کی آنکھیں ذہنی، نفسی، شرابی اور ان داتا ہیں۔ ان بھری نئی دلیلوں سے خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے لیکن ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے کلمہ پڑھ کر اس کے وجود کا اثبات بھی کرتا ہے اور شام کو خدا کی بنائی ہوئی نامکمل کائنات میں تکمیل کے رنگ بھرنے کی کوشش کرتا۔ شخصیت کے ان تضادات نے اس کے ذہن میں تشکیک کے دھندلکے پیدا کر دیے ہیں۔

وطن کی تقسیم ہو جاتی ہے، آبادی ادھر سے اُدھر الٹ پلٹ جاتی ہے، کوئی کہیں رہ جاتا ہے کوئی کہیں، گھر کا آرام غارت ہو جاتا ہے، مستقبل کے سارے خواب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، برسوں کی بحالی کرتی آبادیاں تہس نہس ہو جاتی ہیں، گلی چھپر کھٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، عورتیں اخلاق کے معنی بدل دیتی ہیں، کنواریوں کی گودیں بھر جاتی ہیں اور بوڑھے قبروں کی راہ لیتے ہیں۔ اس شخص ندا کے خاندان کو بھی بے گھری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بھوپال ایک عارضی قیام گاہ کے طور پر درمیان میں آتا ہے، بھوپال کے بعد ندا عین وقت پر گھر سے بھاگ جاتا ہے اور باقی تمام گھر کے افراد پاکستان کی راہ لیتے ہیں۔ ندا کے لئے دلی، بھوپال اور گوالیار کا قرب امکان ایک کشش پا ثابت ہوتا ہے اور وہ تمنا کے دوسرے قدم کے طور پر عروس البلاد بمبئی کی راہ لیتا ہے۔

"بمبئی بڑی گھمنڈی بستی ہے۔ یہ آسانی سے ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتی، پہلے اپنے طور پر آزماتی ہے، ندا ستوں پر کئی چپلیں گھسواتی ہے، بار بار دیواروں سے چھینی ملاتی ہے، تماشہ بینوں کے کئی روپ دکھاتی ہے، جھوٹے وعدے کرتی ہے اور طویل طویل فاصلے کراتی ہے، لیکن جب تو ڑ چھوڑ دیتی ہے تو تازہ دم کرنے کے لئے نیا وعدہ تھما دیتی ہے۔ ایک وعدے سے دوسرے وعدے تک ضرورتیں مسلسل مصروف رکھتی ہیں۔ نہ وعدے ختم ہوتے ہیں نہ خواب پامال ہوتے ہیں۔ یہاں کے خواب بھی تکمیل کے درخت کی خاصیت

رکھتے ہیں' اچھے بُرے ہر موسم میں کہیں بھی اُگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ صبح
ہوتے ہی کوئی اَن دیکھا ہاتھ ڈھلان پر سورج کی گیند لڑھکا دیتا ہے اور پوری
بمبئی اس کے پیچھے بچوں کی طرح بھاگتی ہے۔ بھاگتے بھاگتے لوگ تھک
جاتے ہیں اور سورج روز کی طرح سمندر میں اُتر جاتا ہے۔"

بمبئی میں عزیز' جاوید' تاباں جہانسوی' کوالیار کا پپو (قصائی کا
بیٹا) محسن فہیم' پانڈو' ناس کھرجی' بشیر' ملّا گربت اور نورا ایسے کردار ہیں جنہیں
خود بھی یہ احساس نہیں ہے کہ ان کے اقدام یا اقدامات کی پشت پر کون سا جبر
کام کر رہا ہے۔ ارادے جہاں باندھے جاتے ہیں اس کا ایک سیاق ہوتا ہے'
ارادے جہاں ٹوٹتے ہیں اس کا ایک دوسرا سیاق ہوتا ہے۔ ایک خواب ہوتا ہے
دوسرا تعبیر' خواب میں بسر کرنا سہل ہوتا ہے لیکن تعبیر کی سرزمین بہت سخت ہوتی
ہے اور بڑی بے رحم بھی۔ سردار جعفری' اختر الایمان' ساحر لدھیانوی یا مجروح
سلطان پوری کی بے گھری ان کا کچھ بگاڑ نہیں پائی۔ ان کے پیروں تلے زمین
کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی زمین ملتی رہی۔ اسی لئے یہ کردار محض ٹائپ کے طور پر ہی
اُبھرتے ہیں' جیسا اُن کے بارے میں ہم جانتے ہیں وہ ویسے ہی ہیں۔
عصمت میں ایک انفرادیت ہے جو کر یا تصنع سے خالی ہے لیکن انہیں بھی شور
شرم سے واسطہ پڑتا ہے جن کے پیروں تلے کی دھول چاٹنی پڑتی ہے۔

نرا کا کردار عمر کے ہر باب میں تبدیلیوں سے گذرتا ہے جس
سیاست نے اسے گھر والوں سے دور کر دیا تھا وہ اس سیاست سے بھی الگ
ہے اور اپنے آپ سے بھی وہ اکثر خفا رہتا ہے کیونکہ وہ خود یہ سمجھ نہیں پاتا کہ آخر
وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے' کبھی خود کو دنیا دار سمجھتا ہے' کبھی خود پر جھلاتا ہے' کبھی
محفلوں میں تنہا ہو جاتا ہے اور کبھی تنہائی کو انجمن سے آراستہ کر دیتا ہے۔ اس
انجمن سازی میں کبھی نیم اور پیپل کے پیڑ' کبھی املی اور مولسری کے درخت
اس کے دم ساز بن جاتے ہیں' کبھی کسی جوہڑ کے کچھ لمحے وہ چرا لیتا ہے'
کوؤں کی رفاقت اس کے سپاٹ دنوں میں ایک نیا رنگ بھر دیتی ہے۔ وہ اپنے
ساتھ رہتا ضرور ہے لیکن اپنے آپ کو تنہا دیکھنا نہیں کرتا۔ اسی لئے اپنی تنہائی کو
وہ ہر وقت بھول اس کے غیر ضروری آوازوں سے آباد رکھتا ہے۔ "پائی ہوئی
چیز کو کھونا اور کھو کر اسے پھر تلاش کرنا اس کی عادت ہے۔" کبھی وہ ہر چیز کو
شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے' نہ اس کا کوئی دوست ہے نہ دشمن' جو بھی ہے وہ وقتی
ضرورت ہے۔ "دیواروں کے باہر" میں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "نا حق ہم مجبوروں
پر تہمت ہے مختاری کی"۔ اس کے باوجود وہ (نرا) خارج یا باطن کے تضاد میں
اپنے آپ کو تلاش کرتا ہے' اسے یاد آتا ہے کہ وہ جیسا پہلے تھا ویسا اب نہیں
ہے"

جمیل فاطمہ نرا کے انتظار کو دھوا چھوڑ کر آسمان کا تارہ بن جاتی
ہیں۔ والد اپنی جوانی کی آزاد روی کو تیاگ کر کے درود و صلوٰۃ میں باقی عمر گذار
دیتے ہیں۔ ان کی محبوبہ نینی پھر انہیں کبھی یاد نہیں آتی لیکن نینی آخر دم تک
ان کی یاد کو جی جان سے چپٹائے رہتی ہے۔ عشرت سے نکاح کے بعد بھی نرا
عشرت سے محروم رہتا ہے۔ ماتی جوشی اس کے ویرانے کو آباد ضرور کر دیتی ہے
لیکن عشرت اس کے ضمیر کی تھاہ سے کبھی نکل نہیں پاتی لیکن ایک خالصانہ بے
حسی کو اپنے اوپر حاوی کرنے کے باوجود جمیل فاطمہ نرا کی روح میں رچی بسی
رہتی ہیں۔ جمیل فاطمہ کی تاکیدیں' ان کے خواب' ان کی نمازیں' ان کی
خاموشی پھر ان کی مسہری کی دال میں جس کا نکھار اس میں سوکھی کیری کی کھٹائی
اور سرسوں کے تیل میں نئی فصل کے چھوٹے آلو اور ہری مرچی کا ذائقہ نرا کے
نہاں کدۂ ذہن میں ہمیشہ تازہ دم رہتا ہے۔ اسے سب عورتیں ایک سی لگتی ہیں
لیکن جمیل فاطمہ کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ
"میری صاحبہ ساری دنیا کی ماؤں سے الگ تھیں۔"

نرا کی ان دونوں جلدوں کو ناول کا نام دینا چاہئے یا نہیں؟ یہ سوال
ان لوگوں کے لئے ہی تذبذب کا باعث ہے جو ناول کی کسی ایک تکنیک یا کسی
ایک مسلسل دہرائے جانے والے فارم ہی کو ناول کے اصل فن سے تعبیر کرتے
ہیں۔ نرا کا ناول (دونوں جلدیں ملا کر) تجسیمہ بیانیہ کی اس تکنیک میں لکھا گیا
ہے جسے جیرالڈ پرنس نے The recounting of one or
more real or fictious events سے موسوم کیا ہے۔ نرا کے
واقعات' وارداتوں اور سانحات میں ایک واقعی اور فطری ترتیب کام کر رہی
ہے اگر چہ ناول کے تخلیقی ڈھانچے میں فطری نظم و ترتیب کوئی معنی نہیں رکھتی
لیکن نرا کا مسئلہ یہ تھا کہ ناول کہیں محض یادداشت بن کر نہ رہ جائے' اسی لئے وہ
بار بار فلیش بیک' فلیش فارورڈ' فلمی ٹائپ کٹس اور اسکرین پلے کی تکنیکوں کو
اس کمال ہوشیاری سے برتتا ہے کہ قاری کی ذہنی رَو کم ہی صدمے سے دوچار
ہوتی ہے۔ اسی لئے نرا کے فن میں ڈرامہ' نظم اور ناول کے فارم نے ایک
جمالیاتی وحدت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ درمیان میں کرشن چندر' سردار
جعفری' بیدی' عصمت' نیاز حیدر اور راہی معصوم رضا وغیرہ کی شخصیتوں کے
بعض چھپے ہوئے اور بعضوں کے لئے حیرت خیز پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا گیا
ہے لیکن نرا کی اپنی زندگی اس قدر دلچسپ اور توجہ خیز ہے کہ ادیبوں سے
متعلق یادداشتوں کا یہ سلسلہ کچھ زائد سا معلوم ہوتا ہے بلکہ ناول کے تدریجی
مرتب ہونے والے تاثر کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ البتہ ان ادیبوں کے فکر
و فن پر نرا نے جو رائے قائم کی ہیں وہ نرا کی تنقیدی بصیرت ہی کی غماز نہیں ہیں۔
ان کے حوالے سے ہم نرا کے تخلیقی شعور اور ان رویوں کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں
جو نرا کی شاعری کے پس پشت کارفرما ہیں۔

"ناسٹیلجیا تخلیقی ذہن کی بڑی قوت ہوتی ہے لیکن جب یہ شخصی ہوتی ہے تو اکہرا ہو جاتا ہے۔ اچھے ادب میں نجی یا ذاتی تہذیب و ثقافت اور ان کے طویل اتہاس سے وابستہ جو ذکر لسانی و زمانی دائروں سے آزاد ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب کا ایک بڑا حصہ اس آگہی سے محروم ہے جس کا حاصل ہے بے اطمینانی اور ماضی کی پاسبانی کے محدود رویے نے الفاظ کی قوتِ گویائی کو بھی محدود کر دیا ہے۔"

"میری شاعری نہ صرف ادب اور اس کے پڑھنے والوں کے ادبی رشتے کو ضروری مانتی ہے بلکہ اس کے تہذیبی و سماجی حوالے کو اپنا معیار بھی جانتی ہے۔ یہ ایک طرح سے ادب کی اس روایت کی حمایت ہے جو ادب کو اشرافیہ کی پرانی حکمرانی سے آزاد کر کے اسے عوامی وقار عطا کرتی ہے۔ یہ شاعری بند کمرے سے باہر نکل کر چلتی پھرتی زندگی کا ساتھ دیتی ہے اور ان علاقوں میں بھی جانے سے نہیں ہچکچاتی، جہاں روشنی بھی مشکل سے پہنچ پاتی ہے۔"

"اس شاعری کی زبان بھی اس کے موضوعات کی طرح نہ چہرے پر داڑھی سجاتی ہے نہ ماتھے پر تلک لگاتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو صوفی سنتوں کی زبان تھی جو گھر آنگن اور گلی کوچوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور انسانی رشتوں سے جگمگاتی ہے۔ یہ درباروں کی نہیں بازاروں کی زبان ہے۔ اس شاعری کا مزاج عوامی، احتجاجی اور مسائلی ہے۔"

ندا کا اسلوب اپنی کارکردگی میں بے حد تخلیقی ہے۔ اس کی شعری حسیت نے نثر میں بھی اپنا جادو جگایا ہے۔ اسلوب جہاں بیانیہ واضح ہے وہاں بھی اور جہاں محض تجزیاتی اور توضیحی ہے وہاں بھی وہ تخیل اور وجدان کے عمل سے غافل نہیں رہتے۔ جو بیک وقت اس کی شاعری میں ہمارے احساس میں شمولیت کے درپے رہتا ہے۔ ندا کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ وقفے چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی زبان میں بھی نیاپن کچھ نہیں رہا بلکہ زیادہ تر مانوس لفظیات ہی پر وہ اکتفا کر لیتا ہے۔ زبان کی تخلیقی قوتوں سے بھی اس نے کم ہی کام لیا ہے کیونکہ تخلیقی زبان کی پیچیدگیوں اور گرہ داریوں کو آزمائے بغیر بھی وہ مصرعوں کی ترتیب کچھ اس طور پر قائم کرتا ہے کہ مانوس نامانوس میں بدل جاتا ہے۔ اس طرح ان نظموں میں انسانی خباثتوں میں گم ہوتی ہوئی معصومیتوں کا شدید احساس ہمارے وقتوں کے قاری کے احساس سے ایک ذہنی رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ یہ چیز ندا کے اسلوبِ نثر سے بھی آشکار ہے۔ تھوڑا طنز، تھوڑا چلبلا پن، تھوڑی سنجیدگی، تھوڑا چٹخارہ پن، کہیں باتیں بنانے کا انداز کہیں استعجاب، کہیں دل گدازی، لے میں کہیں نرمی کہیں تلخی اور کہیں اخلاق آموزی یہی تمام صورتیں یک جا ہو کر اس کی نثر کو بھی انتہائی وقیع، عام ڈگر سے الگ، برجستہ اور توانا بناتی ہیں۔ ندا کی نثر میں اسی بنیاد پر تاثیر کی قوت اس کی شاعری سے کم نہیں ہے۔ درج ذیل یونانی اسطوری روایت کو ادا کرنے میں شاعری کے کئی جہان سمٹ آئے ہیں۔

"عورت نے اپنے جسم سے پنکھیں نمایاں نکال کر دھرتی پر چاروں طرف پھیلا دیں اور مرد کو آواز دی۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی سے ٹکراتی اس آواز کو جب مرد نے سمندر کی طرح چاروں دشاؤں میں پھیل کر ان کرنوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ سمیٹ لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مل کر مکمل ہو گئے تھے۔ عبادت گاہوں میں گہری نیند میں سوئی ہوئی غلافی مورتیوں نے اس تماشے کو دیکھا اور خوف زدہ ہو گئیں۔ وہ اپنے پتھروں کے خول سے باہر آئے۔ عورت اور مرد کے ملے جلے اس وجود کو اٹھا کر پہاڑ کی اس چوٹی پر لے گئے جہاں عورت کی آواز ٹکرائی تھی اور مرد نے اسے سنا تھا۔ ڈرے ہوئے دیوتاؤں نے آسمان کے تیز دھار سورج سے اس مکمل وجود کو تقسیم کر کے عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے الگ کیا اور ایک مکمل کے دو ادھورے حصوں کو مختلف سمتوں کے حوالے کر دیا۔ اس دن سے آج تک ایک ادھورا حصہ پورا ہونے کے لئے دوسرے ادھورے حصے کی تلاش میں ہے۔"

"چھٹی کا گھنٹہ بجتے ہی بچہ ماں کی طرف بھاگتا ہوا آتا ہے۔ زمین پر اس کے چھوٹے چھوٹے پیروں کی آہٹیں روشنی کے ننھے ننھے پھولوں کی مانند پہلے ماں کی آنکھوں میں چمکتی ہیں اور پھر پورے جسم میں جھلملانے لگتی ہیں اور وہ پل بھر کو دنیا کی حسین ترین عورت بن جاتی ہے۔"

ندا اپنی شاعری میں چیزوں کے احساس کو مسخ نہیں ہونے دیتا۔ جیسا کہ اکثر جدید شاعری میں لفظ پر تعبیرات کا ایک ایسا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے کہ شعر کی پہلی اور دوسری اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ قرأتیں ضائع چلی جاتی ہیں۔ ندا کے شعری تجربے میں حقیقت یا جذبے کی کہیں کہیں ذرات کو پکڑنے میں اس کی زبان اور اس کی غیر متوقع اور بے تکلف تکنیکوں کا ایک خاص کردار رہا ہے۔ جو اس کی نظم کو کبھی ایک جدولی تاثیر اور کبھی متحرک تصویر میں بدل دیتا ہے۔ فلم اور میڈیا سے گہرا تعلق ہونے کی بنا پر وہ چیزوں اور واقعات کو بصارت کے تجربے سے زیادہ گزارتا ہے اور قاری کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے استعمالاتِ زبان میں اس کی اولین ترجیح تاثیر کی دوگنا اور سہ گانہ تیز فوری قدر پر ہوتی ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو ندا کی نثر کی تخلیقی کارکردگی کی سمت بھی متعین کرتا ہے۔ اردو ناول کی تاریخ میں عبداللہ حسین کے "باگھ" کے بعد ندا فاضلی کے اس ناول کو نثر کے تخلیقی جوہر کا بہترین نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ عبداللہ حسین کا زور تجرید پر رہا ہے اور ندا کی ترجیح تجسیم کے عمل پر ہوتی ہے اور جو اپنے منظر میں چھپانے سے زیادہ دکھانے اور کھولنے کی طرف مائل رہا ہے۔

عصر حاضر کا منفرد گیت کار

ڈاکٹر یحییٰ رومانی

گیت ہندی شاعری کی دین ہے۔ اردو شاعری میں جس طرح کی گداختی خوبصورتی، نرماہٹ اور شیرینی کا احساس غزل میں ہوتا ہے۔ ہندی گیت ایسی ہی خصوصیات کا حامل ہے۔ اردو میں گیت نگاری کا آغاز کہاں، کیسے اور کب ہوا؟ یہ ہماری بحث سے اس وقت خارج ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں گیت، ہندی کے حوالے سے آیا۔ بعض لوگ اردو گیت کے ڈانڈے ولی سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک مختلف شاعروں کے کلام سے ملاتے ہیں۔ زبیر رضوی لکھتے ہیں کہ ہندی گیتوں کی لے پہلی بار اردو میں نظیر اکبر آبادی کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ (ماہنامہ "اقرار" پٹنہ ص ۵)

مجھے ان کے خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں گیت کے واضح نقوش پہلی بار محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ان کے بعد وجہی، غواصی، ولی، نظیر وغیرہ کی شاعری میں گیت کی لوچ پائی جاتی ہے۔ ۱۹ ویں صدی میں امانت کے ڈرامہ "اندر سبھا" میں اردو میں حقیقی طور پر گیت ملتے ہیں۔ بیسویں صدی میں ن م راشد، میراجی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، مقبول احمد لاری، عبدالحمید بھٹی، قیوم نظر، قتیل شفائی، قمر جلال آبادی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، مجروح سلطان پوری، جمیل انصاری، تاج سعید، مجید امجد، محمود نقوی، اکرام انگار وغیرہ نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔ حالیہ برسوں میں زبیر رضوی، منیر نیازی، ناصر شہزاد، کمل کرشن اشک وغیرہ نے بہت اچھے گیت لکھے اور اس صنف کو ایک مستقل صنف بنانے کی کوشش کی۔ ان ہی گیت کاروں میں ندا فاضلی کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ندا فاضلی شروع سے ہی ایک شاعرانہ ذہن لے کر آئے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ خارزاروں سے گزرے ہیں اور زندگی کے شدائد کا مقابلہ مسلسل کرتے آئے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے کلام میں عجیب گداختگی، درد اور تڑپ کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہ اسی رنج و الم کے شدید احساس کا ردعمل ہے کہ انہوں نے گیتوں کی طرف رجوع کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ زندگی سے لڑنے کا سب سے آسان اور دلکش طریقہ شاعری ہے۔

(ندا فاضلی کا ایک خط راقم الحروف کے نام)

ندا فاضلی گاؤں کی فضا میں پلے بڑھے ہیں اور اس کے ماحول اور زندگی سے واقف ہیں۔ اس کے بعد جب وہ شہر کی مشینی زندگی سے متصادم ہوئے تو ان کے ذہن نے عجیب انتشار کا تجربہ حاصل کیا۔ اسی لئے ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف اپنے گمشدہ شناخت کی بے حتی تلاش کا کرب ملتا ہے وہاں دوسری طرف مشینی زندگی کے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے بھی وہ خوابوں میں بسے ہوئے شاداب گاؤں کی حسین یادوں میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ ان کے خواب بکھر بکھر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع نفسانی تناؤ ہے جو مشینی قوتوں کے دباؤ اور خاص طور پر جنسی زندگی کی گھٹن سے پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے طبقے کے لوگوں کے دبے ہوئے جنسی اور نفسیاتی کیفیات کو پیش کرنے کے روادار ہیں۔ ان کا موضوع جنس زدہ ہے۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں عام طور پر اسی کیفیت کی بازیافت ملتی ہے۔ جنس کو وہ اس [illegible] ایک علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ زندگی کے دبے ہوئے ناسوروں اور مجروح خواہش کو جنس کا موضوع بنا کر سامنے رکھتے ہیں۔ ندا فاضلی کامیاب رومانی شاعر ہیں۔ وہ جنسی مسائل پر بھی نہایت سنجیدگی سے سوچتے ہیں اور اس کو کامیابی کے ساتھ اپنے گیتوں میں اس طرح برتتے ہیں کہ اس کا زیر و بم اور لے اور تال کی نرماہٹ روح کو برماتی ہے۔ مثلاً

جھر جھر پانی چھنے
دیے بنی گل دھارا
کو کے گئے نیر سے سنائے
میں چیخ چیخ کر ہارا
اتر دکھن پورب پچھم
ہوا کرے من مانی
پانی سے ساوا پانی

پیسہ بڑا ہرجائی
رے سے کون لڑا ہے بھائی
راجہ بنانے لاکھوں کے ٹھکر ٹھکر ہو آئے
جس مٹی کو جیتے ہو کہ اس میں ہی کھو جائے
نہ آئے کام کوئی چترائی
رے سے کون لڑا ہے بھائی

ندا فاضلی کے گیتوں میں ارضی تشبیہات، ارضی کیفیات اور ایک خاص قسم کی منظری ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے تمام پر پیچ راہیں خود بخود کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہم عصر شعرا میں ایسی تشبیہات و استعارات شاذ ہی نظر آتی ہیں، جو ندا کی شاعری میں ملتی ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں مصوری کرتے ہیں۔ ان کے گیت پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خود بے خود روح کی پیاس بجھ

رہی ہو۔ بلیوں کی شیشہ آنکھیں، دھرتی کی چھاتی، جل دھارا، کوٹھے، بیرے سنائے، رُت، نئی جل دھارا، آنگن آنگن جلتی جوالا، جگنے، بیل وغیرہ جیسے الفاظ اور تراکیب کے تانے بانے سے وہ ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاق وسباق میں ان تراکیب کا استعمال اس قدر موزوں ہے کہ حسین رنگوں کی آمیزش سے بنی ہوئی خوبصورت تصویریں آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ یہ خصوصیات اردو کے بہت کم گیت کاروں کے حصے میں آئی ہیں۔ مثلاً

بلیوں کی شیشہ آنکھوں میں
چھر چھر بادل
کٹی پھٹی دھرتی کی چھاتی
دور دور تک جنگل
پربت پربت وادی وادی
ویرانی ویرانی
پیاس بڑی دیوانی

لوہارن...... لوہے کو پیٹے
لگے ہتھوڑا سر پہ
بڑھئی بیچارا...... لکڑی چیرے
میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر
نئی صراحی میں بھی پانی
کیا جیسا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو......!

عذرا فاضلی نے اردو گیت کو ایک نئے آہنگ اور معنویت سے آشنا کیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ گیت میں مشتی دور سے ملی گئی زبان اور لہجے سے کام لیتے ہیں۔ حامد کاشمیری ان کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عذرا فاضلی جدید تہذیب کی زد میں آئے ہوئے سیدھے سادے اور معصوم انسانوں کی اداسیوں اور تنہائیوں کے شاعر ہیں۔

("نئی جہت اور عصری اردو شاعری" از حامد کاشمیری ص ۴۲۵)

یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ ہر وقت نرم، کومل اور احساسات سے بھرپور رہتا ہے۔ اس لہجے سے وہ اکثر جگہوں پر نازک اور نفسیاتی مقامات کو جگاتے ہیں۔ ان کی زبان فارسیت کے اثر سے آزاد ہے۔ وہ سادہ آسان اور روز مرہ بولی جانے والی زبان کو تخلیقی لمس عطا کرتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ سب سے الگ اور جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں میں عمل اور رد عمل دونوں کیفیات ملتی ہیں۔ عذرا فاضلی اپنے گیتوں میں وقت کے بدلاؤ کا سُریلا راگ الاپتے ہیں۔ وہ راگ جس میں محبت کا تاثر بھی ہے محرومی کی کسک بھی ہے اور انقلاب کی پکار بھی ہے۔ ان کے گیت اس فنان کے نازک جذباتی اتار چڑھاؤ کو پیش کرتے ہیں جو شہروں کی مصروف کاروباری زندگی میں سانس لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عذرا فاضلی نے گیت کے کینوس میں زندگی کی بڑی حقیقتوں کو سمیٹ لیا ہے۔ وہ گیت کے ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جنہوں نے اس صنف کو جواز نیت اور تکنیک سے آراستہ کیا ہے اور اس میں جوش، ولولہ اور تازگی و توانائی پیدا کی ہے۔ راج نرائن راز، عذرا فاضلی کے گیتوں میں نظم کی سی وحدت پاتے ہیں۔ چنانچہ اس کا احساس ایک جگہ پر دلاتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں۔

"جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے عذرا ہمارے ان معدودے چند شعرا میں سے ہیں جنہوں نے اس صنف پر خاطر خواہ توجہ کی اور موضوع کے اعتبار سے اسے نظم کی سی وحدت دی ہے"

(ماہنامہ "آج کل" دہلی، جولائی ۷۱ء، ص ۴۴)

عذرا فاضلی کے گیتوں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ ہر انسان کو ان میں اپنی ہی بات اپنے ہی دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس کے اندر کی آواز ہے۔ ان گیتوں میں رنگین پچی کاری بھی ہے اور جذبات کی بے لگامی بھی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے درج ذیل گیت نمونے کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

ہر مٹی میں ابھرا ریشم
ڈھرے بکھیر ڈورا
باہر سُو کاٹھی کنارے
اندر کاغذ کورا
کاجل، شیشہ، پرچم تارا، ہر سوئے میں گھاتا
چین شور بکھراتا
ڈھلتا سورج ان سے لجائے چندا رات چرائے
سانسوں کا اُصول زمانہ تیک لگا جائے
پھیرا لو نے پھیر اکتائی
سے سے کون لڑا ہے بھائی

ایک روپے کے سولہ آنے
دو آنے کا سول
بھائی بہن...... باپ اور جھم
ماتا چپ بیزار
گھونگھٹ میں کٹی خاموشی
دو دھاری تلوار

گھر کی لاج کھڑکی دروازے
کب سے سانکل کھول

ندا فاضلی کے گیتوں میں علاقائی اسلوب ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں ایک طرف سلیس اور رواں زبان کے ساتھ نئی تراکیب استعمال کی ہیں۔ وہاں رمزیت اور استعارے کے پہلو بھی اُجاگر کئے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے لوک شاعری کا رنگ بھی اس میں بھر دیا ہے جس سے ان کے گیت زیادہ مترنم لیے اور رس دار نظر آتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی ان کے گیتوں کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"اپنے زیادہ تر گیتوں کے لئے انہوں نے لوک گیتوں (خاص کر گنگا) کی دھن اختیار کی ہے جو بہت ہی خوشگوار معلوم ہوتی ہے"
(ماہنامہ "شب خون" نومبر ۲۹ ص ۷۸)

ندا فاضلی کے گیتوں میں قاری ایک خاص قسم کی کیفیت پاتا ہے اور وہ بے خود اپنے اندر جھانکنے کی کیفیت ان کے گنگناتے ہوئے مصرعوں کی ہم آہنگی اور مترنم آوازوں میں عزم و استقلال پیدا کرتی ہے۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کی لچک اور معنویت جگہ جگہ ملتی ہے۔ اس طرح سے ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ندا اپنے احساسات قاری تک فوری طور پر پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ استعارات اور تشبیہات پر وہ پوری دسترس رکھتے ہیں۔ اپنے گیتوں میں اُنہوں نے نئی خوبی اور جذبات کی شدت برقرار رکھی ہے۔ ندا کے اکثر گیتوں میں جہاں تاثر ہے وہاں مشاہدے میں کارفرمائی اور داخلی عوامل کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ ان کے گیتوں کی انفرادیت اور عظمت کا پورا اندازہ ان کے لہجے اور انداز بیان سے ہوتا ہے۔ مثلاً

ابھی ابھی ٹوٹے گا پیالہ
پھر خود جڑ جائے گا
مڑ کر دیکھا تو
کھڑکی کا سریا مڑ جائے
بھیگی لگے
بیت گئی رات
بندھے کاجل کے ڈورے سے چنچل ہرنی
کری کے پیچھے پچھائے کی پیالی
کھانسی کی کھڑ کھڑ میں ادھنگی گالی
چھوٹ گئی ہاتھوں سے پوجا کی تھالی
بیت گئی رات

ندا فاضلی کی شاعری میں روایت کی عنصر کے علاوہ غم کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت ساری مشکلات کا مقابلہ کر کے زندہ رہنے کا سبق سیکھا ہے۔ یہ غم کچھ تو شاعر کے ذاتی کرب سے پیدا ہوا ہے اور کچھ معاشرے کی ذہنی ہولناکیوں کے دُکھ سے۔ اس بات کا اعتراف خود ندا فاضلی اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں۔

"۱۹۶۴ء میں گوالیار میں گھر فسادات کی نذر ہو گیا تب سے اکیلا ہوں۔" اس فساد میں ندا فاضلی کا گھر بار لٹ گیا اور وہ زندگی کی دوڑ میں اکیلا سفر کرتا رہا۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں ان تمام حالات و واقعات کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنے دل کی ویرانیوں کا مرثیہ بڑے موثر انداز میں لکھا۔

ندا ایک جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کے گیت دلوں کو مسحور کرتے ہیں۔ ان میں پائل کی جھنکار بھی ہے اور گھنگروں کی آواز بھی ہے۔ عمل و عزم کا سبق بھی ان کے گیتوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ ان کے الفاظ سے صدیوں کی بے خوابی جھلکتی ہے۔ ندا کا جادو جگانے والا اسلوب ان کے گیتوں کو خوشنما رنگوں سے مزین کرتا ہے۔ ان کے گیتوں میں ہمارا سارا درد و کرب، ہمارے معاشرے کا کرب بلکہ ہمارے سارے عہد کا کرب رس رس کر ٹپک رہا ہے۔ مثلاً

جانے پہچانے ..... انجانے
اپنے اپنے گھاؤ
آنگن آنگن جلتی چولہا
سڑک سڑک
پتھراؤ
شبدوں کے سب چہرے زخمی
ننگے سارے بول

یا

بیت گئی رات نکلی ندیا کے پانی میں
الی سے طوطے نے چھینکے کنارے
آنگن سے دور پرے سانجھ سکارے
چنچل کی ٹوٹی سے گرتے ستارے

ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں مرقع کاری کے اچھے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ انہوں نے نیا علاقائی اسلوب اپنا کر ماضی کے دھندلکے کو درخشاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان پر انگریزی اور ہندی شاعری کا بھی براہ راست اثر ہے۔ ندا کے گیت ترنم لئے صاف اور خوشنما ہیں۔ ان کے گیتوں میں فسردگی، تحیر، گھٹن، آرزومندی، ترنم اور غنائیت بھی ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ ندا فاضلی نے اپنے نئے اور انوکھے تجربات سے گیت نگاری کو بام عروج پر پہنچا دیا اور یہی کیا کم اہم ہے۔

زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی

انور ظہیر خاں

نہیں یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں......وہ تو
نہ جانے کون تھے؟
یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں
سبھی کی دھڑکنوں میں ننھے ننھے چاند روشن ہیں
سبھی میری طرح سے وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں
جنہوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھس کر
مری آنکھوں کے آگے
مرے بچوں کو جلایا تھا
وہ کوئی اور تھے
وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ ہیں صاحب!
مگر ہاں!
پاس ہوں تو سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اس جنگل سے آئے تھے
جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے.....!

جلگاؤں کے فساد میں ایک عورت ہاجرہ بیگم کے جیتے جاگتے چار بچوں کو آگ میں بھسم کر دیا گیا تھا۔ اسی پس منظر میں کہی گئی یہ نظم جب بھیونڈی کے فساد ۱۹۷۰ء کے فوراً بعد ماہنامہ "شاعر" (بمبئی) اور روزنامہ "انقلاب" (بمبئی) میں چھپی تو اس کی معنویت اس لحاظ سے کئی گنا بڑھ گئی کہ بھیونڈی میں فساد کے دوران وحشت و بربریت کا جو ننگا ناچ ہوا وہ ریکارڈ توڑ گیا اور اپنی مثال پر اور جلگاؤں کے فساد کو شرما رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی "میں" اور "میری" کی تکرار کے باوجود نظم اور صاحب نظم کی دھوم مچ گئی۔ گھروں، دفتروں، چائے خانوں غرض بوڑھوں اور نوجوانوں میں گفتگو کا موضوع بنی۔ نظم ہنگامی موضوع پر تھی مگر اپنی تاثیر کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ میں اس زمانے میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نظم نوکِ زبان ہو گئی تھی۔

بمبئی کی ایک شام، دن بھر کا تھکا ماندہ سورج رات کی آغوش میں سونے جا رہا ہے، ابھی کچھ ہی دیر میں وہ سو جائے گا اور بکھرا رنگی قمقموں کا اُجالا دور تک پھیل جائے گا۔ میں اپنے اسکول کے ساتھی راشد شیخ اور احمد منظور سے باتیں کر رہا ہوں کہ ماروا ڑی چال کی دلداری سے دو آدمی مولانا آزاد روڈ کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ راشد نے آنکھ کے اشارے سے کہا۔ "وہ دیکھو راحد! (ن۔ ساحر) کے ساتھ ندا فاضلی چلے آ رہے ہیں" میں نے بڑھ کر ادب سے آداب کے بعد عرض کیا۔ "ندا صاحب آپ کی نظم 'جنگل کے لوگ' پڑھی بڑی پُر اثر نظم ہے، مبارک ہو۔" انہوں نے شاعرانہ انکسار اور بے نیازی کے ملے جلے رنگ میں شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئے کہ شام بے قرار ہو کر رہی تھی۔ وہ ن۔ ساحر کے ساتھ تھے تو یقیناً انہیں بہلانے کی دھن میں آواز دے رہی ہوں گی اور کیا عجب کہ اپنے کاشانے سے کوئی شہناز الہ رخ بھی اشارے کر رہی ہو.....!

مجھے ان کی یہ ادا بے حسّ تو قاتلانہ اچھی نہیں لگی۔ دل نے کہا "خدایا! کیا یہی ندا فاضلی ہیں؟ وہ ندا فاضلی جو جدید شاعر ہیں، ترقی پسندی کے کٹر مخالف، انسان دوست اور مظلوموں کے ہم نوا ہیں۔ انہیں ایسا تو نہیں ہونا چاہئے.....؟" وہ ہماری کچی عمر تھی۔ اس وقت نہیں مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بڑا اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے کے لئے پندار اور انکسار، سرشاری اور بیداری، نازو بے نیازی کا ایک ہالہ بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ قدر جب بلندی کے مراحل طے کر رہا ہو تو بعض لوگ بالا قدروں کے پیچ و خم کے قائل ہونے میں بھی مانع نہیں سمجھتے۔

ندا فاضلی کے وہ دن بمبئی کے بڑے زر سے دن تھے، جب جدوجہد کے باوجود جیب اور پیٹ میں ناپ تول ذرا مشکل سے ہو پاتا تھا۔ وہ ہاتھ میں کوئی ڈائری، کوئی کتاب یا کوئی رسالہ لئے دن بھر شہر کی سڑکیں ناپتے اور ادب نوازوں سے محبت اور عقیدت کا وظیفہ وصول کرتے پھرتے تھے۔ اس وقت اُن کے ملنے جلنے والوں میں فلمی، نیم علمی اور ادبی لوگ زیادہ تھے۔ اب ادبی اور علمی کا تناسب گھٹ کر فلمی کا تناسب بڑھ گیا ہے لیکن علم و ادب سے بیگانگی اختیار نہیں کی ہے۔ گویا وہ پورے طور پر فلمی نہیں ہوئے ہیں حالانکہ بہت کچھ شاعروں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ مگر مشاعرے باز قسم کے شاعر نہیں ہیں اور نہ گلے بازی کرتے ہیں۔ لیکن اسٹیج پر بعض اوقات اپنے جسم کے اعضا یوں ہلاتے ہیں گویا آگ پر لیٹے ہوئے ہوں یا پتے شوخ و شریر ہوا کی زد پر ہوں اور ٹیلی ویژن کے اسکرین پر تو ندا فاضلی کے ساتھ اسٹیج، اسٹیج پر اعلان لوگ، ہال میں بیٹھے سامعین۔ غرض سارا منظر ہی ہلتا ڈولتا بھی اچھا سا نظر آتا ہے۔

مشاعرے کسی لت یا علت کی طرح ان کی ذات سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ وہ کہیں بھی ہوں گھر میں، سفر میں، کسی کے دفتر میں، بزم میں یا بازار میں اپنے بس میں نہیں رہتے۔ کبھی اپنی عادت سے کبھی سامنے والے کے اصرار سے شعر سنانے پر اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ پھر شعر اپنے ہوں اپنوں کے ہوں یا غیروں کے بے تحاشہ سناتے اور داد لیتے ہیں۔ مگر وہ یہ کہ بیدار کوئی بھی داد کچھ کر وصول کرتے ہیں۔ کسی مشاعرے میں ان کے کلام پر داد کے ڈونگرے نہیں برستے تو وہ سامعین کو مخاطب کر کے اعلان کر بیٹھتے ہیں۔ "حضرات! میں قبرستان میں اذان دینے نہیں آیا ہوں۔" پاکستانی شاعر و نقاد سلیم احمد مرحوم کے

اور گاتے ہیں کہ "گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا" کا نمونہ نظر آتے ہیں۔ اُف! کس قدر شیریں اور دیوانی ہوتا ہے وہ منظر.... اگر کسی تحقیق کے مردِ میداں کو میری بات پر شک ہے اور یا وہ ثبوت تک پہنچنا چاہتا ہے تو وہ عزیز قیس کے گھر نہ جائے کہ بیلہ مرحوم ہو چکے ہیں البتہ باقر مہدی اور مہندر پرکاش صاحبان سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

عدنا فضلی ایک شادی شدہ آدمی ہیں۔ گویا ان معنوں میں کنوارے نہیں ہیں کہ سہرا کنویں جھانکنے کے بعد بھی ایک کنوارہ کنوارہ ہی رہتا ہے۔ شادی تو انہوں نے سوچ سمجھ کے کی مگر بیوی کے شکوے ہے گھر آنگن کے لمس سے محروم ہی رہے۔ وہ اس بیاہ گری کی دھوپ میں پگھل رہے ہیں اور ان کی تنہائی کی تکری چاندنی راتوں میں جل رہی ہے پہلے کنوار پن انہیں گھاٹ گھاٹ بھٹکاتا تھا۔ اب شادی شدہ زندگی کی محرومی پھر اس گھاٹ پر پہنچنے پر مجبور کرتی ہے جو سامنے ہو۔ کلیاں ہوں، پھول ہوں یا پکتی پنکھڑیاں انہیں سب سے لگاؤ ہے غرض جس شاخ جھکا پاؤں جھکا لے جاؤں، نہ جھکے تو جائے جھک مارے ان کی بلا سے۔ وہ بظاہر رشتوں کی تہذیب کے قائل ہیں اور نہ ہی تہذیب کے رشتوں کے۔ حالانکہ "لفظوں کا پل" ہو "سوا نیزے" ہو "آنکھ اور خواب کے درمیان" ہو "ملاقاتیں" ہو یا "دیواروں کے بیچ" ان کی ہر شعری اور نثری تصنیف میں رشتوں کی تہذیب اور تہذیب کے رشتوں کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ عورت کے ساتھ اگر تنہائی میسر ہو تو وہ "زمین آسمان کو سمیٹنے کا معجزہ" جگانے لگتے ہیں۔ ان کا خیال کچھ ایسا ہے کہ جب تک منہ میں دانت ہوں اور پیٹ میں آنت ہو تب تک خوب کھاؤ پیو اور جب تک رگوں میں لہو کی گردش تیز اور بدن میں قوت و حرارت ہے بیر پائے، سورج عزے اور رت جگے رہنے چاہئیں کہ نہ جانے کب رگوں میں دوڑتا پھرتا لہو تھم جائے اور بدن کا بیڑا غرق ہو جائے۔

اکیلے پن کی آگ ایک بہت بری بلا ہے۔ یہ سارے وجود کو جہاں تہاں سے جھلسا کے رکھ دیتی ہے۔ پھر آدمی کسی کام کا نہیں رہ جاتا ہے جھلسا ہوا مکان ہو یا پیڑ ہو کہ آدمی، سب میں بدصورتی سما جاتی ہے۔ یہ منظر اسے کٹ کے رہ جاتے ہیں۔ تنہائی کی آگ میں جھلسا ہوا آدمی غیروں ہی نہیں اپنی بھی نظر میں بے وقار، بے لباس، بے چہرہ ٹھہرتا ہے.... عدنا فضلی نے اپنے اکیلے پن کی آگ پر پانی ڈالنے کے لئے کتابوں، کتابی چہروں یا دوستوں، کسی کی یاد کی طرح اُترتی گہری ہوتی شام اور شیشہ و جام کا سہارا لیا.... کبھی چھوٹے چھوٹے ٹوٹتی کرچوں اور چھوٹے سہارے بھی کتنے پائیدار معلوم ہوتے ہیں.... اگر کسی کا دستِ شفقت، محبّت بھرا احساس، گوشت اور گرمی سے پُر بدن نہ ہو تو آس پاس کی ہر چیز، ہر منظر ایک وجود بن جاتا ہے اور تنہائی کا مارا آدمی ایش ٹرے میں سلگتی سگریٹ، سسکتی ہوئی ہوا، سرسراتے پردے، کھڑکی پر چھائیں، چائے کی پیالی، انگلیوں میں دبے قلم، کورے کاغذ اور شبدوں کی رکھاؤں سے بات کرنے لگتا ہے۔ اپنے اندر اور باہر کی یاترا شروع کر دیتا ہے۔ اگر آدمی ہوشمند ہو، سب کچھ سمن کر جانے والا ہو تو اس طرح کا جیون بھی جینے کا سلیقہ دے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دیکھئے اس پچپن برس کی عمر میں بھی عدنا فضلی کی بچپن کی سی شوخیاں جاری رہتی ہیں اور جوانی کی اُٹھان کے سے بے لگام قہقہے اُبلتے رہتے ہیں۔ اس مزاج کے لوگ نامرادیوں میں بھی لمحے لمحے سے خوشی کی بوندیں نچوڑ لیتے ہیں۔

تہذیبی رکھ رکھاؤ میں قدرے بے تمیزی، بنجارا مزاجی اور آزاد خیالی، ہو ٹوک بیانی اور خوش کلامی، گھر آنگن کے ماحول سے محرومی، دربدری، ٹھوکریں، شکوں شکوں اور بوسوں کی طلب، ذہانت و فطانت میں آلودگی اور لطافت، سنجیدگی اور ظرافت کے ملے جلے رنگوں کا خوش نما، کچھ بدنما، چنچل اور بے چین فنکار یکجا ہو جاتا ہے، جس میں حسین لطافت اور حسین تبسم کے جزا و دو بے چھپے ہوتے ہیں۔ اگر اپنے بکھراؤ کو سمیٹ اور سمیٹ کر رکھنے کی صلاحیت، اُمنگ اور ہمت نہ ہوتی تو عدنا فضلی مجاز کی طرح شعلہ زاروں میں جوانی جلا چکے ہوتے یا میرا جی کی طرح زندگی گنوائی ہو چکی ہوتی کہ ان پر روک ٹوک لگانے والے (گھر والے) سارے کے سارے پاکستان منتقل ہو چکے تھے.... گویا بکھراؤ اور بگاڑ کے سارے سامان موجود تھے۔ ان حالات میں وہ کہیں نظر بچا کے جسم و جاں بچائے ہوئے گزرے اور کہیں ہوس کی دنیا سجاتے ہوئے اپنی بے مہار بے سمت زندگی کو سمت دے کر سنوار لی.... ایسے میں بڑا کٹھن ہوتا ہے اپنی فطری مناسبتوں اور دلچسپیوں کو زندہ و شامل رکھتے ہوئے "زندگی سنوار لینا" ہزار دام سے ایک جنبش میں نکلنا اور ہزاروں دام اپنی شخصیت کے گرد بُن دینا.... یہی ہے عدنا فضلی کا لائف اسٹائل۔

عدنا فضلی کے لائف اسٹائل کی بات چلی ہے تو یہ بھی جان لینا چاہئے کہ انہیں کسی کا سوا گت کرنا ہے تو تالیاں، کسی کو داد دینی ہے یا بے داد کرنی ہے تو تالیاں، پروگرام کے آغاز پر تالیاں، اختتام پر تالیاں، بات بے بات پر تالیاں، ہاتھ پر تالیاں، تالیوں پر تالیاں..... غرض ہنسی، غصّہ، طنز، گویز، تفکر، سب کا مطلب تالیاں..... ان کے لائف اسٹائل کو تالیوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

عدنا فضلی جغرافیائی حد بندیوں اور سرحدوں پر کھنچی گئی لکیروں کے قائل نہیں ہیں۔ مٹی کا رنگ اور آب و ہوا مختلف ہو سکتی ہے لیکن ہے تو مٹی ہی، خواہ چھولے کی ہو یا چھاپرے کی، ہاٹ بازار کی ہو یا قبرستان کی، ہندو پاک کی ہو یا انڈونیشیا کی۔ سچ ہے سمائیں خود نہیں بنتیں، بنائی جاتی ہیں۔ دھرتی خود نہیں بٹتی بانٹ دی جاتی ہے اور اس کا کوئی دھرم نہیں ہوتا، البتہ سماج ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے شہری، دیہی اور جنگلی سماج!

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

سورج کی لال ٹکیہ سرکی سیدھ میں پہنچ کر پچھم کی طرف ڈھلنے لگی تھی۔ میں چرچ گیٹ اسٹیشن پر ٹرین سے اُتر کر مناثی ریلے میں بہتا ہوا آل

انڈیا ریڈیو کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اُردو سیکشن میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ سعید راہی صاحب (اناؤنسر آل انڈیا ریڈیو بمبئی) عذرا فاضلی کا غالب پر فیچر ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ریکارڈنگ روم میں پہنچ کر اشاروں اشاروں میں آداب کیا اور خیریت دریافت کی۔ ریکارڈنگ جاری تھی کہ دودھیا لباس میں دودھیا داڑھی والے ایک بزرگ آہستگی سے آ کر دیوار سے لگ جاتے ہیں۔ ریکارڈنگ ختم ہوئی تو عذرا فاضلی نے ان بزرگ صورت سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"آپ ہیں لاز جہانسوی صاحب!" میں چونکا، سنبھلا اور بولا "مگر پندرہ برس پہلے تو آپ ایسے نہیں ہوا کرتے تھے؟" میں نے ان کی سفید داڑھی اور بالوں سے بے نیاز چمکتی ہوئی چندیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عذرا نے فرمایا۔ "ہاں جناب! زمانہ بڑے بڑوں کو بدل دیتا ہے۔ آپ نے انہیں پندرہ بیس سال پہلے مشاعروں میں دیکھا ہوگا۔ اس وقت آپ قبلہ محترم جہان جوان تھے۔ چہرہ بالوں کے گچھے سے عاری تھا اور ترنم کے قائل ہوتے ہر مشاعرہ لوٹ شاعر ہوا کرتے تھے۔ اب ان کے اور مشاعروں کے درمیان داڑھی حائل ہو گئی ہے" یاور کے کیمرے نے اس لمحے کو قید کر لیا تھا۔ اب جو تصویر نکلی تو لاز جہانسوی جھینپے جھینپے سے کھڑے ہیں، میں مُسکرا رہا ہوں، سعید راہی ہنس رہے ہیں اور عذرا فاضلی کے کھلے ہوئے منہ سے قہقہے اُبل رہے ہیں۔

ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر چرچ گیٹ جانے والی سڑک پر ہو لیے۔ لوگ چل پھر رہے تھے ..... کوئی سوچ میں گم، کوئی ہنستا مُسکراتا، کوئی اپنے ساتھی/ساتھیوں سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا ..... یہ بمبئی ہے یہاں کی عورتیں چاردیواری اور تنہائی سے زیادہ دیر نباہ نہیں کر پاتی ہیں۔ دھان پان سی گداز اور کچے بدن کی کچی عمر والی لڑکیاں اور پکی عمر کی عورتیں گزر رہی تھیں ..... ہرنیوں کی طرح گزرتی کالج کی گرلز کی ایک ڈار کو اپنی نگاہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے عذرا فاضلی نے سوال داغ دیا۔

"لاز صاحب! اس عمر میں آپ کو عورتیں کیسی لگتی ہیں؟"

لاز جہانسوی بے چارے کیا جواب دیتے انہیں تو اپنی داڑھی اور بزرگی کا خیال تھا، بے بسی سے مسکرانے لگے۔

ا۔ظ۔خ (انور ظہیر خان): عذرا صاحبہ! عورتیں ہر عمر اور ہر روپ میں اچھی لگتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عمر کے ساتھ دیکھنے کے زاویے بدل جاتے ہیں۔

ع۔ف (عذرا فاضلی): نہیں! میرا مطلب کچھ اور ہے۔

ا۔ظ۔خ: کچھ اور سے مراد کیا بدن سے بدن تک کی یاترا!؟ لیکن جسموں کی بھی تو ایک تہذیب ہوتی ہے جسے ملکی رشتوں نے کچھ نہ کچھ نام دے رکھے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو ہم کیسے پہچانیں کہ یہ فلاں ہے یا اس کا فلاں سے یہ سمبندھ ہے۔ میری آنکھیں عذرا فاضلی کی پیازی اور بڑی بڑی آنکھوں کے کنارے پر جا کے ٹھہر گئیں اور دیکھا کہ شوخی اور شرارت کے پردے تیر رہے ہیں اور کھلے منہ سے چھوٹے چھوٹے قہقہے نکل رہے ہیں۔

ع۔ف: سوال بدن کی تہذیب کا یا سوشل ریلیشن شپ کا نہیں ہے بلکہ اپنی ایک کیفیت بیان کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے پھول جیسے چہرے اور چہرے جیسے پھول اچھے لگتے ہیں۔ ان دنوں تو یہ سب کچھ زیادہ ہی بھلا لگتا ہے۔

ا۔ظ۔خ: عذرا صاحبہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ بیتی ہوئی بہار پھر کی بہار سے زیادہ سہانی لگتی ہے کہ کیا کچھ دامن میں سما جائے۔ میں نے انہیں چھیڑتے ہوئے کہا۔

ع۔ف: It may be, but i don't feel and think in such a way. Now a days I have become more romantic, enthusiastic and creative. Why it is happening is not known to me.

اب دیکھئے اسی رومانٹک موڈ کی میں نے حال میں چند نظمیں کہی ہیں۔

(ایک مسکراہٹ)

چمکتے بتیس موتیوں والی مسکراہٹ
کھلا ہوا دالان جیسے
ڈھلا ہوا آسمان جیسے
سحر کی پہلی اذان جیسے
چاہتوں کا مہکا سا ساز کا
خوشیوں کا مہکا سا ساز کا
وہ ٹھیک چھ بج کے پانچ منٹ کی ایک جگمگاہٹ
اُتر کے ہونٹوں سے
یوں مرے ساتھ چل رہی ہے
نہ چھاؤں کچھ کم ہے راستوں سے
نہ دھوپ زیادہ نکل رہی ہے
میں جس طرح سوچتا تھا
بستی اسی طرح سے بدل رہی ہے
یہ ایک ستارہ
جو میری آنکھوں میں دیر سے جگمگا رہا ہے
اسے سمندر بلا رہا ہے

(چھوٹی سی ہنسی)

سُونی سُونی تھی فضا
میں نے یوں ہی
اس کے بالوں میں گھومتی تھا شوخیوں کو چھولیا
وہ ہنسی

تھوڑی سی
میں بھی تنہا
پھر ہمارے ساتھ
عیاں، نہاں
گہنایا دل
پھولوں کی تتلی
شہر جنگل سب کے سب جلنے لگے
اِک محلے میں
کسی گھر کے کسی کونے میں
چھوٹی سی ہنسی نے
دور تک پھیلی ہوئی دنیا کو روشن کر دیا ہے
زندگی میں
زندگی کا رنگ پھر سے بھر دیا ہے.....!

اتوار کا دن ہے، شام کا وقت ہے۔ عذرا عباس اپنے فلیٹ میں تنہا ہیں اور کلیات قلی قطب شاہ کے مطالعے میں محو ہیں۔ میں پہنچتا ہوں، وہ میرا حال احوال پوچھنے کے بعد کہتی ہیں۔ "چائے پی جائے؟" اور یہ کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہیں۔ میں نے کہا۔ "کیوں زحمت کرتی ہیں؟"

کہنے لگیں۔ "زحمت کی کیا بات ہے، آپ کے بہانے میں بھی پی لوں گی۔ ویسے شام ہو رہی ہے چائے کا وقت بھی ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "وقت جام کا بھی ہے۔" مسکرائیں اور پوچھا۔ "کیا آپ بھی ڈرنک کرتے ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "ہاں، بیڑی، سگریٹ، شراب غرض جتنی اچھی عادتیں ہیں وہ میں نے اختیار نہیں کی ہیں۔" زور سے ہنسیں اور کچن کا رُخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گرما گرم بھاپ چائے لئے برآمد ہوئیں۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ان دنوں قلی قطب شاہ زیرِ مطالعہ ہیں۔" مسکرا دیں۔ "جی ہاں! ادب کی تاریخ میں دکنی زبان کے شاعر کی حیثیت سے اس کا ذکر تو آتا ہے، لیکن اس کے یہاں موضوعات کی جو رنگارنگی، نشاط اور سرشاری کی جو کیفیت ہے، جیتے جاگتے معشوقوں کی جو تصویر ہے اور سب سے اہم مٹی کی جو مہاس ملتی ہے، اس کی بدولت اس کا قد اونچا ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے قد کی صحیح پیمائش ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ شاعری صرف فکر سے نہیں بلکہ جذبات کی سچی تصویروں، پاس پڑوس کی فضا آفرینیوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، غموں، ہلچل پیدا کرنے والے لمحوں سے بھی پیدا ہوتی ہے۔"

عذرا نے کہا۔ "یقیناً فکری شاعری ذہن کو اور بڑی شاعری بڑے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے، لیکن ایک شاعری وہ بھی ہوتی ہے جو بڑی نہ ہو مگر اچھی ہو سکتی ہے جس میں ہمارے شہروں کی چہل پہل، دیہاتوں کا خاموش اور پُرسکون ماحول، ہماری مٹی کی سگندھ، ہماری سنسکرتی اور سبھیتا کی چاپ محسوس ہوتی ہے۔ خسرو، کبیر، گرونانک، میرا بائی، قلی قطب شاہ، نظیر اکبرآبادی اور ٹیگور وغیرہ کی شاعری پوری طرح اپنی مٹی اور پانی سے جڑی ہوئی ہے اور قلی قطب شاہ کے یہاں یہ سب کچھ ایک خاص رنگ و آہنگ میں ملتا ہے۔"

میں نے پھر چھیڑا۔ "عذرا صاحبہ! دراصل یہ بات آپ اس لئے کہہ رہی ہیں کہ ہماری شاعری کی تمام اصناف پر غزل ہمیشہ چھائی رہی ہے۔ ظاہر ہے غزل وسیلہ کا نہیں اختصار کا فن ہے۔ یہ ایک ایجاز آرٹ ہے۔ ہمارے یہاں کچھ ایسی تہذیب وضع کا احترام رکھا جاتا ہے جہاں پردہ داری سے زیادہ پردہ داری کی پاسداری کی جاتی ہے۔ جذبات اور احساسات کو برملا اور بے تحاشہ بیان نہیں کیا جاتا۔ رمز و کنایہ کی چلمنوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ شاید ہمارے قدیم اور بوڑھے کلچر کی دین ہے جو ہماری مجبوری بھی اور ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طلسم ہوش ربا میں، امن کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب میں ہی نہیں، نذیر احمد کے قصوں اور مرزا رسوا کے ناولوں میں اور تو اور بحرالبیان، خواب و خیال، زہر عشق مثنوی گلزار نسیم، انیس و دبیر کے مرثیوں میں کیا ہندوستانی باغوں، راگوں، ناٹ، بازاروں کی فضا نہیں ملتی؟ دوسرے آپ نے اُردو شاعری میں صرف خسرو، قلی قطب شاہ اور نظیر کا نام لیا ہے۔ کیا غالب اور اقبال کی شاعری اپنے کلچر کی نمائندہ نہیں ہے۔ کیا ان کے فکر و فن میں ہمارا کلچر، ہماری تہذیب سب مل کر تحلیل و تعمیر ہو کر نہیں آئے ہیں۔ دراصل بڑا فنکار جغرافیائی حدیں پھلانگ جاتا ہے، لیکن اس کے فنکار اور آرٹ کا خمیر اٹھتا ہے اس کی اسی دھرتی اور اس معاشرے سے جہاں اس کے وجود کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔"

عذرا اپنے مخصوص انداز کے ساتھ خلا میں گھورتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ قلی قطب شاہ اور نظیر اکبرآبادی کے علاوہ اُردو کے تمام فنکار اپنے کلچر سے کٹے ہوئے ہیں۔ جو فنکار اپنے کلچر سے کٹ جاتا ہے وہ زیرو تا زیرو ہو جاتا ہے۔ میرا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ ہمارے کلچر کے وہ بنیادی روپ و رنگ، وہ ارضیت، بولی ٹھولی کے آکار مکمل کر پورے طور پر ہمارے فنکاروں کے ہاں نہیں آئے ہیں اور انہوں نے زبان کو فارسی ترکیبوں مرکبوں سے اس قدر بوجھل بنا دیا ہے کہ افعال، ماضی، مستقبل، حال کے صیغے ہٹا دیجئے تو عربی آمیز فارسی ہے۔ آج کے بعض فنکار اس بات کو محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے موضوع اور اظہار دونوں میں تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ لیکن بہت سے فنکار ابھی بھی پردے سرکاتے اور جالے ہٹاتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ اور یہ اُردو کے پنپنے کی باتیں نہیں ہیں۔ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیں اپنے کلچر کو فوکس کرنا ہوگا تمام تر خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ۔ ہندی سے اُردو نے بہت کچھ لیا ہے اور اسے ابھی بہت کچھ لینا ہے۔"

"عذرا صاحبہ! میری مطلوبہ کتابیں کہاں ہیں....؟"

"دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لائبریری نما بیڈ روم میں جا کے ڈوب گئے۔

میں نے ہانک لگائی۔ "میں آ جاؤں....؟"

آواز آئی۔ "نہیں...... میں ابھی آیا۔" کچھ دیر کے بعد وہ کئی کتابیں لئے ہوئے طلوع ہوئے۔

میں نے کتابیں اٹھاتے ہوئے خدا حافظ کہا اور فلیٹ سے نکل گیا۔ اب رات شام پر حاوی ہو چکی تھی۔ سیاہ سائے گہرے ہو گئے تھے مگر بمبئی میں تو رات بھی دن کا منظر پیش کرتی ہے۔ میں آٹو رکشا میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب میں پہلی مرتبہ ندا صاحب کے گھر گیا۔ بڑے با ادب بڑے مہذب لگ رہے تھے۔ اپنے ہاتھ سے بنا کر چائے پلائی۔ کیا یہ وہی ندا فاضلی ہیں جو ہر شخص پر اپنے تیر و نشتر آزماتے رہتے ہیں۔ جو ہر جگہ اپنے بے کل اور کلنڈرے نیچر کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ جہاں کتابیں رکھی تھیں ندا صاحب نے مجھے وہاں تک پہنچنے نہیں دیا۔ آخر وجہ کیا؟ جو شخص باہر کھلی کتاب کی طرح رہتا ہے وہ اپنے گھر میں اس قدر رکھ رکھاؤ اور لئے دیئے نظر آئے، یہ خبر کوئی بات نہیں۔ یہ تو گھر پر جانے کا پہلا موقع تھا۔ "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں"

ایک سہ پہر ندا فاضلی کے فلیٹ کی بیل کا سوئچ آن کیا۔ ندا فاضلی نے ریشمی تہمد اور ململ کا کرتا پہنے دروازہ کھولا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پینتیس سال کی گوری چٹی سی گدرائے بدن کی خاتون ریشم کی لنگی اور ہلکے آسمانی رنگ کا کرتا زیب تن کئے بیڈ روم سے ہال میں چھم سے آ گئیں۔ ندا فاضلی نے ان سے میرا تعارف کرانے کے بعد ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میری فرینڈ مالتی ہیں بہت اچھا گاتی ہیں۔ کیا آپ کچھ سنیں گے۔" میں نے کہا "سلوتوں کے سوا سب کچھ۔" کچھ لمحوں کے لئے کمرے کی سنجیدہ فضا ہم سب کے قہقہوں سے آباد ہو گئی۔ میں مخاطب ہوا "ہاں تو مالتی جی! کچھ ہو جائے" لیکن وہ بھی کچھ سنانے پر آمادہ نہیں ہوئیں، ندا نے زور دیا، میں نے اصرار کیا۔ وہ کچھ شرمائی سی کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا "آپ لوگ باتیں کیجئے میں ابھی آئی۔"

وہ دراصل چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھیں۔

"ندا صاحب! آپ کی شاعری پر قصباتی سے زیادہ شہری زندگی کا پرچھاواں پڑتا نظر آتا ہے اور آپ کے ہم عصروں ہم سنوں کے یہاں بھی یہی صورت حال ہے" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولے "میر اور ہم عصروں کا کیا ذکر۔ پریم چند اور ان کے چند معاصرین کو چھوڑ کر اردو کا سارا نثری و شعری ادب شہری مزاج کا حامل ہے اور یہی نہیں بلکہ اردو زبان بھی شہروں کی ہی پیداوار ہے۔ البتہ میرے معاصرین کے یہاں شہری زندگی کی آویزش، کشمکش War of survival کا دھواں، تیز رفتاری اور تھکاوٹ کا احساس، میکانکی شب و روز، تعلق میں لاتعلقی اور لاتعلقی میں تعلق کا اظہار، بجھے دلوں کی طرح بجھی ہوئی زندگی، جس کا مقصد چند سکے، چند لقمے اور خوشی کے چند لمحے ہیں۔ نہ راستوں کا پتہ ہے اور نہ ہی سمتوں کی جانکاری۔ رشتوں کی قید اور اس قید خانے کی گھٹتی ہوئی سلامتی، باہر اپنے اندر اور باہر کی، یہ سب ہم نے کیا دیکھا بھالا اور جھیلا ہے اسی لئے یہ سب کچھ ہمارے عہد کی شاعری، افسانے، ناول، ڈرامے اور فلم کا موضوع ہے۔ یہ سب ہم اس لئے نہیں پیش کر رہے ہیں کہ ہم نے مغرب کے لٹریچر میں پڑھا ہے بلکہ یہ کسی حد تک ہمارا اور ہمارے تخلیقی ہم سفروں کا بھوگا ہوا ہے۔ ہم لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ آج کے دور کا رزمیہ سا ہے۔"

"ندا صاحب! رزمیہ میں طوالت اور ترتیب ہوتی ہے۔ ایک واقعے سے لگا ہوا دوسرا واقعہ، ایک منظر سے جھانکتا ہوا دوسرا منظر اور کردار ہیں کہ کھوے سے کھوا رگڑ کے چلتے، ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سنسکرت، فارسی اور یورپی ادب میں رزمیوں کی ایک شاندار اور صحت مند روایت ملتی ہے اور معاف کیجئے ہمارے یہاں تو رزمیے سرے سے ملتے ہی نہیں۔"

ندا نے پھر پہلو بدلا۔ نہ جانے کہاں سے اٹھا کر سنجیدگی کی موٹی سی چادر اوڑھی اور ایک لمبی سانس کھینچ کر سینے میں ابھری جو نشتر ہوتے ہوئے ٹیوب کی طرح نکل گئی۔ وہ شاعروں پڑھے اور گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے فنکار ہیں۔ اس موضوع پر وہ دل جمعی سے دیر تک بول سکتے تھے مگر وہ اس کا عکس اپنی شاعری کی جھلکی سے دیکھنے اور دکھانے لگے۔ "ہاں صاحب! یہ ضرور ہے ہمارے یہاں رزمیے نہیں ملتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اشاروں، کنایوں میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ اس لئے تفصیل اور تسلسل کے ساتھ مختلف زمانوں کی کہانی نہیں ملتی مگر مختلف اصناف میں مصرع مصرع جو داستان بکھری ہوئی ہے ان میں رزمیہ پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں سمیٹا اور یکجا کیا جائے تو ہر عہد کا کرب، تضاد اور تصادم ملے گا۔"

"تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے عہد کا غالب شعری رجحان، نظم، نثر اور آزاد نظم، غزل اور افسانے سے ملتا ہے اس میں ہمارے رنج والم، بے باکی، بولتا کی، بوس باکی اور کشمکش کی آئینہ داری ہو رہی ہے"

"جی ہاں بالکل! ہماری دلچسپیاں، ہمارے سناٹے، ہماری دلداریاں، بے ثباتیاں سب آج کے ادب میں موجود ہیں۔ آج انسان کے ظاہر اور باطن میں جنگ جاری ہے اور وہ جس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے، جس طرح وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہے، ہم لوگ اسی ٹوٹتے ہوئے انسان کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔"

رستے میں وہ ملا تھا، میں بچ کر نکل گیا
اس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہو گئی

دشمنی لاکھ سہی، ختم نہ کیجے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے

آوارہ مزاجی نے پھیلا دیا آنگن کو
آکاش کی چادر ہے دھرتی کا بچھونا ہے

دیکھتے دیکھتے
ٹی وی
فریج صوفہ بن کے
آدمی کھوگیا عزت کا تماشا بن کے

ہر گھڑی بھاگتے رہنا ہے مقدر اس کا
گھر کی دیواروں نے ہی چھین لیا گھر اس کا

''یہ تو آپ نے اپنی شاعری کے حوالے دیے ہیں۔ کچھ اس سے بہتر حوالے بھی؟'' مگر عدنا خاموش تھے اور آنکھیں سوال کر رہی تھیں ''کیا اس سے بھی بہتر شاعری ہوتی ہے؟''

عدنا فضلی کے گھر پہنچیے تو وہ آپ کے مزاج کے مطابق چائے پیجے اور مے سے آپ کی تواضع کریں گے۔ ایک مست مگن شام ہے سادگی سے آراستہ اپنے فلیٹ میں وہ ایک فلم ڈائریکٹر دوست کے ساتھ گدے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ سامنے تپائی پر Dunhill کا پیکٹ خوبصورت سا لائٹر اور ایش ٹرے کے پر دو عدد سگریٹیں رکھی ہیں۔ جن کی بو اور دھوئیں کے مرغولوں سے کمرہ پر اسرار بنا ہوا ہے۔ شام کا نیلا پن مزید گہرا ہوگیا ہے۔ تپائی کی دوسری جانب سوڈا واٹر کی دو بوتلیں اور کانچ کے دو گلاس رکھے ہیں۔

عدنا بائیں ہاتھ سے گدے پر تھاپ لگا رہے ہیں دائیں ہاتھ میں وسکی کی بوتل ہے۔ جس کا منہ گلاس میں ہے اور قُلقُل جا کی صدا سنائی دے رہی ہے ''آیئے آیئے آپ کے لئے پیگ بناؤں؟''

''میں تو پیتا نہیں۔''

''تو آپ کو صاحب ایمان کہے دیتا ہوں۔''

''نہیں جناب! آپ مومن بنے رہیں میں بے ایمان ہی بھلا۔''

''اچھا تو آپ شرابِ طہورا کے قائل ہیں؟''

''خدا جانے وہ کس نصیب میں ہے یا نہیں۔''

''اچھا تو کسی کی شراب سے تو شوق کرتے ہوں گے۔''

''ہاں اس سلسلہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ''کم کم'' ہی کسی صحبت پیمانہ رہی ہے''

''یہ لیجیے بڑے چٹپٹے چنے ہیں کھائیے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔

''آپ جھجک کیوں رہے ہیں۔ یہ شراب میں نہیں پانی میں پکے ہیں۔'' پھر زوردار قہقہے عدنا فضلی اور ان کے دوست کے بلند ہوئے جن میں میری کھسیانی ہنسی بھی شامل تھی۔

ہر فنکار کو اپنا فن پیارا ہوتا ہے مگر عدنا فضلی کو اپنی شاعری ہوا شعر ہونے کچھ زیادہ ہی پیارے ہیں۔ جوں جوں شام رات کے قریب ہوتی جا رہی ہے نشہ بھی آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اب وہ اپنی شاعری کی زبان میں بات کرنے لگے ہیں۔

یہ زندگی جو آج تمہارے
بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں مچل رہی ہے
تمہارے پیروں سے چل رہی ہے
تمہاری آواز میں
گلے سے نکل رہی ہے
تمہارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی جانے کتنی صدیوں سے
یوں ہی چہرے بدل رہی ہے

یہ مندرجہ بالا مصرعے وہ چار مرتبہ دہرا چکے ہیں۔ ''ہاں تو یوں چہرے بدل رہی ہے'' کے بعد کیا.....؟

بدلتے چہروں
بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ اک شرارہ
جو اس گھڑی کا م ہے تمہارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے
اسی سے روشن ہے ہر نظارہ

(پھر ایک طویل وقفہ) ''عدنا صاحب! آگے بھی کچھ ہوگا؟''

ستارے توڑو
کہ گھر بساؤ
قلم اٹھاؤ
کہ سر جھکاؤ
تمہاری آنکھوں کی روشنی تک ہے کھیل سارا
یہ کھیل ہوگا نہیں دوبارہ

عدنا ان مصرعوں (نظم) کو بار بار دہرا کے ہر کردار، تمام اشیاء، تمام مناظر کو اپنی امنگوں، ترنگوں، جذبوں اور جوانیوں کی حت کھٹ، اٹھیل اور کھیل زبان دے دینا چاہتے ہیں کہ ہر چیز ان کی آواز میں آواز ملائے، ان کے لہجے میں بات کرے، ملاقات کرے۔ اب وہ اپنی ذات کے حصار اور شاعری کے ہالے سے نکلنا نہیں چاہتے۔

ایک منظر یاد آتا ہے کہ اپریل یا مئی کا مہینہ ہے۔ سنہری اور نرم سی مائل شام دھیرے دھیرے پاؤں شہر پر اتر رہی ہے۔ بادامی رودباری اسکول اینڈ جونیئر کالج

میں عذرا اصغر کے سوانحی ناول "دیواروں کے بیچ" پر گفتگو کے لئے یاردوست اکٹھا ہیں۔ صدارت ہے ہندی کے کوی اور کہانی کار کنول شکل صاحب کی۔ مہمان خصوصی ہیں جناب نریندر پرکاش۔ مضمون پڑھنے والے ہیں ان کے ہم عصر فنکار دشتاق مومن، مقصود رحیم اور قدرے سلام بن رزاق صاحبان کو چھوڑ کے انور خان اور انور قمر صاحبان کے مختصر مضامین تعمیمی ہیں اور کچھ تنقیدی بھی۔ انور خان تو شروع ہی کچھ اس طرح کے جملے سے ہوتے ہیں۔

"دیواروں کے بیچ کی نثر Readable ہونے کے باوجود عذرا کی اس کتاب نے ہمیں سخت مایوس کیا ہے"

انور قمر نے بھی لگ بھگ اسی انداز کی باتیں لکھی تھیں مگر لہجہ نیتا نرم تھا۔ ہر مضمون پر جم کے بحث ہوئی۔ حاضرین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ذہن میں خوب دھول اڑی، رہی سہی کسر نریندر پرکاش نے پوری کر دی۔ تعریف کے ساتھ عیب چینی کرنے والے نہ جانے کس جوش میں کیا کیا کہہ گذرے بعض کہنے والوں کے چہروں سے عیاں تھا کہ انہیں اپنی بات پر مکمل بھروسہ نہیں سو ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو رہا تھا۔ اس بھری محفل میں چند مجھ جیسے بے مایہ دور سے جلوہ دیکھنے والے بھی موجود تھے۔ جو حیرت کا پتلا بنے اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں عذرا اصغر اب کیا فرماتے ہیں، جو بیچ اس سکے کے......

عذرا بڑے سکون سے بیٹھے کچھ کھاتے چباتے رہے، اپنی کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے سب کچھ دیکھتے رہے اور سنتے رہے۔ کچھ خاص موقعوں پر بعض چہروں پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی نہیں جا سکی محسوس کی جا سکی ہے۔ میں نے اپنی نگاہوں کا فوکس آن کیا تو دیکھا کہ عذرا کے یہاں نہ اضطراب ہے نہ انتشار نہ غصب ہے نہ ملال نہ آہ ہے نہ واہ۔ البتہ بات بات پر ہنسی کی جگہ ایک گہری سنجیدگی نے لے لی ہے۔

جب ان کے بولنے کی باری آئی تو بڑے آرام سے کھڑے ہوئے بڑے اطمینان سے پندرہ سولہ منٹوں میں ایک ایک سوال، ایک ایک اعتراض کا جواب دے ڈالا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ آپ کی بات میں رتی ماشہ تولہ کتنا وزن ہے تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ دراصل ایک چیز ہوتی ہے "کولاژ" جس میں چیزوں کو جوڑ کر ایک تصویر بنا دی جاتی ہے۔ میں نے تصویر یں بنائی ہیں وہ اگر مکمل نہیں تو دھندلی بھی نہیں ہیں۔ پسند و ناپسند کا معاملہ بڑا گھمبیر ہوتا ہے، دوستوں کو دوستوں کی تحریر پر اعتراض کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔ یہ اپنے زاویۂ نگاہ ظرف اور حوصلے کی بات ہے۔ میں اپنے لکھے پر نادم نہیں ہوں۔

عذرا اصغر نے آج کی اُردو شاعری کو ایک نیا ڈکشن اور ٹرینڈ دیا ہے جس میں عوام اور عوامی گیتوں کا سا سبھاؤ ہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں، نہایت ذہین آدمی ہیں، حافظہ بلا کا تیز ہے، بے حد بے کینہ ہے، دل کی بستی ہر وقت سے آباد ہے، آڑے وقتوں میں دامے درمے قدمے قلمے کام ...... غرض ہر طرح سے لوگوں کے کام آتے ہیں۔ آج جب کہ ہمارے روز و شب منافقوں کے درمیان بسر ہو رہے ہیں۔ ہر فرد کو اپنے مفادات سے غرض ہے۔ یہ خلوص و وفا، یہ نباہ، یہ دوستی، زندگی کو مصیبت کے مارے کی جیب میں کھول دینا انسانیت نہیں تو اور کیا ہے۔ عذرا ان لوگوں میں سے ہیں جو جتنا جوں مصیبت کے مارے ہم عصر فنکاروں کا ذکر و مباحث لیتے ہیں جیسے کوئی قریبی عزیز اپنی بساط بھر اپنی ہی عزیز بہنوں کے ساتھ کرتا ہے لیکن یہاں تو خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ البتہ کئی رشتے ہوتے ہیں، انسانیت، فنکاری اور دوست داری کا رشتہ۔ عذرا اصغر یہ تینوں رشتے خوب نبھاتے ہیں غرض عذرا کی ہر ادا ہے تو اے عاشقانہ اور ہر ادا ہے ادائے دلبرانہ!

عذرا اصغر جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے نثر نگار ہیں۔ شاعری میں وہ نیا دھماکہ نہیں ہوتے کہ روایت کی جگہیں پڑی ہوتی ہیں۔ لیکن نثر میں تمثیلوں اور استعاروں کی ایک حد مقرر ہے آگے بڑھے تو مقصدیت کے زور کم ہو جاتا ہے اور بیچارے الفاظ حسن و تمیز کا حسن کے رہ جاتے ہیں۔ ادب کا اصول یہ ہے کہ روئی یا مصنف جس قدر اپنے آپ کو چھپائے رکھے بہتر ہے "ملاقاتیں" ہو یا "دیواروں کے بیچ" دونوں جگہ میں کی کہانیوں سنائی دیتی ہے جیسے رات کے اندھیرے میں باجی کی چنگھاڑ۔ عذرا اسے چن اور چھانٹنے پر یقین رکھتے ہیں۔

"ملاقاتیں" میں وہ شخصیات جو اس کتاب کا موضوع ہیں، جہاں ان سے ملاقات ہوئی ہے وہ ہیں عذرا اصغر کے تیور اور ہیرے کو بھی ہم بھانپ لیتے ہیں۔ "دیواروں کے بیچ" میں ہم ان کی جلوتوں کے تماشائی اور خلوتوں کے محرم راز تو بنے ہیں، مگر اب بھی بہت سے گوشے ہیں جن پر انہوں نے اپنے قلم کی سرچ لائٹ نہیں ماری ہیں۔ لیکن "میں" یہاں بھی موجود ہے۔ ہائے بولتی کر "مقتولوں کا ٹیل" بنا کر ظاہر و باطن کی کنزشہ موجود ہونا آخر ہو رہا نوں کی سیر کرنے کرانے والے آنکھ اور خواب کے درمیان کڑوی سچائیوں کی تعبیر کرنے والے، بے باک، بے لاگ، بے جھجک عذرا اصغر "دیواروں کے بیچ" سے گذرتے ہوئے دیواروں پر ٹنگے جالوں، دیواروں پر لگے پوڑ شیں پر جمی چھائیوں، مہاسوں اور چیچک کے داغوں کو دامن و دل پر لگے دھبوں کو کیوں مزید نمایاں کر کے پیش نہ کر سکے۔ جہاں سے سوالوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ یہ پردہ داری ہے یا قلم کی مجبوری۔ کچھ بھی ہو عذرا اصغر کا مقام نیا ہے۔ برسوں ریاضت کی مشق، برسہا برس کی محنت کا پھل ہے۔ جو جتنا نیا دہ ہے کڑوا کم۔ اس کے حصول کے لئے نہ جانے کتنی چپلیں گھس گئیں، نہ جانے کتنی راتوں کا لہو صرف ہو گیا اور نہ جانے کتنے قلم ٹوٹ گئے۔ سچ ہے اگر ذہانت کو عمل سے جوڑ دیا جائے تو منزل نیا ہو دور نہیں رہتی۔

"کشتی کو کھینے کا قرینہ سب کو کہاں آوے ہے"

(مت کمل کیں جانو)

دیواروں کے بیچ کھڑا ندآفاضلی

رتن سنگھ

وہ تو کہیے کہ اللہ میاں کا ایک گن یہ بھی ہے کہ اُسے غصہ نہیں آتا لیکن اگر غصہ آتا ہوتا تو یہ شخص جس کا نام ندآفاضلی ہے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ندآفاضلی کی پیدائش کا اس کہانی سے تعلق کچھ اس طرح ہے کہ اللہ میاں نے اپنی ساری کائنات اور مخلوق پیدا کرنے کے بعد جس ایک آدمی کو پہلے پہل اس کے دیدار کرائے تھے اُس نے سب دیکھنے کے بعد کہا "بس" اور یہ بس کچھ اس طرح کہا تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا طنز نگار بھی کیا کہے گا۔ ندآفاضلی کے وجود میں داخل ہونے تک ہمارے عہد کے ہر موڑ پر کھڑا وہ مسکرا رہا ہے اور کہہ رہا ہے "بس بس اتنا ہی بس یہی کچھ؟"

کسی چیز سے مطمئن نہ ہونے کی ضد نے ہی ندآفاضلی کو آج تک زندہ رکھا ہے ورنہ حضور یہ تو کب کا مر کھپ چکا ہوتا۔ یہ تو پیدا ہونے سے پہلے ہی اس وقت مر جاتا جب پورے دنوں پر اس کی ماں اسے اپنی کوکھ میں چھپائے دھنستی ہوئی چھت کے ایک لوہے کے سریے کو پکڑے زمین و آسمان کے درمیان معلق تھی۔ یہ اُس وقت بھی نہ مرا جب دہلی کے بے سروسامانی کے دنوں میں اس کی وہی کیفیت تھی جس کا اظہار غالب نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ۔

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ندآ تو ایسا سخت جان نکلا کہ بمبئی کی تنگ کھولیوں میں بھی اس کا دم نہ گھٹا اور اس کا جینے کا حوصلہ نہ صرف برقرار رہا بلکہ اُن کھولیوں کے اندھیروں میں یہ اپنے چہرے پر مسکراہٹوں کے چراغ لئے رہا تا کہ کچھ تو روشنی ہو، راہ رو کے لئے۔ اور یہ اندھیری راہیں آسانی سے روشن نہیں ہوئیں۔ پاکستان جانے سے پہلے جب سارے گھر والوں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود ندا اپنی ضد پر اڑ گیا کہ وہ ہندوستان میں ہی رہے گا تو سارے خاندان کے چلے جانے کے بعد ندآ کی آنکھوں کے سامنے ایک بار تو چار سُو اندھیرا چھا گیا تھا۔ یوں اس کے پہلے کی زندگی بھی کوئی ایسی روشن نہیں تھی۔ والد خوبصورت بیوی اور بچوں کے باپ ہوتے ہوئے بھی سندھیا دھاری کسی حسینہ کی زلف کے اسیر تھے تو وہ حسینہ بھی اپنے عاشق کے بچوں کو ٹوٹ کر پیار کرتی ہے انہیں جیب خرچ کے لئے پیسے دیتی ہے لیکن بچوں کو وہ پسند نہیں۔ ایسے ماحول میں بچوں کی ذہنی کیفیت پر جو اثر پڑنا تھا پڑا۔ شاید اسی لئے ندآ تیس سال پہلے مرچکی دادی کی قبر سے گم صم چمٹا ہے اور کسی بھی قیمت پر قبر چھوڑنے پر راضی نہیں۔ شاید وہ خاموش زبان میں اس سے اپنے والد کی شکایت کرنا چاہتا ہو کون جانے؟

پھر ملک کی تقسیم کے وقت پاکستان جائے نہ جائے ہی ندآ کو اپنے خاندان کے ساتھ شرنارتھی بننا پڑتا ہے۔ پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کے ساتھ ہی جب گوالیار کی فضاؤں میں فسادات کا زہر گھلتا ہے تو ان کا پریوار بھوپال کے قریب سیراگڑھ منتقل ہو جاتا ہے لیکن تنہا ندآ گوالیار نہیں تو وہاں کے کچھ حصے کو ساتھ ضرور اٹھا لاتا ہے۔ سیراگڑھ میں ان کے کوارٹر کے سامنے ایک درخت ہے جو ندآ کو گوالیار کے مکان کے پیچھے والے پیڑ جیسا لگتا ہے۔ وہ سوچتا ہے جیسے یہ درخت بھی اس کی طرح اپنی جگہ سے اکھڑ کے یہاں آگیا ہے۔ بڑی بہن کہتی ہے "پاگل وہ پیڑ یہاں کیوں آنے لگا۔ پیڑوں میں ہندو مسلمان تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو ایک شہر چھوڑ کر دوسرے میں پناہ گزین ہوں۔" یہ منطق ندآ کی سمجھ میں نہیں آئی اور اس ناسمجھی نے اسے اس پیڑ کے قریب کر دیا۔

اپنے ماحول کے ساتھ یہی وابستگی ندآ کا اصلی سرمایہ ہے۔ اس کی اصلی طاقت اسی لئے جب وہ سیراگڑھ سے منتقل ہو کر بھوپال میں مقابلتاً بہتر مکان میں آتے ہیں تو بھی وہ خود کو مطمئن نہیں پاتا۔ وہاں کی مٹی میں نہ مانوس خوشبو ہے اور نہ پتھروں اور اردگرد کے درختوں سے شناسائیاں ہیں۔ ستارے، ہوائیں، پرندے، دیواریں، چھتیں سب کی سب اسے کاغذ پر کھنچی تصویروں سے لگتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی ایسا نہیں جو گوالیار کے کشادہ کمروں والے گھر اور اس کے سامنے لگے املی کے پیڑ اور مکان کے پیچھے والی تنگ سی گلی اور اس پرانے کنویں کی جگہ لے سکیں۔ جو محلے کی ساری لڑکیوں کا ہمراز ہے۔ ندآ تو بمبئی کی مرطوب آب و ہوا میں نیم اور املی کی چھاؤں تلاش کرتا رہتا ہے اس لئے اُسے نت نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ندآ کا اداس رہنا لازمی ہے لیکن ندآ کی ذات کا ایک گن یہ بھی ہے کہ وہ پانی کی طرح ہر برتن کے مطابق خود کو ڈھال لیتا ہے اور اگر اداس بھی رہتا ہے تو ندی میں بہتے ہوئے پانی کے بہاؤ کی طرح جس میں میلا میلا تلچھٹ تہہ پر جا کر جم جاتا ہے اور اوپر سے پانی صاف شفاف ہو کر بہتا رہتا ہے۔

ندآ کی اداسی بھی اسی طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی رہتی ہے اور اوپر سے اس کا چہرہ ایسے گلاب کی طرح کھلا رہتا ہے جیسے ساری خوشبوئیں صرف خوشبوئیں ہی اس کی زندگی کا حصہ ہوں لیکن اس

طرح جینا ایک مشکل کام ہے۔ ان کے دکھوں پر انسان دوسروں کو دکھانے کے لئے مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھ تو لیتا ہے لیکن انسان کے درون میں بھی ایسی روانی ہوتی ہے کہ کبھی تو وہ عام انسان کی آنکھوں سے آنسو بن کر چھلک پڑتا ہے اور کبھی دل کے پھپھولوں میں ٹیس اٹھتی ہے تو اس کی روح تک کانپ جاتی ہے۔ ندا کے ہاں بھی یہ سب کچھ ہوتا ہوگا لیکن یہ سارے کام ندا نے بڑی چالاکی سے مقتدا حسن کو سونپ رکھے ہیں جو ندا کا اصلی ہمراز ہے۔ وہ اکیلے میں رونا بھی ہے اور غم کی شدت کی تاب نہ لاکر آہیں بھی بھرتا ہے۔ رہی ندا کی بات تو یہ مسکراتا رہتا ہے اور اگر کبھی رونا بھی پڑ جائے تو یہ خود نہیں روتا اس کا قلم روتا ہے۔ یہ تو رہا ندا بحیثیت ایک شخص کے۔ اب قلم کا ذکر آیا ہے تو اس کے قلم کے جوہر دیکھنے کے لئے "دیواروں کے بیچ" کے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

"مذہب کو جمعہ کی نماز تک محدود کر کے اپنے دوسرے ہم پیشہ لوگوں کے مقابلے میں انہوں نے اپنے آپ کو زیادہ آزادی دے رکھی ہے"

"راجستھان، مدھیہ پردیش، یوپی کے اضلاع کی غریبی جس حساب سے بمبئی میں امیری کی کھوج میں آرہی ہے اسی اعتبار سے بمبئی کی شکل و شباہت بدلتی جارہی ہے۔ چلنے والی فٹ پاتھوں پر رہنے بسنے والی جھونپڑیاں تنتی جا رہی ہیں۔ بمبئی چاروں طرف پھیلی بھی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے چھوٹی ہو رہی ہے۔ چوریاں قتل اور لوٹ مار کی وارداتوں میں بھی ترقی کی رفتار نے عدالتوں اور پولیس تھانوں کو پہلے سے زیادہ مصروف کر دیا ہے"

"کتوں میں بھی سیاسی جماعت جیسا اتحاد ہوتا ہے آپس میں یہ سدا ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں لیکن جب کوئی ان کی سرحد کو پار کرتا ہے تو یہ سب متحد ہو کر مورچہ سنبھال لیتے ہیں۔"

"وشنو ماتا، اجمیر کے خواجہ، شرڈی کے سائیں بابا کی مارکیٹ دوسرے دیوی دیتاؤں سے زیادہ ہے"

"گھر میں گھر کے رقبے کی تقسیم کی طرح مرتضیٰ حسن بھی تین ٹکڑوں میں منقسم ہیں۔ ایک جگہ سے صبح کا ناشتہ آتا ہے، دوسری طرف سے دوپہر کا کھانا آتا ہے، رات کی ذمہ داری تیسرے گھر کی ہے"

ان اقتباسات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ندا اپنے ہاتھ میں قلم کی تلوار لئے اپنے دور کے اندھیروں سے سینہ سپر ہیں۔ کہیں وہ مذہب کے سلسلے میں کسی کے دکھاوے کے پرخچے اڑا رہا ہے تو کہیں عدالتوں اور پولیس کی موجودگی میں بڑھتی ہوئی غنڈہ گردی پر طنز کر رہا ہے۔ اس کے قلم کی زد سے وہ سیاسی پارٹیاں بھی نہیں بچیں جن کو آپس کی لڑائیوں سے طاقت کی بھوک سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ عوام کی بہبود کی بات سوچ سکیں۔ اسی لئے آج کے دور کی ادبی زندگی ہو یا سماجی، سیاسی ہو یا مذہبی، ندا عوام کے ساتھ خود کو ایسی دیواروں کے بیچ گھرا پاتا ہے، جن کے حصار سے انسان باہر نکل آئے تو اسے آزادی کی کھلی فضاؤں میں سانس لینے کا موقع میسر ہو۔ رہی ندا فاضلی کی بات تو جب بھی اسے شدت سے ان دیواروں کے بیچ گھرے ہونے کا خیال آتا ہے تو اس سے نجات پانے کے لئے وہ لکھتا ہے تاکہ غم دل، غم دوراں بن کر کاغذ پر اس طرح منتقل ہو جائے کہ ان کی تحریر اندھیروں سے لڑتی سی دکھائی دے۔ والد کی موت پر جب یہ کراچی میں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں تو کہتے ہیں۔

"میری بیماریوں میں تم
میری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا"

اپنے والد کے لئے جس جذباتی رشتے کا اظہار ندا کی ان سطروں میں ہوتا ہے وہ نثر نگار کے ساتھ ساتھ اس کے اچھے شاعر ہی نہیں اچھا انسان ہونے کی بھی غمازی کرتا ہے۔

ڈالیوں پہ پھول

جناب ندا فاضلی کے کلام سے مختصر انتخاب
عبدالاحد ساز

خدا خاموش ہے

بہت سے کام ہیں
لپٹی ہوئی دھرتی کو پھیلا دیں
درختوں کو اُگائیں
ڈالیوں پہ پھول مہکا دیں
پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں
چاند لٹکائیں
خلاؤں کے سروں پہ
نیلگوں آکاش پھیلائیں
ستاروں کو کریں روشن
ہواؤں کو گتی دے دیں
پھدکتے پتھروں کو پنکھ دے کر نغمگی دے دیں
لبوں کو مسکراہٹ
انکھڑیوں کو روشنی دے دیں
سڑک پہ ڈولتی پرچھائیوں کو
زندگی دے دیں

خدا خاموش ہے!
تم آؤ تو تخلیق ہو یہ دُنیا
میں اِتنے سارے کاموں کو اکیلا کر نہیں سکتا

O

بمبئی

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا

فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سُلگ رہی ہیں فضاؤں میں اَن گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوئے کولھے' پنڈلیاں' آنکھیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا

یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے
اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو' گالوں کو' ہنستے ہونٹوں کو
سروں کو خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرے اُٹھتے ہی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں
عجیب بستی ہے
اس میں نہ دن' نہ رات' نہ شام
بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلتی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے

یاں تو کچھ بھی نہیں ریل اور بسوں کے سوا
زمیں پہ رینگتے بے حس سمندروں کے سوا
عمارتوں کو نگلتی عمارتوں کے سوا
یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے اُلجھو گے' ٹوٹ جاؤ گے!

O

والد کی وفات پر

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اُڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے ہل کے ٹوٹا تھا
مری آنکھیں
تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ.....وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دُنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ
میری اُنگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لئے
جب بھی قلم' کاغذ اُٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں
بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے
وہ تمہاری
لغزشوں' ناکامیوں کے ساتھ بہتا ہے
مری آواز میں چھپ کر
تمہارا ذہن رہتا ہے
مری بیماریوں میں تم
مری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں مَیں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فُرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

O

جنگ

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد
جنگ!
بے گھر بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کے
ذرّہ ذرّہ
پھیلتی ہے
تیل
گھی آٹا
کھنکتی چوڑیوں کا رُوپ بھر کے
بستی بستی ڈولتی ہے
دن دہاڑے
ہر گلی کوچے میں گھُس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ!
گھر گھر بولتی ہے
سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

☆

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

خودکشی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی سب میں
اور کچھ دِن ابھی اوروں کو ستایا جائے

کیا ہوا شہر کو' کچھ بھی تو دِکھائی دے کہیں
یوں کیا جائے کبھی خود کو رُلایا جائے

گھر سے مسجد ہے بہت دُور' چلو یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

جن چراغوں کو ہواؤں کا کوئی خوف نہیں
اُن چراغوں کو ہواؤں سے بچایا جائے

باغ میں جانے کے آداب ہوا کرتے ہیں
کسی تتلی کو نہ پھولوں سے اُڑایا جائے

○

☆

دُنیا جسے کہتے ہیں' جادُو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے' کھو جائے تو سونا ہے

اچھا سا کوئی موسم' تنہا سا کوئی عالم
ہر وقت کا رونا تو بے کار کا رونا ہے

برسات کا بادل تو دیوانہ ہے کیا جانے
کس راہ سے بچنا ہے' کس چھت کو بھگونا ہے

یہ وقت جو تیرا ہے' یہ وقت جو میرا ہے
ہر گام پہ پہرہ ہے' پھر بھی اسے کھونا ہے

غم ہو کہ خوشی دونوں' کچھ دیر کے ساتھی ہیں
پھر رستہ ہی رستہ ہے' ہنسنا ہے نہ رونا ہے

آوارہ مزاجی نے پھیلا دیا آنگن کو
آکاش کی چادر ہے' دھرتی کا بچھونا ہے

○

بات کم کیجئے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے یہ دوست بناتے رہیے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

یہ تو چہرے کا فقط عکس ہے تصویر نہیں
اس پہ کچھ رنگ ابھی اور چڑھاتے رہیے

غم ہے آوارہ اکیلے میں بھٹک جاتا ہے
جس جگہ رہیے وہاں ملتے ملاتے رہیے

جانے کب چاند بکھر جائے گھنے جنگل میں
گھر کی چوکھٹ پہ کوئی دیپ جلاتے رہیے

☆

دن سلیقے سے اُگا رات ٹھکانے سے رہی
دوستی اپنی بھی کچھ روز زمانے سے رہی

چند لمحوں کو ہی بنتی ہیں مصور آنکھیں
زندگی روز تو تصویر بنانے سے رہی

اس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اُجالا دے گی
رات جنگل میں کوئی شمع جلانے سے رہی

فاصلہ چاند بنا دیتا ہے ہر پتھر کو
دُور کی روشنی نزدیک تو آنے سے رہی

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں اُمید ہو اِس کی وہاں نہیں ملتا

کہاں چراغ جلائیں کہاں گلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں لیکن مکاں نہیں ملتا

یہ کیا عذاب ہے سب اپنے آپ میں گم ہیں
زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا

چراغ جلتے ہی بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشاں نہیں ملتا

☆

گرج برس پیاسی دھرتی پر پھر پانی دے مولا
چڑیوں کو دانے بچوں کو گُڑ دھانی دے مولا

دو اور دو کا جوڑ ہمیشہ چار کہاں ہوتا ہے
سوچ سمجھ والوں کو تھوڑی نادانی دے مولا

پھر روشن کر زہر کا پیالہ چمکا نئی صلیبیں!
جھوٹوں کی دُنیا میں سچ کو تابانی دے مولا

پھر مورت سے باہر آ کر چاروں اُور بکھر جا
پھر مندر کو کوئی میرا دیوانی دے مولا

تیرے ہوتے کوئی کسی کی جان کا دشمن کیوں ہو
جینے والوں کو مرنے کی آسانی دے مولا

رات کے بعد نئے دن کی سحر آئے گی
تیرگی چھوڑ بھی دے روشنی کھا جائے گی
ہنستے ہنستے کبھی تھک جاؤ تو چھپ کے رولو!
یہ ہنسی بھیگ کے کچھ اور چمک جائے گی
جگمگاتی ہوئی سڑکوں پہ اکیلے نہ پھرو
شام آئے گی کسی موڑ پہ ڈس جائے گی
اور کچھ دیر یوں ہی جنگ، سیاست، مذہب
اور تھک جاؤ، ابھی نیند کہاں آئے گی
میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی
وقت ندیوں کو اُچھالے کہ اُڑائے پربت
عمر کا کام گذرنا ہے گذر جائے گی

ماہیے

پاگل ہے عراقی ہے
مردہ ہے نہ زندہ
یہ بچہ عراقی ہے

بے نام سا مرقد ہے
مٹی ہوئی مٹی
اب جنگ نہ سرحد ہے

چھجے پہ کبوتر ہے
دھوپ میں ہے قاصد
حجرے میں قلندر ہے

تالے میں لگی چابی
بھیا کی تھالی میں
گڑ رکھنے لگی بھابھی

سُر بنسی کا لہرایا
رادھا کی گاگر میں
پھر چاند اتر آیا

فیصلہ

(کرغزستانی کی بچی اور امریکن پائلٹ کی بے وقت موت کی نذر)

نہیں ایسا نہیں ہوگا

پہاڑوں میں رہو
یا گھر کی دیواریں اُٹھاؤ تم
کسی بھی پیڑ کی چھانو تلے
دھونی رماؤ تم
کہیں بھی چھپ کے جاؤ تم
ہمارے ساتھ ہو تم
تمہارے ساتھ ہیں ہم
تمہارے جسم میں جب تک لہو ہے
اور لہو میں زندگی کی آگ روشن ہے
ہمارا اور تمہارا
ایک ہی مٹی کا بندھن ہے
یہ ساری زندگی
دھرتی پہ آدم کے اُترنے سے
ابھی تک.....اِک لڑائی ہے
مسلسل اِک لڑائی
جس میں اوروں کی طرح تم خود بھی شامل ہو
لڑائی.....رَاکھشش بھی، دیوتا بھی
لڑائی.....بولہب بھی، مصطفےٰ بھی
لڑائی.....خودکشی بھی کربلا بھی
لڑائی سے مفر ممکن نہیں چاہے کہیں جاؤ
مگر کیسے لڑو
یہ فیصلہ خود تم کو کرنا ہے
کسی آکاش سے
بارود کی صورت بکھر جاؤ
اندھیری رات میں
یا
لیبیا میں جل کے مر جاؤ

دوہے

چڑیا نے اُڑ کر کہا' میرا ہے آکاش
بولا شکھرا ڈال سے' یوں ہی ہوتا کاش

لے کے تن کے ماپ کو' گھومے بستی' گاؤں
ہر چادر کے گھیر سے باہر نکلے پاؤں

چاقو کاٹے بانس کو' بنسی کھولے بھید
اتنے ہی سُر جانیے' جتنے اس میں چھید

سودا لینے ہاٹ میں' کیسے جائے نار
چاقو لے کے ہاتھ میں' بیٹھا ہے بازار

سب کی پوجا ایک سی' الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی' کویل گائے گیت

اچھی سنگت بیٹھ کر سنگی بدلے رُوپ
جیسے مل کر آم سے میٹھی ہو گئی دُھوپ

سیدھا سادہ ڈاکیہ' جادُو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے' آنسو اور مسکان

ساتوں دِن بھگوان کے' کیا منگل کیا پیر
جس دِن سوئے دیر تک' بھوکا رہے فقیر

وہ صُوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر' اتنا ہی سچ مان

سیتا' راون' رام کا' کریں وبھاجن لوگ
ایک ہی تَن میں دیکھیے' تینوں کا سنجوگ

بچہ بولا دیکھ کر مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو' اتنا بڑا مکان

جادُو' ٹونا روز کا' بچوں کا بیوپار
چھوٹی سی اِک گیند میں بھر دیں سب سنسار

اندر مُورت پر چڑھے گھی' پوری' لوبان
مندر کے باہر کھڑا' ایشور مانگے دان

پنچھی' بالک' پھول' جل' الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی' سارے رشتے دار

سپنا جھرنا نیند کا: جاگی آنکھیں پیاس
پایا' کھویا' کھوجنا' سانسوں کا اتہاس

بوڑھا پیپل گھاٹ کا' بتیائے دِن رات
جو بھی گذرے پاس سے' سر پر رکھ دے ہاتھ

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دُکھ نے دُکھ سے بات کی' بن چٹھی بن تار

بنیں چڑیاں دُھوپ کی' دُور گگن سے آئیں
ہر آنگن مہمان سی پکڑو تو اُڑ جائیں

دُور سمندر پار سے کوئی کرے بیوپار
پہلے بھیجے سرحدیں' پھر بھیجے ہتھیار

ایک قومی رہنما کے نام

مجھے معلوم ہے
تمہارے نام سے منسوب ہیں
ٹوٹے ہوئے سُورج
شکستہ چاند
کالا آسماں
کرفیوزدہ راہیں
سُلگتے کھیل کے میدان
روتی، چیختی مائیں
مجھے معلوم ہے
چاروں طرف
جو یہ تباہی ہے
حکومت میں
سیاست کے تماشے کی گواہی ہے
تمہیں!
ہندو کی چاہت ہے
نہ مسلم سے عداوت ہے
تمہارا دھرم!
صدیوں سے تجارت تھا
تجارت ہے
مجھے معلوم ہے لیکن
تمہیں!
مجرم کہوں کیسے
عدالت میں
تمہارے جُرم کو ثابت کروں کیسے
تمہاری جیب میں خنجر
نہ ہاتھوں میں
کوئی بم تھا
تمہارے رَتھ پہ تو
مریادا پُرشوتم کا پرچم تھا

گیت

(مدر ٹریسا کے لئے)

ہر دھوپ میں چھاؤں سی
ہر سر پہ دعاؤں سی
روتی ہوئی آنکھوں کی
تحریر جو پڑھتی تھی
انسان کی خاطر جو
بھگوان سے لڑتی تھی
وہ پیاسی زمینوں پر
اتری تھی گھٹاؤں سے

بیماروں کے بستر پر
سوتا تھا خدا اس کا
لاچاروں کے چہروں سے
روتا تھا خدا اس کا
روشن تھی اندھیروں میں
وہ ماں کی دعاؤں سی
وہ پیاس کے مندر میں
برسات کی مورت تھی
وہ بھوک کی مسجد میں
روٹی کی عبادت میں
وہ درد کے گرجا میں
انسان کی خدمت تھی
نفرت کی جفاؤں میں
رحمت کی وفاؤں سے

ہر سر پہ......

O

روحِ روشن

ندا فاضلی (نظموں کے تراجم)

پرتگال کا نام عالمی ادب کے منظر نامے میں اُس وقت اُجاگر ہوا جب پرتگال کے ایک ادیب سراماگو کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ عام شہرت ہو تو پڑھنے لکھنے والے اِس کے ادب سے تھوڑے بہت باخبر ہوئے۔ اِس عالمی شہرت سے پہلے لوگوں کے علم میں گوشت اور ہڈی کا تعلق ہندوستان کی ایک ریاست گوا میں بسنے والے گرجا گھروں کا فنی تعمیر تھا۔ ہماری معلومات میڈیا کی محتاج ہو چکی ہیں۔ ہماری لاعلمی اس کا ثبوت ہے اسی لاعلمی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلمان رشدی نے فادر دستوری ناولوں کے دیس بھارت کے مجموعی ادب کو صرف ایک نام سعادت حسن منٹو سے پہچانے کی بھول کی تھی۔ انہیں نہ قرۃ العین حیدر نظر آئیں، نہ شیو کمار بلی دکھائی دیے، نہ میلا آنچل والے رینو اور تریاقی یا قدر ملک کے میڈیا نے دنیا کے بہت سے ملکوں کی طرح پرتگال کی ادبی تاریخ کو بھی سراماگو کے میڈیائی تعارف سے قبل ہماری نظروں سے اوجھل رکھا۔ اسی گمشدہ تاریخ کا ایک اہم نام فرنانڈو پیسوا بھی ہے۔ مشہور ناقد اور مترجم رچرڈ زینتھ نے جب پیسوا کی نظموں کا ترجمہ انگریزی میں کتابی روپ میں شائع کیا تو اُس کی شاعری کے بارے میں یوں رائے دی گئی۔

"پیسوا کی شاعری میں بیسویں صدی کی رُوح روشن ہے"

(بک لسٹ)

"پیسوا کی تخیلی و فکری وسعت کا احاطہ ناممکن ہے" (نیوز ڈے)

"پیسوا کی شاعری زندگی کی حرارتوں سے رلکے اور والٹ وٹمن کی طرح تابناک ہے" (نیویارک ٹائمز)

"پکاسو کی طرح پیسوا کا تخلیقی ذہن بھی مختلف اسالیب کا فنکار ہے اُس کی شعری تخلیقات پرتگالی ادب میں جدیدیت کا ابتدائی تعارف ہیں۔ ان کے ساتھ ہی پرتگال کی شعری تاریخ نئی سمتوں پر گامزن ہوئی ہے" (رچرڈ زینتھ)

فرنانڈو پیسوا ۱۳ جون ۱۸۸۸ء میں لسبن میں پیدا ہوا اور ۴۷ سال کی عمر میں اپنے ہی ذہنی و شخصی انتشار کا شکار ہو کر ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گیا۔ اُس کی کم عمر موت کی وجہ شراب کی بلا نوشی بتائی جاتی ہے۔ پانچ سال کی عمر میں باپ سے محروم ہو گیا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی۔ پیسوا کی ابتدائی زندگی جنوبی افریقہ میں ڈربن میں گزری جہاں اُس کے سوتیلے والد پرتگال کے سفارت خانے میں کونسلر تھے۔ اپنے بچپن کے بارے میں اُس نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"میں اپنے بچپن کو آنسوؤں کی طرح یاد کرتا ہوں۔ ان آنسوؤں کی سوز و گداز ہی میری تحریر کی تعبیر میں شامل ہے"

پیسوا ایک ساتھ شاعر، ناقد، مترجم اور نثر نگار تھا۔ وہ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ اپنی مادری زبان پرتگیزی کے علاوہ اُس کے اظہار کے ذرائع انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بھی رہی ہیں۔ اُس کا تخلیقی ذہن بلا کا زرخیز تھا۔ وہ بیک وقت کئی ناموں سے کئی اسالیب میں لکھتا تھا۔ اُس کے تخلیق کردہ ان ہم زادوں میں البرٹو ریکارڈو اور الوارو زیادہ مشہور ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا اِس کے بارے میں محققین صرف اتنا کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں یہ ایک قسم کا ادبی فیشن تھا۔ اِس دلیل کی وضاحت میں وہ کئی جانے پہچانے ادیبوں اور شاعروں کا نام لیتے ہیں۔ جیسے ایزرا پاؤنڈ 'ماسک' کے نام سے بھی لکھتا تھا۔ رلکے نے "مالٹے لاریڈز" سے بھی کام لیا۔ ییٹس نے اپنے ہم زاد کو میسے کا نام دیا تھا۔ مگر پیسوا نے اِس کھیل کو جس طرح ایک منظم کاروبار کی مانند پھیلایا، اُس کی دوسری مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ اُس کے یہ ہم زاد نہ صرف نام اور کردار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی فکری اور اسلوبی شناخت بھی نمایاں ہے۔ فرنانڈو پیسوا نے اُن کو اپنی منقسم شخصیت کے متضاد رویوں کا علامتی روپ دیا ہے۔ زینتھ نے اُس کے بارے میں صحیح لکھا ہے۔

"وہ کائنات میں ایک ایسے سونے علاقے کی مانند ہے جہاں کئی راہیں ایک دوسرے سے ملتی نظر آتی ہیں۔"

پیسوا نے اِس عمل کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

"شیکسپیئر نے ایک ہیملٹ تخلیق کیا تھا میں نے بہت سے ہیملٹ گھڑے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے کردار کسی ڈرامے کا حصہ نہیں ہیں۔ اُن کا اسٹیج میری شخصیت ہے، اُن کی اداکاریاں میری فکری جہات ہیں۔"

پیسوا کی شعری و نثری تخلیقات ان تین ناموں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ابھی تک کی تلاش کے مطابق ۷۲ دوسرے ناموں سے بھی منسوب ہیں۔

پیسوا کی شاعری اُس کی متضاد شخصیت کا واضح اظہار ہے۔ اُس کے کئی چہرے ہیں، کئی جہات و ترجیحات ہیں۔ وہ کہیں طفل نظر آتا ہے، کہیں صوفی کی طرح خدا کی ہم گیریت گاتا ہے، کہیں ناستک کی طرح عقیدوں سے انکار کرتا ہے، کہیں فطرت میں وہ حیرت و استعجاب کو آشکار کرتا ہے۔ اُس کی شاعری زندگی کی غیر مشروط ترجمان ہے۔ اُس کا شعری دائرہ کئی موسموں کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے۔ اُس کی بے پناہ پیچیدہ ذہنی استعارہ سازی اور بلند پروازی نے اُس کی شاعری کو ادبی دنیا کا شاہکار بنا دیا ہے۔ پیسوا اپنے دور میں اپنے لئے اور بعد میں ناقدین کے لئے بیسویں صدی کی ادبی تہذیب کا ایک ایسا معمہ تھا اور ہے جو ابھی تک پورے طور پر حل ہونا باقی ہے۔

بے شمار زندگیوں کا مجموعہ
میری زندگی ہے
پھر بھی جب میں سوچتا ہوں
تو کون مجھ میں سوچتا ہے
جب میں کچھ محسوس کرتا ہوں
تو کون مجھ میں جھانکتا ہے
میں کیا ایک مقام ہوں
جہاں اشیاء خیالوں میں ڈھلتی ہیں
جہاں فکریں
نئے نئے روپ بدلتی ہیں
میرے علاوہ ایک بھی
بہت سی روحیں ہیں
میرا تن ایک ہے
لیکن اس کی کئی شکلیں ہیں
کئی نہیں ہیں
اُن مختلف روحوں کی بھیڑ میں
میں کہاں ہوں
لیکن میں جہاں ہوں
اپنے ہی ساتھ ہوں
اپنا قلم ہوں
اپنی بات ہوں

دو

چلو نکلو یہاں!
سڑک کے کنارے کی طرف
جو ہوا بہتی ہے
وہ تم سے کیا کہتی ہے؟
وہ کہتی ہے
ہوا تو ہوا ہوتی ہے
ہوا کا کام بہنا ہے
کل ہو یا آج ہو
اُسے تو ہمیشہ یوں ہی بہنا ہے
تم بتاؤ تم سے یہ کیا کہتی ہے؟
مجھ سے تو یہ بہت باتیں کرتی ہے
گزرے جہانوں کی
پرانے زمانوں کی
جو کبھی نہیں تھیں
ان داستانوں کی
لگتا ہے تم نے ہوا کو کبھی نہیں سنا!!
ہوا ہوا ہوتی ہے
وہ جب بھی سرسراتی ہے
خود ہی بولتی ہے
خود ہی کو سناتی ہے
تم نے جو سنا ہے
وہ تمہارا خیال ہے
تمہارے اندر چھپے
جھوٹ کا کمال ہے

تین

قسمت کے لکھے کو اپناؤ
پودوں کو پانی پلاؤ
کلیوں کے ساتھ مسکراؤ
باقی سب کچھ بلا ہے
اَن دیکھے درختوں کی چھایا ہے
حقائق ہمارے خوابوں سے
بکھر اکثر ہوتے ہیں
صرف ہم ہی
اپنے رہبر ہوتے ہیں
تنہائی کو بساؤ
ہر دکھ کو اس کی دین سمجھ کر
شکر بجا لاؤ
زندگی کو فاصلے سے دیکھو
اُس کے قریب نہیں جاؤ
کیا ہے؟
کیوں ہے؟
اپنے سوالوں سے خود کو بچاؤ
ہوس کو دل میں چھپاؤ
اسی کی طرح وقت بتاؤ
دیا اس لئے دیا ہوتے ہیں
کیونکہ وہ اپنے بارے میں
کبھی سوچتے نہیں

چار

دیا خوش ہے
وہ درختوں کی جڑوں کی طرح
خاموش اور پرسکون ہیں
تقدیر انہیں کہاں ستاتی ہے؟
اور جب کبھی ستاتی ہے
تو اس کے بدلے میں
انہیں امر بناتی ہے
دیا کسی پرچھائیں سے ڈرتے ہیں
نہ خطروں سے گزرتے ہیں
کیونکہ وہ بےخبر موجود ہوتے ہیں
اور وجود کے بغیر
موجود ہوتے ہیں

پانچ

تمہارے ہونٹوں پر
تنہائی کی یہ مسکراہٹ
تمہارے بالوں میں
نئے سورج کی یہ جگمگاہٹ
ایسا کیوں ہو
خوشی کے وقت
ہم خوشی سے
بےخبر کیوں ہوتے ہیں؟

چھ

میں ہری گھاس پر لیٹا ہوا
وہ سب کچھ بھولنا چاہتا ہوں
جو مجھے پڑھایا گیا تھا
میرے ذہن میں جو بسایا گیا تھا
وہ میرے شب و روز میں نہیں جگمگایا
جو مجھے دکھایا گیا تھا
وہ مجھے کہاں نظر آیا
مجھے جو خوب سمجھایا گیا تھا
ویسا میں نہیں بن پایا
لفظوں کی دُنیا
لفظوں تک محدود ہے
لیکن حقیقت!
جیسی پہلے تھی
ویسی اب بھی موجود ہے

سات

تمام محبت نامے
مختصر ہوتے ہیں
وہ مختصر نہیں ہوتے
تو محبت نامے کیوں ہوتے؟
اپنے زمانے میں
میں نے بھی محبت نامے لکھے تھے
اسی طرح
بے معنی اور مختصر
محبت ناموں میں
محبت ہوتی ہے
اس لئے وہ بھی
سحر ہی سے بھرے ہوں گے
لیکن جنہوں نے کبھی
محبت نامے نہیں لکھے
وہ بھی ضرور سحر سے ہوں گے
کاش! میں پھر سے
اس ماضی میں لوٹ سکوں
جب میں محبت نامے لکھتا تھا
بیچارے بے خبر
کہ ایسی تحریریں مختصر ہوتی ہیں

O

ندا صاحب ہمارے عہد کے ان ممتاز شاعروں میں سے ہیں جن کی تخلیقات نے بعد کی نسل کو بے حد متاثر و متوجہ کیا ہے۔ ان کی شاعری سے اردو میں ایک نیا شعری محاورہ وجود میں آیا ہے۔ انہوں نے خسرو، میر، اکبر، نظیر، سورداس، تلسی وغیرہ کی لسانی روایت سے رشتہ جوڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ندا صاحب نے اس روایت کی نہ صرف بازیافت کی ہے بلکہ اس میں موجودہ عہد کی لسانی ذہانت کو جوڑ کے اردو کے شعری اور نثری ادب میں نئے امکانات کا اضافہ کیا ہے۔ (وقار قادری)

ندا فاضلی اس دور کے ممتاز شاعر ہیں۔ شاعری کی طرح ان کی نثر بھی بڑی دلکش، توانا اور موثر ہے۔ اپنی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" لکھ کر انہوں نے جو وقار و اعتبار حاصل کیا تھا، اس کا اثبات ان کی نئی کتاب "دیواروں کے باہر" میں کچھ اور زیادہ پُر خیال اور معنی خیز ہے۔ ندا فاضلی نے جس شخص کو جیسا پایا بغیر لاگ لپیٹ کے اسی طرح پیش کر دیا ہے۔ خود اپنی شخصیت کے بارے میں بھی انہوں نے کوئی رو رعایت نہ کرتے ہوئے کسی پہلو کو بھی نہیں چھپایا ہے۔ اس کتاب میں ندا فاضلی کا تنقیدی شعور بھی بڑا نکھرا، ستھرا اور کاٹ دار نظر آتا ہے۔ (نامی انصاری)

ندا فاضلی کا شمار ہمارے دور کے ان شاعروں میں ہوتا ہے، مگر اپنے ہم عصر شاعروں میں ان کا نام اس اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل ہے کہ وہ نہ صرف خوش فکر اور خوش فکر شاعر ہیں بلکہ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی کتاب "ملاقاتیں" منفرد اسلوب اور بے باک لہجے کے سبب اردو نثر کی تاریخ میں ایک اہم مقام و مرتبہ کی حامل کتاب ہے۔ (سلام بن رزاق)

بحیثیت شاعر ندا فاضلی کی الگ شناخت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ روایتی طور پر اردو کے بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ دانشور بھی ہیں۔ گہری سماجی و تہذیبی فکر بھی رکھتے ہیں اور انہیں بڑی جرأت سے شعری پیکر میں ڈھالتے رہتے ہیں۔
(پروفیسر علی ناظمی)

ندا فاضلی نے اب تک کیا لکھا، کیا پایا اس کا عکس ان کے تینوں شعری مجموعوں میں جھلمل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح پڑھنے والے کی تشنگی بھی ہو جاتی ہے کہ اپنے تاثرات و تجربات اور جذبات و خیالات کے اظہار کے لئے انہوں نے شاعری کو میڈیم کیوں بنایا۔ شاعروں کی اس بھیڑ میں انہوں نے اپنی الگ شناخت کیوں بنائی۔ اس کی کوئی شناخت ہے بھی یا نہیں۔ کیا ندا فاضلی کو چھپا ہوا گھر، بچھڑی ہوئی تاریخ و تہذیب، دوست احباب، رشتہ دار، ماں باپ، بہن بھائی مل گئے ہیں؟ اس کا پورا جواب ان کی شاعری میں ہمیں شاید ہی مل سکے کیونکہ ان کی شاعری تاثرات و تجربات کا زیادہ کرتی ہیں، اور مکمل نہیں۔ (مشتاق مومن)

ندا فاضلی جب عام اور بدحال لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تحریر میں ہمدردی جھلک پڑتی ہے۔ ندا کی تحریر ایماندار اور بے باک ہے۔ کتاب کا شاید ہی کوئی کردار ہو جس سے قاری پاؤں نہ جوڑ لے۔ ہر کردار کے نقش اور لہجے کے سہارے یادگار بن جاتا ہے۔ "دیواروں کے باہر" میں کا دور جس میں تبدیلی ہوتا، مذہب، قومی تقلید، فرقہ وارانہ، فرقہ پرستی، سیاست اور فلمی دنیا کا ذکر اس اعتدال طرح پیش ہوا ہے جو آنکھوں دیکھا اور خود پر بیتا معلوم ہوتا ہے۔ (اقبال رضوی)

ندا کی نظمیں، غزلیں، گیتوں میں فکری کینوس بہت پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں طرف کے نقوش زیادہ واضح اور روشن نظر آتے ہیں اور اس کے اشعار محض ہوتے ہوئے بھی غیر محض معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ندا کی شاعری میں لب و لہجہ سے اعجاز کا ایک خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ (بشر نواز)

ندا فاضلی نے غزل کی امکانات جو روایت کا حصہ بن چکی تھیں، ڈھونڈ نکالیں۔ اس لئے وہ اس منزل سے آسانی کے ساتھ گزرے۔ نوجوانی کی رنگینی، آوارہ مزاجی بدلتے ہوئے اور بے فکری کے ساتھ خالص ہندوستانی، انگریزی، فارسی تراکیب سے گریز، قصبات کی فضا اور گھریلو غم روحانی موضوعات نے زبان و بیان اور موضوعات کو دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف طرح پیش کیا ہے۔ بقول فضیل جعفری "ندا فاضلی اپنے پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد سے اہم شاعر تسلیم کر لئے گئے تھے" (انور خان)

ندا کی شاعری میں گھر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ غزلیں ہوں، نظمیں ہوں، گیت ہوں، ندا ہر جگہ ایک گھر جوڑتی ہوئی دیواروں، قریے کی چھت اور صحن سے عبارت نہ ہو بلکہ اس کے ہر زخم کی آنکھوں کی بولتی تصویریں، بہن کی شوخ چنچل، ماں کے پیار، کانوں میں چھنکتی چوڑیاں، مہندی کے بوٹوں اور شاخوں پر پھولوں کی طرح کھلتے ہوئے بچوں سے مزین ہے۔ (رفیعہ شبنم عابدی)

ایک صحافی کے طور پر ندا فاضلی کے خیالات جاننے کا موقع کئی بار ملا ہے۔ آج کے حالات میں شعرا اور ادبا کی ذمہ داریوں کی نسبت وہ فرماتے ہیں "پوری کائنات ایک خاندان ہے۔ چاند ستارے، درخت، حیوان، پرندے، انسان، سب ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں۔ یہ رشتے اب ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ اقدار پامال ہو گئی ہیں۔ مشین نے آدمی کو بے مزہ بنا دیا ہے۔ آج کے ادیب و شاعر کا فرض اولین ہے کہ وہ ان رشتوں کو جوڑے، جو رشتے ٹوٹ رہے ہیں انہیں ٹوٹنے سے بچائے۔"
(م۔ ناگ)

ندا صاحب سے کبھی کہا ہے کہ شاخوں میں کھلنے والے پھولوں کی گنتی مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے اور ان کی جگہ پلاسٹک کے رنگ برنگے پھولوں سے گھر سجائے جا رہے ہیں۔ تجارتی کلچر نے مذہب کو مقدس کتابوں سے نکال کر دکانوں کی اشیا میں ڈھال دیا ہے۔ رامائن کے رام اور گیتا کے کرشن ٹی وی سیریل میں اداکاری دکھا رہے ہیں۔ قرآنی آیات کے پاسبان خدا اور رسول کے ناموں سے اپنا بیوپار چلا رہے ہیں۔ ندا فاضلی نے اس المیے کو اپنے ناول "دیواروں کے باہر" میں اپنی گرفت میں بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہوئے بہت سارے ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے کر کے انہیں ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ندا کی نثر بار بار خطرے کے نشان کی طرف بڑھتی ہے مگر ان کا رویہ کے باعث ایسا نہیں کرتی۔ لہٰذا اگر میں یہ سوچتا ہوں کہ راجندر سنگھ بیدی کی نثر کا سفر ختم ہوا اور اب ندا فاضلی کی نثر کا سفر شروع ہو گیا ہے تو میرے خیال میں یہ تصور اتنا غلط بھی نہیں۔ (سلطان سبحانی)

ندا فاضلی میرے بے حد پسندیدہ شاعر ہیں اور اتنی ہی پسندیدہ مجھے ان کی شخصیت بھی لگتی ہے۔ پسندیدگی کی کشش ظاہری اور اخلاقی معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں جس کی ایک معنوی فن کار سے تعلق سے ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس ربطِ باہمی کے تحت ظاہر کر رہا ہوں جو ان کے شعری رویے اور شخصی مزاج کے مابین بڑے فطری انداز میں قائم ہے۔
(عبدالاحد ساز)

چکّر

جتیندر بلّو

مستی الگ سے چھائی ہوئی تھی اور خوشی کا عالم یہ تھا کہ نیند کے ساتھ میرا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ بار بار میری بند آنکھیں کھل کر میرا دل کرتی کہ بستر سے اُٹھ کر میں اُس ای میل (E-mail) کو پھر سے پڑھوں جو شام کو دلی سے آیا تھا اور جسے میں کئی بار پہلے بھی پڑھ چکا تھا لیکن دل تھا کہ وہ کسی بھی طور چین لینے کو تیار نہ تھا۔ بالآخر بستر سے چھلانگ لگا کر میں نے ای میل کا مضمون پھر سے پڑھا۔ عبارت مجھے قریب قریب یاد ہو چکی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا جملہ خود بخود ذہن میں ابھرتا چلا آیا اور میرے سوئے ہوئے ہونٹ لگاتار گنگنا رہے تھے۔

شاہ نومبر، دو ہزار دو۔

ڈیئر بل۔

میں لندن آ رہی ہوں۔ دسمبر کی اکیس یا بائیس کو وہاں پہنچ جاؤں گی ویزے کے واسطے پاسپورٹ داخل کروا دیا ہے لیکن اس بار ایک عقلمندی یہ بھی کی ہے کہ ملٹی پل ویزے (Multiple Visa) کی خاطر رقم بھر دی ہے۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ میرے پاؤں میں پیدائشی چکر ہے۔ وہ ایک مقام پر ٹِک کر نہیں رہ پاتے لہٰذا سے چار پانچ ماہ باہر رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ فون پر اطلاع کروں گی کہ میں کس ایئر لائنز اور کس فلائٹ سے آ رہی ہوں لیکن اس بار ایئرپورٹ پر تم وقت سے پہنچ جانا۔ پچھلی مرتبہ کی طرح انتظار مت کروانا۔ یہ کرسمس اور نیا سال میں لندن میں منانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ نئے سال کی شام میں ٹرافلگر اسکوائر کا وہ نظارہ میں بھلائے نہیں بھلتی۔ جب بگ بین (Big Ben) کا گھڑیال رات میں بارہ بجنے پر گھنٹے بجانا شروع کرتا ہے تو ہزاروں کی تعداد میں وہاں کھڑے لوگ اپنی شناخت، قوم، رنگ، نسل اور مذہب کو فراموش کر کے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ چومتے ہیں اور صدقِ دل سے نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں۔ اُس سے مجھے ہر رنگ اور ہر مذہب کے لوگ ایک سے لگتے ہیں۔ پھر عوام کا رقص، شور شرابہ، جشن کی سی محفل، آتش بازیاں، رنگ برنگی روشنیاں الگ سے اپنا جلوہ پیش کرتی ہیں اور آسمان جگمگا اٹھتا ہے۔ اُن لمحات کو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہوں کہ وہ میری کتاب کا ایک اہم حصہ ہوگا۔

مضمون لمبا ہو گیا ہے۔ ایئرپورٹ پر وقت سے پہنچ جانا۔ پلیز انتظار مت کروانا۔

تارا

کئی سالوں کے وقفے کے بعد میں اپنے وطنِ عزیز گیا تھا۔ بھارت کے معاشرتی طبقوں میں اور عوام میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ نچلی سطح کے طبقے اور غریب غربا مزید غریب ہو چکے تھے۔ جبکہ متوسط اور اونچے درجے کے طبقوں میں خوشحالی آئے روز بڑھ رہی تھی۔ میرے رشتے دار اور دوست احباب بھی اپنے وقتوں کے ساتھ بدلے بدلے سے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ مغرب زدہ ہو چکے تھے۔ صرف لباس کے اعتبار سے ہی نہیں، بلکہ ان کے دیکھنے سوچنے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ بھی بدلا بدلا سا تھا لیکن بعض دوست ایسے بھی تھے، جو اپنی دیرینہ اخلاقی، تہذیبی اور سلفی روایات سے جڑے ہوئے تھے۔ اُن میں میرا ایک دوست انور بلگرامی بھی تھا۔ اس نے میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا چاہا تھا لیکن میں نے شرکت کرنے سے معذرت چاہی تھی کہ میں اپنی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کہانی ساتھ لے کر نہیں آیا۔ لیکن میرا جگری دوست کہاں ماننے والا تھا۔ اُس نے اپنے بک شیلف میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک کتاب نکالی جو دھول سے اٹی پڑی تھی۔ پھر اُسے جھاڑ پونچھ کر میرے سپرد کر دی۔ وہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ "سیپیوں کی نوک پر" تھا۔ اب میرے واسطے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں مقررہ دن سے مقررہ مقام پر کتاب کو بغل میں داب کر وہاں پہنچ گیا لیکن تقریب میں جانے سے پہلے میں نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں دو تین جام اس غرض سے چڑھائے کہ خود اعتمادی پا کر کہانی پڑھتے وقت گھبراہٹ سے دور رہوں۔

سامعین میں میرے آشناؤں اور دوستوں کے درمیان تارا بھی موجود تھی۔ اُسے دیکھتے ہوئے اس سے ملنے کا پہلا موقع تھا۔ ڈھیلا ڈھالا سا گھٹنوں کو چھوتا ہوا بنتی کرتا۔ ویسی ہی کھلی کھلی سی جینز اور پیروں میں معمولی چپل، بال بکھرے ہوئے، سگریٹ کے کش پہ کش لئے جا رہی تھی۔ وہ بلگرامی کے قریبی دوستوں میں سے تھی۔ پتہ چلا کہ وہ فرانسیسی زبان کے ساتھ وہاں کے ادب اور کلچر سے بھی واقف ہے۔ ہندی زبان میں بھی رواں ہے اور اردو سے تو اُسے دیوانگی کی حد تک عشق سا ہے۔ بلگرامی کے تعارف کرانے پر میں نے صدرِ محفل سے اجازت چاہی اور اپنی کہانی "مسیحا" پڑھنا شروع کی۔ اس کا مرکزی کردار ایک گمنام مصور تھا وہ ملک ملک شہر در شہر اس غرض سے بھٹکتا پھرتا تھا کہ اُسے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی، جس کی صورت میں اُسے دنیا کے ہر شخص کی شکل دکھائی دے۔ وہ اس کا پورٹریٹ بنانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ آدمی بنیادی طور پر خود غرض ہے، کینہ پرور، لالچی ہے، منطقی ہے، سازشی ہے اور مادہ پرست بھی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ انانیت کا مارا اقتدار کا بھوکا بھی ہے اور موقع ملتے پر ذاتی مفادات کی خاطر قاتل بننے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دیوانے کا جانلیوا خواب تھا جس کا پورا ہونا ناممکن سا تھا لیکن مصور رنگ و روغن کا مالک تھا اور اپنی جستجو میں سرگرمِ عمل تھا۔ سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ تارا بھی ہر جملہ غور سے سن رہی تھی۔ میں جب کہانی کے اس موڑ پر پہنچا، جہاں مصور کا ایک ادیب دوست اُسے پیرس لے جاتا کہ مل جاتا ہے۔ وہ مصور کو انجانی ڈگر پر دوڑتا پھرتا پا کر اور اس کے پریشان بال اور بڑھی ہوئی

دوسروں کو دیکھ کر افسردہ ہو جاتا ہے لیکن بیک وقت اُسے ہمدردی بھی ہو جاتی ہے۔ مٹھیاں بھینچ کر اپنی خفگی کا اظہار کرتا ہے: "کب تک بھٹکتے رہو گے؟"

"جب تک سنبھلوں گا نہیں۔"

"کب سنبھلو گے؟"

"جب بھٹکنا چھوڑ دوں گا۔"

"تو پھر تم بھٹکنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے.... ایک جگہ ٹک کر کام کیوں نہیں کرتے؟"

"تم واقعی عمر رسیدہ افسانہ نگار ہو اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ حرکت زندگی ہے اور جمود موت۔" میں نے اگلی سطر پڑھنے کو بھی لبوں کو جنبش دی ہی تھی کہ سامعین میں سے ایک نسوانی آواز تالی کے شور میں ابھری: "واہ.... واہ" میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو وہ نادرا تھی۔ تالی بجاتے ہوئے کہے جا رہی تھی: "واہ واہ، ہر ڈائیلاگ کہانی کی پرتیں کھولتا چلا جا رہا ہے۔ دونوں کردار خود کو واضح کر رہے ہیں۔ ایک کو تلاش ہے دوسرا اُسے روکنا چاہتا ہے۔"

کہانی کے اختتام پر ہیرو تلاشِ بسیار کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کی خاطر اُسے اتنی بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے لیکن اُسے ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے انجام سے پہلے ہی واقف تھا۔ کہانی ختم ہوئی تو اُسے مجموعی طور پر سب نے پسند کیا تھا۔ بعض معروف ادبی شخصیات نے اپنی دانست کے مطابق اپنے تاثرات بھی بیان کیے تھے۔ چائے کے دوران نادرا نے مجھ سے جاننا چاہا کہ اگر اس کہانی کا ہندی میں ترجمہ ہو چکا ہے تو اس کی ایک کاپی اُسے عنایت کی جائے۔ اس لئے کہ وہ اردو اگرچہ پڑھ نہیں پاتی لیکن زبان ضرور سمجھ لیتی ہے۔ وہ اس کہانی کو فرانسیسی زبان میں منتقل کرنا چاہے گی۔

"تمہارا بے حد شکریہ۔ کاپی تمہیں ہر حالت میں ملے گی.... یہ کہانی بھارت کی ہر زبان میں موجود ہے۔ ترجمے کا کام ساہتیہ اکادمی کی نگرانی میں ہوا تھا۔"

میرا دلی میں جب تک قیام رہا نادرا سے سرسری اور تفصیلی ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک دوپہر کو ہم کناٹ پلیس کے نرولا ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ موسم گرم تھا۔ سورج تپ رہا تھا۔ ہوا بھی تھمی ہوئی تھی۔ میں بیئر سے دل بہلا رہا تھا جبکہ وہ کولڈ کافی پی رہی تھی اور ساتھ میں پنیر پکوڑوں کی لذت اٹھا رہی تھی۔ پچھلی ملاقات کے دوران جب میں نے اُسے "مسیحا" کا ہندی ترجمہ پیش کیا تھا تو اُس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے نہایت سنجیدگی سے پڑھے گی کیونکہ کوئی بھی رچنا ہو اُسے سننے میں اور خود پڑھنے میں زمین آسمان کا فرق رہتا ہے۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ کہانی مجمع میں سنانے کی چیز ہے اور نہ ہی سننے کی بلکہ اُسے ذاتی طور پر پڑھ کر ہی اس کا ہر پہلو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ ویلیٹ سے ایک پکوڑا اٹھا کر بولی: "کوئی بھی لیکھک اس سچ سے آنکھیں نہیں چرا سکتا کہ اس کی رچنا میں اس کی سوچ کے اپنے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ تمہاری کہانی کا ہیرو اوّل نمبر کا قنوطی تھا۔ منفی سوچ رکھتا تھا۔ کیا تم بھی جیون کو اسی نظر سے دیکھتے ہو؟"

"نہیں نادرا نہیں" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "آدمی خیر و شر کا پتلا ہے۔ ہیرو کی زندگی میں حالات کچھ ایسے رونما ہوئے تھے کہ وہ مکمل قنوطی بن گیا تھا۔ اس کے رویوں میں انسانی فطرت کے تمام منفی رنگ در آئے تھے۔"

وہ بامعنی مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں سے ہوتی ہوئی میرے اندرون کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنا زاویۂ نظر پیش کرنا ضروری جانا: "دیکھا جائے تو یہ سنسار بڑا سُندر ہے۔ جیون انمول شے ہے۔ یگوں بعد منش جنم پایا ہے۔ اُسے اپنے علاوہ انسانیت کی بھی قدر کرنی چاہئے۔"

"بلکہ اُسے بدلتی ہوئی اقدار اور حالات کے ساتھ خود کو بھی بدلنا چاہئے؟"

"ہاں۔ یہ ضروری ہے ورنہ زندگی ایک ہی مقام پر ٹھہر جائے گی۔"

"بالکل۔"

میں نے ہر ملاقات میں اُسے فنکارانہ ذوق اور دنیاوی معاملات میں باخبر پایا تھا۔ ہمارے درمیان دوستی کا پُل مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ نادرا نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ اس دیش کے نامور ہارٹ سرجن ڈاکٹر سوامی کی بیٹی ہے۔ اُس نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم پا کر کئی بھی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ دراصل حال میں ایک عظیم الشان ہسپتال جس کی لاگت اربوں کھربوں روپوں کی ہوگی وہ اُسے "نادرا ہاسپٹل" کے نام سے قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ دن رات اپنے پروجیکٹ میں مصروف اُس کی تکمیل کے خواب دیکھا کرتا ہے لیکن جب بھی وہ بیرون ملک کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کرتا ہے تو اُسے بھی ساتھ لے کر جاتا ہے۔ مغربی دنیا اُس کے نزدیک بڑی کشش رکھتی ہے اس لئے کہ وہ اپنے بچپن سے جوان ہونے تک اپنے والدین کے ساتھ کئی ملک دیکھ چکی ہے۔ بچپن سے اُس کے اندر سیر و سیاحت کا بھرپور شوق پیدا ہوا تھا۔ اُس کے پاؤں میں چکر اُس کی یوم پیدائش جنم کنڈلی اور اُس کے ستارے کے تحت اتنا مضبوط ہے کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے اُس کے پاس کوئی نیا ملک، کوئی نیا شہر دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔

"اچھا اگر ایسا ہے تو باہر کی دنیا کا تمہیں خاصا تجربہ ہوگا.... کبھی لندن آنا ہو تو ضرور ملنا۔"

"میں لندن دیکھ چکی ہوں۔ وہ شہر مجھے اچھا لگتا ہے.... اگر وہاں کبھی آئی تو ملاقات رہے گی۔"

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

☆

حال ہی میں میرا طلاق ہوا تھا۔ پانچ سال، سات ماہ اور دس روزہ شادی شدہ زندگی کے ختم ہونے پر میں خوش تو نہ تھا لیکن اِس حد تک مطمئن ضرور تھا کہ جو خواہش گزشتہ کئی ماہ سے مجھے تڑپا رہی تھی، اُسے عملی شکل دینے کا موقع مل گیا ہے لیکن چند روز بھی نہ بیتے تھے کہ اکیلا پن مجھ پر سوار ہونے لگا۔ خاص طور پر شام کے وقت کام سے فارغ ہو کر جب میں گھر میں قدم رکھتا تو کمروں میں پھیلا ہوا سناٹا، کچن میں گہری خاموشی اور ویران دیواریں پریشان کرنے لگتیں۔ لیکن یہ احساس مجھے ضرور حوصلہ دیتا کہ زندگی کا اصل سفر تو اب شروع ہوا ہے جسے میں تنہا یا کسی شریکِ حیات کے ساتھ طے کروں گا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں جولیا کی محبت میں سر سے پاؤں تک گرفتار تھا۔ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرتا جب میں اُس کی دلکش شخصیت کے متعلق نہ سوچتا۔ یہی حال کم و بیش جولیا کا بھی تھا۔ پھر لطف کی بات تو یہ ہے کہ وہ عشق ہم دونوں کی زندگی کا پہلا عشق تھا اور ہم اتنے خوش تھے کہ خود کو ALPS پہاڑی کی برفانی چوٹیوں پر کھڑا پاتے تھے۔ معاشی اعتبار سے ہم دونوں برسرِ روزگار تھے اور اعلیٰ کمپنیوں میں پیشہ ورانہ ملازمت کرتے تھے۔ وہ ایک انشورنس کمپنی سے منسلک تھی جبکہ میں ایک روزنامہ اخبار سے۔ وہ مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی خاتون تھی اور اونچے عہدے پر فائز تھی لیکن اُس نے مجھے ازدواجی زندگی کے دوران کبھی یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ میں اُس سے کم تعلیم یافتہ ہوں اور اُس کا کہا فیصلہ گھریلو معاملات میں زیادہ وزن رکھتا ہے۔ وہ فردی آزادی اور انسانی حقوق کی قائل تھی۔ اور جمہوری قدروں کی طرفدار اور پاسدار بھی لیکن جب ہمارے درمیان پانچ برس گزر گئے تو مجھے ازدواجی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوا اور وہ تھا ایک خوبصورت سا گول مٹول بچہ۔ ایک ویک اینڈ کی پہلی شام میں میں نے جولیا سے گوش گزار کیا کہ پانچ برس تو ہم لوگوں نے جیتے کھیلتے، قہقہے لگاتے اور مزے لوٹتے میں گزار دیئے ہیں۔ اب ہمیں فوراً اپنی فیملی کو بڑھا لینا چاہیے۔ میں خود کو اور تم کو اُس بچے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا مصمم ارادہ جان کر وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ بولی:

"میرا دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے مگر چند مجبوریاں ہیں۔ ہم دونوں کام کاج والے ہیں۔ بچے کون سنبھالے گا؟ اُس کی پرورش کون کرے گا؟ بے بی سیٹنگ اور نرسری میں اُس کی دیکھ بھال کے لئے اونچے دام ادا کرنے پڑتے ہیں.... خیر ہم دونوں کی آمدن تو اچھی ہے اور ہم برداشت بھی کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر پرابلم کیا ہے؟"

"مجھے نئی ڈائریکٹری کی جاب پر پروموشن دنوں میں ملنے والی ہے.... فیصلہ ہو چکا ہے.... دوسری بات جتنے بھی کمپنی ڈائریکٹرز ہیں، وہ سب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی جلد لڑھک سکتا ہے۔ پھر میں خود بخود ڈائریکٹر بن جاؤں گی۔"

گلاس ہمارے آگے دھرے تھے۔ مجھے اُس کا سہارا لینا پڑا کہ مجھے اپنا دل ڈوبتا لگا۔

"تمہاری سوچ اپنی جگہ اور انتظار اپنی جگہ.... مگر میں ایک بات کھلے لفظوں میں کہہ دوں کہ میں اولاد کے بغیر نہیں مرنا چاہتا.... میں اُس میں اپنا خون، اپنا وجود اور اپنی ذات دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے بھی ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا: "کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"تم کہہ سکتی ہو کہ ہاں۔"

"تو پھر تم کو بھی میرا فیصلہ جاننا ہوگا؟"

"میں سن رہا ہوں۔"

"میں ڈائریکٹر بننے پر ہی ماں بننا پسند کروں گی۔"

"لیکن تب تک ہماری عمر اور بھی ڈھل جائے۔ پانچ، سات، دس برس بلکہ اِس سے زیادہ؟"

وہ مسکرانے لگی۔ پھر انتہائی پیار سے مجھے دیکھ کر کہا: "میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں مگر میں تمہاری سوچ پر کوئی پہرہ بٹھانا نہیں چاہتی۔"

یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اُس رات میں نے جولیا کو ٹوٹ کر پیار کیا تھا اور اُسے منانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ سدا کی طرح مسکراتی رہی اور اپنے مخصوص انداز میں پیار کا جواب پیار سے دیتی رہی۔ میرے کان میں سرگوشی کی: "تم اولاد کے لئے اتنے Desprate کیوں ہو؟"

جانے کیوں پڑھی ہوئی کہاوت اور منو کی لکھی ہوئی کتاب "دھرم شاستر" کا وہ حصہ یاد آ گیا اور میں یہ سوچے بغیر بول اٹھا: "ہماری مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر مرد کنوارا مر جائے یا شادی کے بعد اُس کے اولاد نہ ہو تو وہ اگلا جنم آدمی کی یونی میں نہیں، کسی جانور کی شکل میں لیتا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ جولیا نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ گھر کی چھت اڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بمشکل ہنسی پر قابو پا کر بولی: "مجھے یقین نہیں آتا، یہ تمہاری سوچ ہے۔ تم پچھلے بیس بائیس برس سے ویسٹ (west) میں رہ رہے ہو۔ پڑھے لکھے ہو، کھلا ذہن رکھتے ہو مگر اب بھی پرانے زمانوں کے دقیانوسی یقین تمہاری سائیکی میں دبک رہے ہیں۔"

"تم کچھ بھی کہہ لو.... مگر سچ یہ ہے کہ میں اولاد کا منہ دیکھے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔ میں اُس میں اپنی شکل، اپنی ذات دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ آگے چل کر میرے نام کو دنیا میں زندہ رکھے گی۔"

میرا واضح موقف جان کر وہ اس قدر سنجیدہ ہو گئی تھی کہ وہ کوئی دوسری عورت ہی دکھ رہی تھی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی جانے کیا سوچ رہی تھی؟ میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ پھر یکبارگی اُس کا چہرہ ملائم سی مسکراہٹ سے منور ہو گیا۔ کیا اُس نے چند ہی لمحوں میں آنے والی زندگی کا تعین کر لیا ہے؟ بڑھ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور اپنے لب میرے کان کے قریب لا کر آہستہ سے کہا: "آج تم نے منطق کا دامن

چھوڑ دیا... حیرت ہے لیکن میں تمہاری خواہش کی قدر کرتی ہوں۔" وہ مجھے گوگو کی حالت میں چھوڑ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب میں جولیا سے کبھی اشاروں میں' کبھی ڈھکے چھپے جملوں میں اور کبھی براہِ راست دریافت نہ کرتا کہ اس نے فیملی بڑھانے کی خاطر کیا فیصلہ کیا ہے؟ لیکن وہ کبھی ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتی۔ کبھی مسکرا دیتی اور کبھی موقع پا کر موضوع بدل دیتی۔ میری خواہش ہر گزرتے دن کے ساتھ شدت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی اور میری آنکھیں اولاد کا منہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ ایک شام کام سے فارغ ہو کر میں گھر پہنچا۔ لاؤنج میں داخل ہو کر میں نے جولیا کو آواز دی۔ وہ مجھ سے پہلے گھر چلی آیا کرتی تھی۔ مسلسل آوازیں دینے پر بھی جب کوئی جواب نہ ملا تو اُسے کمروں میں تلاش کیا۔ کھانے کی میز کے وسط میں میرے نام کا ایک لفافہ رکھا تھا۔

"میں کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تمہاری خواہش اور میرا فیصلہ آپس میں روز بروز ٹکرا رہے ہیں۔ مگر دونوں ہماری زندگیاں تلخ ہو کر اس گھر کو جہنم بنا رہی ہیں؟ بہتر یہی ہو گا کہ ہم الگ ہو جائیں۔ میں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ جلد ہی میرا سالیسٹر تم سے فنانس' فلیٹ' بینک اکاؤنٹ' مورگیج اور دیگر امور کے متعلق رابطہ کرے گا۔

میں آج بھی تم کو پسند کرتی ہوں۔ تم نیک سیرت شخص ہو' مخلص اور ایمان دار' دوسروں کے کام آنے والے' مگر اب تم اپنی خواہش کے غلام بن چکے ہو' جبکہ میری منزل بالکل الگ ہے' گڈ بائے۔" جولیا

☆

ہر شخص کے حالات ایک سے نہیں رہتے کہ وہ تغیر پذیر ہیں۔ آدمی سماجی' معاشی اور داخلی طور پر بدلتا رہتا ہے۔ تارا کے جیون میں بھی کئی انقلاب آئے اور اپنی گہری چھاپ چھوڑ کر آئندہ تبدیلیوں کے لئے جگہ بنا گئے۔ اس نے کئی بار اپنے بدلتے ہوئے حالات مجھے فون پر بیان کئے۔ کبھی ای میل کا سہارا لیا اور کبھی تفصیلی خط تحریر کیا۔ میری کہانی "سیتا" کا ترجمہ جو فرانسیسی اخبار "لیگارو" کے ادبی حصے میں شائع ہوا تھا اس کا تراشہ پا کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ کہانی کے حوالے سے لگے ہاتھوں میں چند تعریفی خطوط بھی شائع ہوئے تھے۔ تارا نے فون پر جب آگاہ کیا تو میں نے بے ساختہ اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے انٹرنیشنل رائٹر بنانے پر کیوں تلی بیٹھی ہے؟ دیر تک ہماری ہنسی ایک دوسرے کے کانوں میں مٹھاس چھوڑتی رہی۔ سات سمندر پار رہ کر بھی ہم قریبی اور مخلص دوست ثابت ہو رہے تھے اور ہمارے درمیان عجیب سا تال میل پیدا ہو گیا تھا جسے ہم ہزاروں میل کی دوری سے بھی محسوس کر رہے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب وہ لندن آئی تھی تو میں ہی اُسے ہیتھرو ائرپورٹ سے ہلٹن ہوٹل میں لایا تھا (گو ٹریفک میں پھنس جانے کے کارن میں وہاں دیر سے پہنچا تھا) کمرے میں سامان رکھتے ہوئے تارا نے بتایا تھا کہ دہ

شام میں اُس کا شوہر پولیا سے کانفرنس کے بعد سیدھا لندن پہنچ رہا ہے۔ ہمارے درمیان قریب قریب تین گھنٹے اچھے تھے۔ ہم نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ سماجی' سیاسی' ادبی اور دیگر۔ میرے طلاق کے تعلق سے اُس نے صدقِ دل سے ہمدردی جتائی تھی۔ بلکہ افسوس بھی ظاہر کیا تھا کہ جولیا مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اُس کے فیصلے پر تارا نے حیرت کا اظہار بھی کیا تھا کہ اُس نے سماجی حیثیت کی خاطر اپنی کامیاب شادی قربان کر ڈالی ہے۔ بات چیت کے دوران اُس نے اپنے ناول کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ دن رات اُس پر سنجیدگی سے کام کر رہی تھی۔ موضوع اُس نے یہ بتایا تھا کہ ڈبلیو ایچ او (W H O) کے کئی اونچے عہدوں پر فائز آفیسر انٹرنیشنل کمپنیوں سے سستی دوائیں منگوا کر افریقہ کے پسماندہ علاقوں میں سپلائی کرتے ہیں اور یوں وہ کرپٹ آفیسرز اپنا بینک بیلنس بڑھا رہے ہیں۔ وہ دوائیں زیادہ اثر نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان قحط زدہ علاقوں میں اموات تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا؟

☆

تارا واقعی سنیچر کے دونوں پاؤں میں چکر لئے پیدا ہوئی تھی۔ سنیچر دیوتا' جو دیومالا میں شنی کے لقب سے جانا جاتا ہے' سورج اور چھایا کا بیٹا ہے۔ اکثر سیاہ فام گھوڑے پر سوار دکھائی دیتا ہے اور مشکلات سے دوچار ہوتا ہے لیکن مسلسل سفر اس کا مقدر ٹھہرا ہے۔ وہ تارا کے تن من پر یوں طاری رہتا کہ وہ زیادہ تر سفر میں ہی رہا کرتی۔ بعض دفعہ وجہ بھی جانی۔ مگر مختلف مقامات کی زیارت کرنا اس کا اولین مشغلہ تھا اور ہر تفریح کے بعد اسے روحانی مسرت بھی ملا کرتی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد ماجد ہند سرکار کے بڑے سفیر تھے۔ جس کارن اُس نے بچپن سے بالغ ہونے تک دنیا کی کئی راجدھانیاں دیکھ لی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے برس والد کے تبادلے پر ملک کے ساتھ راجدھانی بھی بدل جایا کرتی۔ ماسکو' لندن' تہران' پیرس' برلن اور اسلام آباد۔ وہ ان شہروں کے طول و عرض سے خوب خوب واقف تھی۔ اُس کا بچپن پیرس میں گزرا تھا اور وہیں اس نے ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ وہاں کی معاشرت' ثقافت اور طرزِ زندگی نے اس پر اثر ڈالا تھا اور فرانسیسی زبان بھی روانی سے بولنے لگی تھی۔

تارا کی شادی ڈاکٹر بسواس سے دہلی میں' وہاں برسوں سے آباد بنگالی برادری کی موجودگی میں بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شہر کی برگزیدہ شخصیات' سرکاری عہدے دار' ڈاکٹرز' تجارتی لوگ اور فنکار حلقوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی لیکن بیاہ سے پہلے جن دنوں تارا کی کورٹ شپ ڈاکٹر بسواس سے چل رہی تھی' اُس نے ملاقاتوں کے دوران ڈاکٹر بسواس سے پہلے تو ہلکے ہلکے اشاروں میں' پھر علامتی الفاظ میں اور انجام کار کھلے لفظوں میں گوش گزار کیا تھا کہ وہ ایک ہی مقام پر زیادہ دیر تک نہیں رہ پاتی۔ اُس کا من اوب جاتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی ایک شخص کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکتی ہے اور نہ ہی اُس کے ساتھ دور دور تک قدم

بڑھا سکتی ہے کا رن یہ ہے کہ وہ اُس شخص کی دہرائی ہوئی باتیں، عادتیں، مشغلے اور رویے برداشت نہیں کر پاتی۔ وہ تبدیلی چاہتی ہے۔ آدمی کو ماحول، قدریں، حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیئے۔ مگر سچ کا دامن وہ کبھی نہ چھوڑے۔ ورنہ روز مرہ کی یکسانیت اُسے دیمک کی طرح چاٹ جائے گی اور پچھتاوا اُس کا مقدر بن کر رہ جائے گا۔ لیکن لوگ بار بار اُس کی باتیں سن کر اور اُس کے رویوں کو جان کر اُس کا مذاق اُڑایا کرتے ہیں۔ بعض اُسے نیم پاگل، سنکی اور بھاوری بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر بسواس اُس کی صاف گوئی، جرأت اور بے باک رویوں پہ مرتا تھا۔ جبکہ تارا سانولی رنگت کی معمولی شکل و صورت کی عورت تھی۔ مگر اُس کی بڑی بڑی آنکھیں اتنی غضب کی تھیں کہ وہ بنگال کا جادو جگاتی تھیں اور آدمی اُن میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ اُس کا بدن بھی بڑا کسا کسا تھا جس کا ہر حصہ مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ بذاتِ خود حسنِ فہم، روشن دماغ اور حالاتِ حاضرہ پہ گہری نظر رکھتی تھی۔ ادب سے بھی اُس کا لگاؤ گہرا تھا۔ اُس نے بنگلہ زبان کی چند کہانیاں غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کر کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنالی تھی۔ اِن اوصاف کے پیشِ نظر کوئی بھی سُلجھا ہوا ذوق شخص اُس پر آسانی سے فدا ہو سکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر بسواس کیونکر بچ رہتا؟ اُسے اپنی دلکش شخصیت، سماجی حیثیت، باعزت پیشہ اور خاندانی دولت پر اتنا فخر تھا کہ وہ تارا کو دنوں میں ہی رام کر لے گا اور وہ بے بس ہو کر ادھر اُدھر بھٹکنا بند کر دے گی۔ جب وہ اُس کے ہمراہ یورپین ملک میڈیکل کانفرنسوں اور سیمیناروں میں جایا کرے گی تو وہاں ڈاکٹروں اور سرجنوں کے لیکچر سن کر حیاتیاتی زندگی کے متعلق اُس کا شعور مزید بڑھے گا۔ پھر اپنے دیش میں ہر ویک اینڈ پر جب وہ پارٹیوں اور کاک ٹیل پارٹیوں میں شامل ہوگی، کبھی اپنے کشادہ فلیٹ میں اور کبھی دوستوں کی رہائش گاہ پر تو ہمیشہ وہ اُن کی آزاد سوچ سے متاثر ہوگی۔ پھر جب وہ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں سرمایہ داروں کے درمیان بیٹھی ڈنر کرے گی اور کروڑوں اربوں کی لاگت سے پرائیویٹ ہاسپٹل کھولنے کا منصوبہ بنانے گی تو وہ اُس کے ساتھ خود پہ بھی ناز کر سکے گی۔ نیا ماحول، نئے لوگ، مصروف زندگی کی ترتیب اُسے راس آ جائے گی اور ہاں بچے پر تو اُس کی کایا پلٹ کر رہ جائے گی۔ جب اُسے احساس ہوگا کہ بال بچوں کے ساتھ عورت کی اصلی دنیا اُس کا گھر ہوا کرتا ہے جسے بنا سنوار کر وہ اُسے جنت بنانے میں کوشاں رہتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر بسواس نے جن خطوط پر سوچا تھا۔ تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا وہ عملی صورت اختیار نہ کر پایا۔ اسباب واضح تھے کہ جب مخالف، متضاد رویے آپس میں ٹکراتے ہیں تو میاں بیوی کے درمیان انجام اکثر جدائی، طلاق، جبر، گھریلو تشدد یا قتل کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ تارا اور بسواس کے درمیان بھی تلخی کے ساتھ اختلافات بڑھتے رہے۔ ایک شب ڈاکٹر نے ڈنر کے بعد تارا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے پیار کرنا چاہا۔ مگر اُس نے رضامندی ظاہر نہ کی۔ بلکہ ڈاکٹر کا ہاتھ ہٹا کر دوٹوک لہجہ اختیار کیا: "شادی سے پہلے میں تم کو پسند کرنے لگی تھی۔ مگر وقت بیت جانے پر اب تم میرے لئے پرانے ہو چکے ہو۔ میں تم کو اندر باہر سے جان گئی ہوں۔"

"پھر؟"

"میں تبدیلی چاہتی ہوں؟"

ڈاکٹر سیانا تھا اور پڑھا لکھا آدمی دُور کی سوچتا ہے۔ ڈاکٹر نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ یوں بھی وہ ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ تارا اُس سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہے۔ اُس کی شکایات بھی بڑھ رہی ہیں۔ مگر وہ اُس کی ہر شکایت کو سُنی ان سُنی کرتا رہا۔ پیار سے بولا:

"یہ تبدیلی کل پہ چھوڑتے ہیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اگلی شام وہ لاؤنج میں خاموش بیٹھے دوردرشن کے چینل پر کوئی سنجیدہ ڈاکومنٹری دیکھ رہے تھے۔ پروگرام عورت ذات کی مظلومیت اور اُس کی سماجی محرومیت کے متعلق تھا۔ مرد ذات نے کتنی عیاری سے عورت کو کمزور جان کر اُس کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھایا اور اُس کا جنسی استحصال بھی کیا تھا۔ بلکہ اُسے ذاتی ملکیت سمجھ کر اُسے آزادی سے بھی محروم رکھا تھا۔ مگر جدید دور میں عورت تمام Barriers کو توڑ کر اپنے حقوق طلب کر رہی تھی اور مرد بے چارہ پریشان تھا۔ میاں بیوی اپنی اپنی سوچ میں گم تھے اور مشروب کے گھونٹ بھرتے گلاس بھی بدل رہے تھے۔ تارا محسوس کر رہی تھی کہ قدرت نے مرد کو جو مخصوص لنگ عطا کیا ہے وہ اُس کے ذریعے عورت کی جسمانی اور حیاتیاتی ضرورت پوری کرتا ہے اور اُسی کے ذریعے ہی آئندہ نسلیں وجود میں آتی ہیں۔ اگر قدرت اُس پر مہربان نہ ہوتی تو عورت اُس سے دُور کا بھی واسطہ نہ رکھتی۔ دوسری طرف ڈاکٹر محسوس کر رہا تھا کہ عورت کی سب سے بڑی ضرورت مرد ہی ہے اور وہ ہمیشہ رہے گی۔ وہ اُس کی محبت کے بغیر نامکمل ہے۔ لیکن وصال کے دوران اگر مرد اُسے کسی وجہ سے مطمئن نہ کر پائے تو وہ تبدیلی چاہتی ہے۔ وہ کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کرتی ہے۔ ڈاکومنٹری ختم ہوئی تو تارا کے کہنے پر ملازمہ نے کھانا پروس دیا۔ میاں بیوی نے کچھ کھایا، کچھ نہیں کھایا۔ پھر میز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر نے بڑھ کر اپنا بازو تارا کی کمر کے گرد پھیلا دیا۔ اُس نے بھی اپنا بازو ڈاکٹر کی کمر میں ڈال کر رضامندی ظاہر کی اور یوں وہ جڑے ہوئے عالیشان خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے بڑے چاؤ سے کہا:

"ڈارلنگ مجھے دو تین منٹ دے دو۔ میں باتھ روم سے ہو کر آتا ہوں۔ بس یُوں گیا اور آیا۔" لیکن ڈاکٹر نے لوٹنے میں سات آٹھ منٹ لگا دیئے اور جب وہ تارا کے قریب آیا تو الگ ہی شخص تھا۔ تنا چہرہ، اُٹھی آنکھیں، کھڑے بال اور سُرخ گالوں پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے۔ جب کھیل شروع ہوا تو ڈاکٹر دیر تک تارا کا انگ انگ جھنجھوڑتا رہا، چومتا رہا، چاٹتا رہا۔ اُس نے تارا کے بدن پر جگہ جگہ دانتوں کے نشان بھی چھوڑے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر کا پیار کرنے کا ڈھنگ بالکل بدلا بدلا سا ہے۔ اتنے زور شور سے اُس نے کبھی پیار نہ کیا تھا اور نہ ہی اُسے

کبھی جانور کی طرح کاٹ کر اُس کی ہر حس کو بیدار کیا تھا۔ وہ قوتِ مردمی کا بھرپور اظہار کر رہا تھا۔ نتاشا حیران تھی اور پریشان بھی کہ ڈاکٹر میں یہ تبدیلی کیونکر چلی آئی ہے؟ دونوں معمول سے زیادہ دیر تک دُنیا سے بے خبر خود میں مشغول رہے۔ وہ پسینے سے تر بتر تھے۔ اُن کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور بال یوں بکھر چکے تھے کہ جیسے انہیں سنوارا نہ گیا ہو۔ کچھ دیر میں وہ بستر سے اُٹھے تو لگتا تھا کہ انہوں نے ابھی ابھی غسل کیا ہے۔ بدن پر بوندیں یوں ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر کا سینہ پھول کر دوہرا ہو جا رہا تھا اور وہ فخریہ نتاشا کو دیکھ کر احساس دلا رہا تھا کہ اُس نے نتاشا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فتح کر لیا ہے۔ وہ بھی خوش تھی کہ اُس کے ہر انگ کا ہر مسام مدتوں بعد کھلا تھا لیکن اُس نے بستر سے چادر کھینچ کر اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا اور سنجیدہ لہجہ اختیار کیا:

"ڈاکٹر میری پرابلم سمجھ نہیں؟ کچھ ہوا ہے؟"

"وہ کیا ہے؟" اُس نے فتح کے نشے میں کہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ آدمی کو ماحول، حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیے۔ میں ایک سی زندگی جی نہیں سکتی۔ مجھے شروع میں تمہاری دنیا پسند آئی تھی۔ میں نے خود کو بدلا بھی تھا۔"

"پھر؟"

"اب مجھے تبدیلی چاہیے؟"

ڈاکٹر نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے اپنا فخریہ لہجہ برقرار رکھا: "آج کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ... تبدیلی ضرور محسوس کی ہوگی تم نے؟"

"ہاں۔ مگر میں کوئی Nympho نہیں ہوں..... بیڈ روم میں داخل ہو کر تم نے دو تین منٹ کی اجازت چاہی تھی مگر پلٹ کر آئے تو سات آٹھ منٹ بیت چکے تھے۔ اس دوران تم نے انٹراوینس (Intravenous) انجکشن لیا ہے اُس کا اثر جب تم پر ہو گیا تو تم نے میری طرف رُخ کیا۔"

ڈاکٹر کا ابھرا ہوا سینہ یک بہ یک اندر کی طرف چلا گیا۔ چہرے کی ہلکی سانولی جلد گہری ہو گئی۔ معاً زندگی ہار چکا تھا۔ قریب ہی رکھی ہوئی موڑھے کی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔ نتاشا اسے ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتی رہی۔ پھر چہرے پہ حقارت ابھرتے ہی وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

اُس رات وہ ایک ہی پلنگ پر سوئے تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کی طرف پشت کیے دراز تھے۔ اُن کے درمیان دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ لگتا تھا کہ اُن کا تعلق ایک لمبے فاصلے میں بدل گیا ہے اور فاصلہ بھی ایسا جو کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہے گا اور ایک نہ ایک موڑ پہ پہنچ کر ختم ہو جائے گا۔

صبح ڈاکٹر اپنے وقت پر اُٹھا کہ اُسے سرجری پہ پہنچنا تھا۔ وہ وقت کا بڑا پابند تھا۔ نتاشا اُس کے ساتھ ہی اُٹھ جایا کرتی تھی۔ پھر ڈاکٹر کے واسطے اُس کی پسند کا بریک فاسٹ تیار کیا کرتی جسے ملازمہ پروس دیا کرتی تھی۔ لیکن اُس صبح نتاشا کو اُس پاس کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ گھوڑے بیچ کر سوتی ہوئی تھی۔ اُس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک دو بار اُسے آواز دے کر اٹھانا بھی چاہا مگر بے سود۔ وہ گہرے خراٹے بھر رہی تھی۔ ڈاکٹر تیار ہوا اور ناشتہ کیے بغیر ہی سرجری کو چلا گیا۔ سورج کی تمازت بڑھی تو ملازمہ نے بیڈ روم میں داخل ہو کر نتاشا کو اٹھایا۔ اُس نے غسل کے بعد سیر شکم ناشتہ کیا۔ پھر ضروری سامان باندھا اور کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گئی۔

"دُعا ہے۔ میں جا رہی ہوں سدا کے لیے۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ جو اہم باتیں میں لکھنے جا رہی ہوں اُن سے تمہارے کان خوب خوب واقف ہیں۔ لیکن تم نے اُن پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کیا اور نہ ہی اُن کی اہمیت کو جانا۔ مجھے افسوس ہے تم نے اپنے اردگرد جو دنیا بسا رکھی ہے شروع میں مجھے راس ضرور آئی تھی اور میں خوش بھی تھی۔ شعوری طور پر میں خود کو بدل بھی رہی تھی۔ لیکن ملک در ملک کانفرنسوں اور سیمیناروں میں جا کر اور وہاں مغربی ڈاکٹروں اور سرجنوں سے مل کر اور اُن سے تفصیلی گفتگو کرنے پر پتہ چلا کہ وہ سب مغربی دنیا کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ وہ مستقل وہاں رہنا پسند کرتے ہیں کہ وہاں دولت کی بہتات ہے لیکن تیسری دنیا کے ملکوں کا ذکر آنے پر اُن کے چہروں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے اور وہ خاموش رہ کر یہ تاثر دیتے ہیں کہ انسانیت کی خدمت کرنا اور غریب غربا کا علاج کرنا اب عہدِ رفتہ کی کوئی حسین سی شے تھی۔ تمہاری کاک ٹیل پارٹیوں میں مجھ کو بہت کم ایسے لوگ ملے جو اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر سانس بھرتے ہوں۔ ورنہ بیشتر کے پاؤں اخلاقی پستی کی طرف جلد ہی پھسل جاتے ہیں۔ اُن کے کریہہ مصنوعی گھناؤنے چہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ تمہارے قریبی اور وفادار دوست تو بیشتر کے پاس وہی دہرائے ہوئے چٹپٹے لطیفے ہیں۔ فحش مذاق ہیں اور سستی باتیں ہیں۔ بعض کی تو نظر بھی بُری ہے۔ وہ میرے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں جبکہ وہ شادی شدہ ہیں اور بال بچے دار بھی۔ میں تمہارے ساتھ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر جایا کرتی تھی۔ یقین جانو وہ مقامات مجھے ایک پل نہ بھائے کہ جہاں کا ماحول نمائشی ہو۔ لوگوں کی باتوں میں کھوکھلا پن ہو۔ جھوٹ ہو۔ ہر کوئی خود کو بڑا جانچ کر پیش کرے اور منافق ہونے کا احساس دلائے۔ اُن جگہوں کو مجھ جیسی عورت کیونکر پسند کرے گی؟ درحقیقت میں تمہاری دُنیا کے قریب سے نہیں گزر سکی اور میں سچ کہے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم کو تمہاری دنیا مبارک ہو۔ تمہارے یار دوست اور تمہارا زیرِ تعمیر ہسپتال بھی مبارک ہو۔ مجھے میری دُنیا بلا رہی ہے۔ چونکہ میں خود تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں تم سے روپے پیسے کی کوئی امید نہیں رکھتی۔ یوں بھی میرے والد میرے واسطے اتنا کچھ چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں کہ وہ اگلے جنم میں بھی شاید ہی ختم ہو۔ آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ کل رات جو گھٹیا، ذلیل اور گھناؤنی حرکت تم نے کی ہے وہ بھلائے نہیں بھولے گی۔ انجکشن لیتے وقت تمہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا اور نہ ہی تم نے سوچا کہ نتاشا تمہاری بیوی ہے کوئی بازاری عورت نہیں؟ Hell with you۔

نتاشا

سال کی آخری شام میں ٹرافلگار اسکوائر اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی سڑکوں پر عوام ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ سفید، سانولے، پیلے اور سیاہ فام لوگ برسرِ موجود تھے۔ سب کو انتظار تھا کہ کب سالِ رواں اپنا آخری لمحہ سالِ نو میں ضم کر کے نیا باب شروع کرے۔ سنارا میری کمر میں بازو پھیلائے مجھے گرفتار کیے کھڑی تھی۔ دسمبر اکتیس تھا۔ فضا خنک تھی اور ہوا سرد تھی لیکن چاروں طرف ٹھنڈ ہونے پر بھی مجھے وہاں کوئی ایسا شخص دکھائی نہ دیا جو گرم کپڑوں سے ملبس نہ ہو۔ سردی جب مجھے زیادہ پریشان کرتی تو میں بڑے کوٹ کی جیب سے ''نپ فلاسک'' نکال کر ووڈکا کے دو تین گھونٹ بھر لیتا اور پھر اُسے سنارا کے لبوں کی طرف بڑھا دیتا۔ وہ ایک آدھ گھونٹ بھر کر جھرجھری لیتی اور پھر اس کی نگاہیں بگ بین (Big Ben) کے گھڑیال کی طرف اُٹھ جاتیں جو ہم سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہم نیشنل گیلری کی سیڑھیوں پر لوگوں میں دبکے کھڑے تھے۔ متحرک سوئیوں کا ملن قریب ہی تھا۔

موسیقی جگہ جگہ سے ابھر رہی تھی اور مہکتی خلقت بے چین تھی۔ پھر وہ پل بھی آ گیا جب سوئیاں بارہ کے ہندسے پر پہنچ کر ایک اکائی کی صورت کر بیٹھیں اور گھڑیال نے بج کر سارے میں نئے سال کی آمد کا اعلان کر ڈالا۔ روشنیاں روشن ہوئیں تو ٹرافلگار اسکوائر کے ارد گرد عمارتیں ساؤتھ افریقہ ہاؤس، کینیڈا ہاؤس اور نیشنل گیلری سب جگمگا اُٹھے۔ شور و غوغا ایسا بلند ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ آکاش چراغاں ہو گیا۔ میں نے جھک کر سنارا کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور اُسے چوم کر نئے سال کی مبارکباد دی۔ وہ بے انتہا خوش ہوئی اور اسی جوش کے تحت اُس نے اُچک کر میرے گال پر جوابی حملہ کر ڈالا۔ پھر ہم لپٹے لپٹائے عوامی رقص کا حصہ بن گئے۔ لوگ پی پلا رہے تھے، گیت گا رہے تھے، قہقہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر عوام کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوئی تو ہمیں بھی خیال آیا کہ ہمارا بھی کوئی گھر ہے جہاں پہنچ کر ہمیں دن بھر کی تھکان دور کرنی ہے۔ سنارا نے اسکوائر پر بھرپور الوداعی نظر ڈالی اور اُسے خود میں اتار کر میرا بازو تھامے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف بڑھ گئی۔ مسافروں سے لدی گاڑی میں ہم ان کے شور شرابے میں اپنے اسٹیشن پر بمشکل اترے اور قہقہے لگاتے راہ گیروں کو نئے سال کی مبارک دیتے ہوئے گھر پہنچے۔ میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور سنارا کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ داخل ہوئی تو ابھی لیمپ روشن ہی ہوا تھا کہ سنارا نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور صدقِ دل سے کہا:

''سمل، آج میں اتنی خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی...... اب میں دن بھر کا یہ واقعہ بہ صد مسرت اپنی کتاب میں لکھ سکتی ہوں...... یوں تو میں یہ سب اکیلی بھی ادا کر سکتی تھی مگر عورت اکیلی ہو تو گدھ اس کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں۔''

''آج میں بھی بہت خوش ہوں کہ تم میرے ساتھ تھیں۔ ورنہ میں ایک عرصے سے اکیلا ہی بھٹکتا پھرتا ہوں۔ اور دنیا تماشا دیکھا کرتی۔''

وہ بالکل میرے جسم سے لگ گئی: ''آج دن بھر ہم ساتھ رہے۔ تمہارا احسان تو چکانا ہو گا۔''

اس کی آنکھوں کی تحریر کو پڑھ کر میں نے اگلا پل ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فوراً ہی اُسے اٹھا کر بانہوں میں بھر لیا اور سیدھا بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

نئے سال کی پہلی شام میں سنارا کی واپسی کی فلائٹ کلکتہ کے لئے بک تھی۔ ہم بہت دیر سے اُٹھے تھے لیکن اس کے باوجود سنارا نے دوپہر کا کھانا تیار کر لیا تھا۔ مجھے ایک طویل عرصے کے بعد ایک ہندوستانی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پچھلے آٹھ دس دنوں سے نصیب ہو رہا تھا اور میں خوش تھا۔ وہ جب سے آئی تھی اس نے کچن پر قبضہ کر لیا تھا۔ طرح طرح کے لذیذ کھانے وہ بنایا کرتی تھی۔ میں نے جب بھی کچن میں داخل ہو کر اس کی مدد کرنا چاہی وہ دہلیز پر ہی میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی اور کندھے اچک کر ادائے خاص سے کہتی:

''ہمارے بزرگوں نے جب 'دھرم گرنتھ' لکھے تھے تو گھر کا چولہا اور رسوئی ناری کے نام لکھ چھوڑا تھا...... بولو اب کیا کہتے ہو؟''

میں کیا کہہ سکتا تھا، خاموشی سے دیکھا کرتا اور اس کی بردباری پر بول کر الگ ہو جاتا اور سوچتا کہ اس عورت کے پاس سچ کے ساتھ علم کا خزانہ بھی موجود ہے۔

ہم کھانے کی میز پر روہو ویٹکی مچھلی کے خوش ذائقہ قتلے چکھ رہے تھے۔ اس نے کانٹا مچھلی کو تین تین انچ کے ٹکڑوں اور مسالوں میں گھول کر تل لیا تھا۔ پھر کھاتے وقت وہ جس بانکپن سے ان قتلوں کے ساتھ انصاف کر رہی تھی وہ اپنی جگہ کمال تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ بنگالی ہونے کے کارن وہ مچھلی کی دلدادہ ہے۔ مجھے اس کی موجودگی اپنے گھر میں نہایت بھلی لگ رہی تھی۔ دل نے چاہا کہ وہ چند دن مزید رُک جائے اور ہم اسی طرح کھاتے پیتے ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کو مزید جان کر وقت گزار دیں۔ کچھ دیر میں جب اس کی پلیٹ قریب قریب خالی ہو چکی تو میں نے دھیرے سے کہا ''سنارا پلیز آج مت جاؤ۔ کچھ دن اور رُک جاؤ۔'' وہ میرے غیر متوقع سوال پر چونک اٹھی۔

''رُک کیوں جاؤں بھلا؟''

''ایسا!'' اس نے مجھے نہایت غور سے دیکھا کہ میرے کہنے میں کیا ہے اور میرے سوال کے پیچھے میرا کون سا جذبہ کار فرما ہے۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ میری التجا کا بھرم رکھ لے گی مگر اس کا جواب انکار میں تھا۔

''نہیں ڈیئر، میرا آج شام میں کلکتہ جانا نہایت ضروری ہے۔ کل ڈبلیو ایچ او (W H O) کے چند ذمہ دار افسروں سے ملنا ہے۔ وہ مجھے اس ادارے کے کرپٹ افسرز اور ویسٹرن کمپنیوں کے متعلق اہم معلومات مہیا کرنے والے ہیں۔ ورنہ کتاب ادھوری رہ جائے گی۔''

''ہاں یہ تو ہے'' چارو ناچار میں پلیٹ پر جھک گیا۔

"مگر تم اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایسے ہی کراچی آئی ہوں۔ کبھی بھی تمہارے پاس آ سکتی ہوں؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اب میں ڈاکٹر سے آزاد ہو چکی ہوں..... دوسری بات میرے پاؤں کا چکر ابھی ختم نہیں ہوا" یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔ پھر اپنا لہجہ سنجیدگی سے واضح کیا: "اس کمبخت چکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ ہر وقت لگتا ہے۔ جانے یہ کب، کہاں اور کس صورت میں ختم ہوگا؟ مگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو میں اس کے بغیر ادھوری سی ہوں۔"

نادیہ تو سولہ کھلاسیوں کے شہر میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایک ہی چھت کے نیچے دس روز تک اکٹھے رہتے رہتے میرے اندر جینے کی بھرپور تمنا جاگ اٹھی تھی۔ خاص طور پر نئے سال کی پہلی رات میں، جب نادیہ خود سپردگی کے عالم میں پڑی تھی اور میں بھی شدت سے عورت کے نرم گرم جسم سے محروم تھا۔ اس نے جسمانی وصال کے دوران میرے کان ہلکا سا کاٹ کر سرگوشی کی تھی: "ڈیل۔ تم واقعی ذات کے اصلی پنجابی ہو۔"

میں بے ساختہ ہنس دیا تھا اور اپنے متحرک بدن کو قدرے روک کر سرگوشی کی تھی: "یہ سب تمہاری محبت کا اثر ہے۔ پھر تمہارے ہاتھوں کے بنے ہوئے پکوان کھا کھا کر جوانی لوٹ آئی ہے۔"

باتوں کے ساتھ قہقہے بھی مدغم ہو گئے۔ بدن جاگ اٹھے اور قہقہے غائب کر دیے گئے۔

میں جانتا تھا کہ نادیہ کے جانے کے بعد گھر کی یہ چند دیواریں مزید ویران ہو کر مجھے اپنے حلقے میں لینا شروع کر دیں گی۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس کی روانگی میری آنکھوں میں اور کچھ نہیں تو ایک آدھ چھید ضرور کر جائے گی اور وہی ہوا۔ تقریباً ہر شام گھر لوٹنے پر جب میں اس امید پر کمپیوٹر کھولتا کہ نادیہ نے دنیا کے کسی کونے، کسی خطے، کسی شہر سے چھوٹا بڑا ای میل ضرور بھیجا ہوگا لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ فون کی جواب دہ ریکارڈنگ مشین بھی خاموش تھی۔ موبائل کا تو ذکر ہی کیا؟ لیکن وقت جب مٹھیوں میں بدل کر آگے بڑھ گیا تو دھیرے دھیرے میری ذہنی حالت بھی بدلتی چلی گئی اور میں محسوس کرنے لگا کہ نادیہ تو ایک کھڑکی تھی جو میرے دل و دماغ پر جم کر رہ گئی اور چپکے سے آگے بڑھ گئی لیکن جانے کیوں میرے من کے کسی کونے میں یہ یقین بھی بیٹھ چکا تھا کہ وہ کہیں اٹک کر رہ گئی ہے اور مجھ تک نہ پہنچنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ایک شام میں اخبار کا کالم ختم کر کے قدرے دیر سے گھر پہنچا۔ کمپیوٹر چند دنوں سے بند پڑا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن وہسکی کے پیتے وقت جب نشہ مجھ میں وحشت پیدا کر کے میرے جذبات کو بیدار کرنے لگا تو نادیہ چپکے سے میرے ذہن میں کنڈلی مار کر آن بیٹھی۔ چند گھونٹ اور پیے تو نادیہ نے سرگوشی کی: "ڈیل۔ اٹھو۔ جا کر کمپیوٹر کھولو۔ تمہارے نام کچھ آیا ہے وہاں۔"

جھٹ سے گلاس کو ایک طرف دھکیل کر میں نے کمپیوٹر کھول کر ای میل کا ان باکس چیک کیا۔ واقعی نادیہ کا ای میل وہاں موجود تھا۔ تین روز سے اُس کا بھیجا ہوا ای میل میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں حواس باختہ ہو گیا اور اسی عالم میں ای میل کا متن پڑھنا شروع کیا مگر سطریں اور الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔ حواس جب درست ہوئے تو نظر اور دماغ نے اپنا کام شروع کیا۔

ڈیر ڈیل۔

کمپالا جس مقصد سے آئی تھی وہ دنوں میں ہی پورا ہو گیا تھا۔ ڈبلیو ایچ او کے نمائندے مددگار ثابت ہوئے تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس رپورٹ کو دنیا کے سامنے لا کر سرکاری افسروں کو بے نقاب کیا جائے۔ میں وہیں جانے کو تیار بیٹھی تھی کہ سوڈان میں دارفور کا قصہ چل نکلا۔ وہاں مدت سے آباد عرب مسلمان مقامی قبیلوں کے مسلمانوں کو صرف قتل ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کی بستیاں، ان کی آبادیاں اور ان کے گھر بھی جلا رہے تھے۔ میں یو این (UN) کے چند ذمہ دار لوگوں کے ساتھ وہاں کیمپ میں مدد کرنے کو چلی گئی لیکن وہاں بھوکی ننگی بلکتی ہوئی مخلوق کے لیے نہ تو پانی تھا نہ روٹی، نہ کپڑا اور نہ دوائی۔ بچے، بوڑھے خیموں میں پڑے ہوئے بے بسی کی تصویر بنے خاموش آنکھوں اور سلے ہوئے ہونٹوں سے آکاش کو ہر دم دیکھا کرتے تھے لیکن جب گڑگڑاتے ہوئے جہاز یا ٹرکوں کی آواز فضا میں ابھرتی تو ہر کوئی کھانے کے پیکٹ اور پانی کی خاطر گرتا پڑتا دوڑتا دکھائی دیتا۔ مرد اور عورتوں کی بھگدڑ اور بھیڑ کو دیکھ کر بچوں سے میرا وشواس اٹھ چلا گیا اور میں پربھو سے پوچھا کرتی کہ اس کی دھرتی پر، اس کے پیدا کیے ہوئے بندے دانے دانے کو محتاج کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ کیوں رہے ہیں؟ لیکن پربھو خاموش رہتے۔ اس سے تم مجھ کو بے حساب یاد آتے۔ اس لیے کہ سنسار میں اب صرف تم ہی رہ گئے ہو جس کی طرف میں بلا سوچے سمجھے دیکھ سکتی ہوں اور تم کو یاد بھی کر سکتی ہوں۔ میں نے دس روز جو تمہارے ساتھ گزارے تھے وہ میرے جیون کے انمول دن تھے۔ اس کی اہم وجہ یہ بھی رہی ہے کہ نئے سال کی آخری رات یا پہلے ابھرتے دن میں، جب ہم نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا تو تم چاہت بھرے موڈ میں تھے، میری کیفیت بھی بدلی بدلی سی تھی۔ آتماؤں کے ملاپ کے دوران وہ ایک دوجے کو زیادہ سے زیادہ پہچان رہی تھیں۔ آخر میں تم نے مجھ میں وہ بیج چھوڑا تھا کہ اب تم اپنی اولاد کا منہ دیکھے بغیر اپنے پربھو کے پاس نہیں جاؤ گے۔ دوسرا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ خوشیاں مناؤ کہ تمہاری جون سپھل ہو گئی ہے۔ تمہاری اولاد اب دنیا میں تمہارا نام چھوڑ کر جائے گی۔ رہا میرے پاؤں کا چکر تو اسے ہمارے بچے کی پیدائش پر ختم ہی سمجھو۔ مجھے اپنی پہلوٹھی کے بچے کا پالن پوشن اور دیکھ بھال میں اپنا پورا جیون تج دینا ہوگا۔ تم کو بھی اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہوں گی۔ میں جلد لندن آ کر تمہارے پاس کچھ دن رکوں گی مگر ہمارا وارث ہماری ہی بھارت میں جنے گا۔ اور تمہارا وہاں موجود ہونا ضروری ہوگا۔

میں ای میل پڑھتے پڑھتے چھلانگیں لگا رہا تھا۔

کہیں داغ نہ لگ جائے....

فرخندہ شمیم

یہ مشرق والے مغرب کو دھائی کل کا نہج سمجھتے ہیں۔ اپنی سانولی شاموں پر ان کے دم توڑتے سفید روپ کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیوں؟ تجر اکثر یہ بات سوچتی 'دم بھر کے لیے اپنی گوری چٹی سہیلیوں کے سامنے کامپلکس ہوتی لیکن جلد ہی اپنی لانبی پلکوں اور سیاہ دراز بالوں کے سحر میں خود ہی کھو جاتی اور جب اپنے ڈرائنگ روم کو اپنے بے شمار ایوارڈز سے سجا ہوا دیکھتی تو ترنگ سے باقاعدہ رقص کرنے لگتی۔ بہترین اداکارہ بہترین مقرر، بہترین طالب کامیابیوں کے اس میلینئم نے اسے بیش بہا حیرت انگیز قوت بخشی تھی۔

تجر.... تمہیں آج تک کسی نے مسترد نہیں کیا!

تم کسی مقابلے میں نہیں ہاری ہو۔

تم لوگوں کی نظروں میں کھُبی ہو۔ نکلی نہیں ہو۔

تیسری دنیا کے گھمن چکر میں پروان چڑھنے والی ایک لڑکی....

صرف اتنے سے میں بھی کسی طرح سے کم تو نہیں ہوتی۔ ضروری تو نہیں وہ ہالی وڈ کی ایکٹریس، امریکی ماڈل اور پیرس کی بیلے ڈانسر بن کر ہی نامور ہو۔

تجر کو اچھا لگتا تھا خاندان کے لڑکے محلے کے لونڈے اور کالج کے باہر کھڑے خوش پوش نوجوان اُسے پہچانتے تھے۔ اس کی ذہانتوں کی دھوم اخبار، ٹیلی ویژن اور پبلک فورم تک پہنچی تھی۔

لیکن وہ ابھی سب کی نظریں نچوائے کر رہی تھی۔

ہاں کل کالج کے لان میں ثنا نے جب اُسے گزشتہ شام کی یہ واردات سنائی تو شاید وہ زندگی میں پہلی بار کسی خوف سے کانپی تھی۔ اس نے ڈیلیا جیسی چوڑی آنکھوں سے ثنا کو دیکھا۔ مسترد ہونے کی ذلت کیا اتنی آسانی سے سہی جا سکتی ہے جس طرح ثنا نے سہہ لی۔ کل شام اس کا رشتہ لینے کچھ لوگ آئے اور اتنی سہولت سے انکار کر کے چلے گئے۔

کیا کمی تھی ثنا میں۔ بے انتہا خوبصورت تو ہے۔ دلکش نین نقش، دراز قد، میٹھی آواز، گریجویشن کی سند.... اور کیا دیکھا جاتا ہے مارکیٹ میں ایک لڑکی کو قبول کرتے ہوئے.... اس نے بڑی سنجیدگی سے سوچا اور ثنا کی طرف دیکھنے لگی۔

اُسے پورا یقین تھا۔ ثنا بے انتہا آزردہ ہو گی اُسے اپنے مسترد کیے جانے کا قصہ سنانے کے بعد.... لیکن وہ تو گھوم گھوم کر پکن پر گلکاری کر رہی تھی۔

ثنا.... تمہیں کوئی غصہ، دکھ نہیں آیا؟

کس بات کا؟

تم جیسی اچھی لڑکی کو ریجیکٹ کر دیں گے!

اوہو.... تم تو بالکل پاگل ہو تجر.... دوسروں میں کمی کا واویلا وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اپنے پلے کچھ نہیں ہوتا۔ جو لوگ میرا پروپوزل ریجیکٹ کر گئے ہیں ان میں اتنی استطاعت ہی نہیں تھی کہ مجھے قبول کرنے کے قابل ہوتے۔ لیکن وہ اپنی بے چارگی اپنے منہ سے تو تسلیم نہیں کریں گے ناں۔ بس وہ مجھ میں کیڑے نکال گئے۔

تجر دم بخود سی رہی۔ وہ کتنی بہادری سے بچی بچی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے دل کھول کر تالیاں بجائیں۔

اور پھر چند ماہ کے اندر ہی تجر کی زندگی میں وہ مراحل آ گئے جن سے وہ لاشعوری طور پر خوفزدہ ہوتی تھی۔

لڑکے والے رشتہ مانگنے آنے لگے۔

اور پھر گئے

دونوں بھابیاں مہمانوں کی خاطر مدارت میں جت گئیں۔ اکلوتی اور لاڈلی نند تھی تجر ان کی۔ وہ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ دونوں بھائی اخلاق اور manners کے چلتے پھرتے شاہکار نظر آنے لگے۔ کچھ خوش کچھ متفکر سے۔ خوش یوں کہ بہن کے پیام آنے لگے۔ متفکر یوں کہ کہیں ناں نہ ہو جائے۔

لڑکی کے ماں باپ کو لڑکے والوں کی ناں سے اتنا ہی ڈر لگتا ہے جتنا پارلیمنٹ میں ناکام ہونے کو تحریک عدم اعتماد سے۔ حالانکہ یہ معمول کی باتیں ہوتی ہیں۔

تجر کا حشر نشر ہو رہا تھا۔ کانپ کانپ کر یوں ٹھہرتی جیسے جاپان کے آتش فشاں سے رک رک کر زلزلہ لانے والا لاوا نکل رہا ہو۔

پورے ملک کے بڑے بڑے ایوانوں پر حکومت کی صلاحیت اور اعتماد کا ڈھنڈورا پیٹنے والی قومی مقررہ آج کتنا سہم سہم کر قدم اٹھا رہی تھی۔ اُسے زندگی کے کسی مرحلے پر مسترد نہیں کیا گیا۔ کہیں ثنا کی طرح اُسے بھی.... لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ایک نہیں، دو نہیں۔ پچاسوں پیام آئے۔

سب نے تجر کو سراہا۔

اس کی مسکراتی ہوئی دلآویز شخصیت کے گرویدہ ہوئے۔

سب ہی نے رشتہ مانگا۔

تجر کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اس کے اماں ابا کہاں ہاں کرتے ہیں۔ اُسے تو اپنے مسترد ہو جانے کی بے انتہا خوشی تھی۔

بھابی نے ایک بار چھیڑنے کو کہا تھا اور اس نے چھپ کر سن لیا تھا۔

''ہماری تجر لاکھوں میں ایک ہے مگر.... بس ذرا رنگت سے دبی

ہے اور رنگت کو ساری دنیا اہمیت دیتی ہے۔ تم تو جانتے ہو۔" انھوں نے آنکھیں جھکا کر اپنے گورے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ سانولی رنگت کی وجہ سے ..... " وہ جان بوجھ کر چپ ہو گئی تھیں اور ندیم بھیا خاموشی سے اٹھ گئے تھے۔

لیکن آج فجر بھابی کے سامنے چہک رہی تھی۔

"دیکھا بھابی... سانولی رنگت کے کتنے پرستار ہیں اس دنیا میں۔
کیا آپ کو نہیں لگتا میرے پرستاروں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے"

وہ بھی ہنسی چھپا اچھالتی بیجا و بجا۔

دن گزرتے گئے۔ وہ ماسٹرز بھی کر گئی۔ اب اماں ابا کی فکر سوا چند ہوئی کہ تین برس سے اچھے سے اچھے رشتے آ رہے ہیں لیکن بات طے نہیں ہو رہی۔ کچھ خاندان نہیں امیر جان کر کھسک ہو جاتے ہیں اور کچھ کو تنگ حال دیکھ کر یہ لوگ ہاں نہیں کر پا رہے۔ چند خاندان تو ایسے ہیں جو ہر شرط پر پورے اترتے ہیں اور لگاتار پیام بھیج رہے ہیں لیکن ..... اس مرتبہ پہلی بار بھابھو شازیہ نے مداخلت کی تھی۔

"اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وقت آنے پر اچھے سے اچھی جگہ بھیا مل جائے گا۔"

لیکن وقت تو بھاگا جا رہا ہے۔ اماں نے جیسے خود کلامی کی تھی۔ اگر ایسا آگے نکل گیا تو ہم صرف گرد ہی کر رہ جائیں گے۔ بے خیالی میں وہ کچن کی طرف یوں جانے لگیں جیسے چولہے کی آگ بجھا دینے سے وقت کی لو تھم جائے گی۔

لیکن فجر ہر چیز سے بے نیاز تھی۔ وہ جان گئی تھی وقت نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ اس نے سی۔ایس۔ایس کی تیاری شروع کر دی اور یونہی کھیل کھیل میں کچھ نظمیں بھی لکھنا شروع کر دیں۔ شاعری... اس کے منصوبوں کا حصہ نہیں تھی۔ لاشعور کا حصہ ضرور تھی۔ اس نے احباب کو اپنی بہت سی نظمیں سنائیں اور خوب داد پائی۔ اسی سال سی۔ایس۔ایس کلیئر ہوا اور چند ہفتوں بعد وہ اکیڈمی میں ٹریننگ لے رہی تھی۔

اس کی شوخ اور پُر اعتماد طبیعت نے یہاں بھی اُسے قبولیت کا رتبہ دے دیا تھا۔ ٹریننگ کی کسی سہانی شام ہی کا لمحہ تھا جب اس نے ایک چھوٹی سی مگر تحیر خیز نظم سنا کر اپنے اکیڈمی فیلوز کو چونکا دیا تھا۔

قربتوں کی خواہش نے
ایک شب ملن رت کو
عاشقی کی چالوں میں گھیر قتل کر ڈالا
قربتوں سے ڈرتی ہوں۔

واہ واہ۔ واہ۔ بھئی واہ کیا کہنے ایک شور مچ گیا۔ آں۔ ارے کس نے اس کانچ سی لڑکی کو اپنی قربتوں سے ڈرا دیا؟ جمیل نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نچا کر پوچھا۔ لیکن اس سارے ہنگامے سے دور جو اصل میں چونکا تھا وہ جمشید تھا۔ جس نے پہلی بار فجر کو اس قدر غور سے دیکھا تھا۔ کوک کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے سوچا۔

اس لڑکی کو زندگی کا ساتھی بنانا کس قدر منفرد تجربہ ہوگا۔ ذہین عورت میں یہی تو سہولت ہوتی ہے وہ زیادہ سوال جواب نہیں کرتی۔

وہ فجر سے ملا۔ فجر کے والدین سے ملا۔ والدین نے فجر کے چہرے پر شرمیلی مسکان دیکھ لی تھی۔ بھائی بھابیاں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو گئے۔

جمشید کے والدین بہو پر صدقے واری تھے۔

جمشید فجر کو بے حد خوبصورت حجلۂ عروسی تک لایا۔

وہ بس اتنا ہی کر سکا تھا۔ چوکھٹ اور بستر راحت کے درمیانی فاصلے پر اس کے پَر جلتے تھے۔ چھ فٹ کے وجیہہ اور تنومند شخص کے اندر رہتا ایک خالی گنبد کی گونج تھی۔

قبر اوپر سے کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو قبر ہی ہوتی ہے۔

[illegible] پر صبح صادق سے پہلے کا تارا ٹوٹ کر چکنا چور ہوا۔ پاؤں کے نیچے کی زمین تڑخ گئی۔

اتنا ہو کر تو ہوائیں بھی سمندر کے ساتھ نہیں کرتیں۔ فجر ساری رات جمشید کو کمرے میں ٹہلتا ہوا دیکھتی رہی۔

صبح ہو چکی تھی۔

جمشید نظریں چرا رہا تھا۔ عروسی جوڑا فجر کے بدن پر جوں کا توں سجا تھا۔ حنایا ورقہ پر جمشید کا کوئی نقش ثبت نہیں پڑا تھا۔

فجر خاموش رہی۔

اُسے مسلسل دکھ ہو رہا تھا اس عدم اعتماد کا جو جمشید نے اس پر کیا تھا۔ وہ ہیولی کا درخت ہی تو تھا کوئی گناہگار تو نہیں تھا جو معبود جیسے مہربان سے چھپتا پھر رہا تھا۔

"تم مجھے مسترد تو نہیں کر دو گی فجر؟" جمشید نے شکست خوردگی سے پوچھا۔

فجر نے کاجل سے بھری نظر جمشید پر ڈالی۔ کوئی ایسا ہی مرد ہوگا جس نے شاید کسی مکمل لڑکی کو مسترد کر دیا تھا۔ شاید کسی مرد کو احساس نہیں ہوتا کہ مسترد ہونے کا درد کتنا گہرا ہوتا ہے لیکن آج ایک مرد کو بھی یہ احساس ہوگا۔

جمشید نے آگے بڑھ کر فجر کو روکنا چاہا لیکن پہلے پہلے پوائنٹس پر جیتنے والی مقررہ نے ایک سادہ سا فون اپنے گھر والوں کو کیا۔ بڑی سی چادر اوڑھی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے میکے لوٹ آئی۔

سانجھ ڈھلے

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

گھر کے ماحول میں کئی دنوں سے تناؤ، بے چینی اور اُداسی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھی بھارتی کی سسکیاں سنائی دے جاتیں اور میں بے چین ہو اُٹھتا۔ خود کو بے بس اور لاچار محسوس کرتا۔ اِس سے پہلے میں نے کبھی خود کو اتنا مجبور نہیں پایا تھا مگر جب اولاد بڑی ہو جاتی ہے تو خود مختار بھی ہو جاتی ہے۔ اُن کی ضد اور فیصلے کے آگے ماں باپ کو ہی جھکنا پڑتا ہے۔ ماں باپ کے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ اُٹھانا بھی انھیں خوب آجاتا ہے۔ ویسے بھی نِگ بیٹا ہے بھارتی کی کمزوری رہا ہے۔ اُس کے لاڈ پیار نے ہی اُسے ضدی بنا دیا۔ اب خود پچھتاوے کی آگ میں جل رہی ہے۔ بیٹے کے منہ سے نکلی بات پوری کرنا جیسے اُس کی عادت سی بن گئی تھی۔ میں نے کئی بار اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی خواہش کو پنپنے اور اُسے پالنے کی تمنا تو بیٹے کے دل میں جڑ پکڑنے دو۔ اُس کے دل میں ایک جوش تو پیدا ہونے دو۔ مگر ماں کی ممتا کو باپ کی نصیحت سمجھ میں نہیں آتی۔ جھٹ سے لڑنے کو تیار ہو جاتی۔

"ایک ہی تو بیٹا ہے میرا۔ کس کے لئے جیتے ہیں ہم اور اس کے لئے کماتے ہو آپ تو ہر بات پر اِس طرح ٹوکتے رہتے ہو۔"

"دو بیٹیاں بھی ہیں تمہاری انہوں نے کبھی اس طرح کوئی ضد کی۔ پھر بھی تم نِگ کی زیادہ حمایتی ہو۔"

"یہ آپ سوچتے ہیں۔ مجھے تو اپنی ساری اولاد پیاری ہے۔ ہاں جس طرح مانسی آپ کی لاڈلی ہے اسی طرح نِگ تھوڑا سا زیادہ لاڈلا ہے۔"

"اور راگنی؟"

"وہ بھی میری لاڈو ہے۔"

اور میں یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ اِس سے اب بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہماری شادی کے دو سال بعد جب پہلی اولاد مانسی پیدا ہوئی تو خوشی سے میں جھوم اُٹھا۔ بھارتی بھی خوش تھی مگر میری ماں کو جیسا چاہیے تھا اس نے بہو اور پوتی کے کوئی خاص چاؤ نہیں کئے۔ بھارتی کا دل ڈوبنے لگا تو میں نے ہی اُسے حوصلہ دیا۔

"تم کیوں اُداس ہوتی ہو۔ دیکھنا یہ بچی خود بخود دادی کا دل جیت لے گی۔ پھر مجھے تو بیٹی ہی چاہیے تھی۔ فکر مت کرو اگلی بار بیٹا ہو جائے گا۔"

"ابھی سے تو اگلی بار کی بات مت کرو" وہ گھبرا کر بولی۔

"اگلی بار سے کیوں خوفزدہ ہو رہی ہو ابھی تو تمہیں چار پانچ بچے پیدا کرنے ہیں۔ بچوں سے گھر بھرا رہے۔ ایک آئے ایک جائے رونق لگی رہتی ہے۔"

"کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ آج کل تو لوگ دو بچے بھی پیدا نہیں کرتے آپ چار پانچ کی بات کر رہے ہو۔ ایک ہی اچھی طرح پل جائے وہ ہی کافی ہے۔"

"اِس بارے میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔ مجھے زیادہ اولاد چاہیے۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں میں جانتا ہوں گھر کتنا ویران ہوتا ہے۔ جب میں دوسرے بچوں کو بہن بھائیوں کے ساتھ لڑتے شرارت کرتے دیکھتا تھا تو دل ہی دل میں اُداس ہو جاتا۔ یہ تو میرے بابا جلدی اس دُنیا سے چلے گئے ورنہ۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ابھی اس بحث کا فائدہ؟ ابھی ٹھیک سے بچی کو گود میں اُٹھانا تو سیکھ لو" اور میں خود پر ہی ہنس پڑا۔

مانسی ابھی دو سال کی ہی ہوئی تھی کہ ماں نے پھر سے بیٹے کی رٹ لگانی شروع کر دی مگر اس بار بھی بیٹی ہی ہوئی۔ مجھے قدرت کا یہ فیصلہ منظور تھا مگر ماں نے تو گھر میں ماتم کا ماحول بنا دیا۔ اس بات کو لے کر ماں سے بہت جھگڑا بھی ہوا۔

"ماں اِس چھوٹی سی بچی کا کیا قصور جو تم اِس طرح منہ پھیر رہی ہو۔ اُس کا اچھے سے استقبال تو کرو گھر میں نیا مہمان آیا ہے۔ اِس طرح سے اُس کا نرادر نہ کرو۔"

"میں تو تیرے لئے پریشان ہوں۔ دو دو بیٹیوں کا بوجھ پڑ گیا۔"

"میری بچیوں کو بوجھ مت کہو ماں۔"

"آج بیٹا ہوتا تو کم از کم تیرے بڑھاپے کا سہارا تو بنتا۔ مرنے کے بعد کوئی نام لینے والا تو ہوتا۔"

"ماں آج کل بیٹیاں ہی بیٹے ہیں۔ انھیں لڑکوں کی طرح ہی پڑھا کر ان کے پیروں پر کھڑا کروں گا۔"

"پھر ان کو دہیج دے کر دوسروں کے گھر کے لئے روانہ کر دو گے؟"

"یہ تو زمانے کا دستور ہے۔"

"بیٹے کو پڑھاتے لکھاتے تو پاس رہتا۔ خیال رکھتا سیوا کرتا۔ سہارا بنتا مگر یہ لڑکیاں......"

"ماں اب جو ہے اُسے ہنسی خوشی قبول کرو۔"

میں اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

مگر ماں کہاں چپ رہنے والی تھی۔ جب تک نِگ پیدا نہ ہوا ماں کو

چھین نہ پڑا۔ لڑکا کیا پیدا ہوا جیسے ماں کو کوئی انمول خزانہ مل گیا۔ اصل سے سُود زیادہ پیارا ہوگیا۔ پوتے کو پا کر وہ بیٹے کو بھی بھول گئی۔ ماں خوش تھی بس میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ کسی کی کیا مجال کہ کوئی ٹیگ کو کچھ کہہ جائے۔ راگنی اور مانی ہمیشہ دادی سے شکایت کرتیں۔

"دادی یہ تم اچھا نہیں کررہی؟"

"کیا اچھا نہیں کررہی؟"

"ٹیگ اگر تمہارا اپنا ہے تو کیا ہوا ہم بھی تو تمہارا ہی خون ہیں پھر ہم سے سوتیلوں جیسا برتاؤ کیوں کرتی ہو؟"

"یہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے"

"اور ہم؟"

"تم تو پرایا دھن ہو۔ امانت ہو اس گھر میں۔"

اور اُن کے اُترے ہوئے چہرے میرے دل پر چھریاں چلا گئے۔

"تم دونوں میری آنکھ کے تارے ہو۔ ایک دائیں آنکھ اور ایک بائیں۔"

"پاپا دائیں کون ہے اور بائیں کون؟" مانی معصومیت سے پوچھتی اور میں اُن دونوں کو اشارہ کرتا کہ ان کے چہرے کھل اُٹھتے۔

آج کے زمانے میں تین تین بچوں کو اچھی تعلیم دینا بہت مشکل کام ہے اُن کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت پوری کرنے میں کب زندگی نکل گئی پتا ہی نہ چلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچے جوان ہو گئے اور ہم بوڑھے۔ اُن کی جوانی دیکھ کر احساس ہوا کہ ہماری عمر بھی ڈھل رہی ہے۔ مانی اور راگنی پڑھائی مکمل کر کے اپنے اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی تھیں۔ مانی ایم بی اے کر کے ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کر رہی تھی اور راگنی نے بھی ابھی ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آج ماں زندہ ہوتی تو دیکھتی کہ اُن کے بیٹے کا سر فخر سے اُس کی بیٹیوں نے کتنا اونچا کر دیا ہے۔

ٹیگ پڑھائی میں تو اچھا تھا مگر لاپرواہ بہت تھا۔ بچوں کی پڑھائی کے اخراجات اُٹھاتے اُٹھاتے میری کمر ٹوٹ چکی تھی اور اب ٹیگ نے ضد پکڑی تھی کہ وہ ودیش جانا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ دیکھ تیری دونوں بہنوں کی شادی کرنی ہے دونوں کی شادی کی عمر ہو چکی ہے اُس کے لئے بھی پیسہ چاہیے۔ اب تیری پڑھائی مکمل ہو چکی ہے اب تو یہاں کوئی اچھی سی نوکری تلاش کر اور میرا ہاتھ بٹا۔ مگر اُس کے تو سر پر باہر جانے کا جنون سوار تھا۔ بھاوتی نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا تھا۔ ہم دونوں کی پریشانی دیکھ کر دونوں بچیاں پریشان تھیں۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ باہر دونوں بہنیں ٹیگ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"دیکھ ٹیگ تو باہر جانے کی ضد چھوڑ دے"

"یہ ضد نہیں ہے میں کچھ بننا چاہتا ہوں۔"

"کیا یہاں رہ کر کچھ نہیں بن سکتا؟"

"یہاں تو تم دیکھ ہی رہی ہو پڑھ لکھ کر کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملتی۔ ہر جگہ دھکے کھانے پڑتے ہیں۔"

"کیا میری نوکری ڈھنگ کی نہیں؟ کیا مجھے دھکے کھانے پڑے؟ اور تو کیا سوچتا ہے اچھی سی نوکری تیرے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے"

"وہاں گھوڑے گدھے ایک برابر نہیں ہیں۔ محنت کرنے والے کی قدر ہے وہاں۔ یہاں تو سفارش اور رشوت کے بنا کوئی کام ہی نہیں بنتا۔ پاپا کو ہی دیکھ لو کتنے تعلیم یافتہ ہیں نوکری تو اچھی ہے مگر ترقی کہاں ہے؟ وہ تو بھی ہو سکتی ہے اگر وہ اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کر لیں۔ جو اُن کے ضمیر کے خلاف ہے"

"مگر سب سے دور وہاں اکیلے کیسے رہ پاؤ گے؟ تمہیں تو پانی کا گلاس اُٹھانے کی عادت بھی نہیں۔"

"دیدی یہی عمر ہے کچھ بننے کی۔ اگر میں جذبات میں بہہ گیا تو زندگی بھر پچھتانا پڑے گا۔"

"مگر اس کے لئے اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا پھر کچھ ہی دنوں میں ہم دونوں اپنے سسرال چلی جائیں گی ماں پاپا بالکل اکیلے ہو جائیں گے۔"

"اگر پاپا چاہیں تو پیسے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ میں جب نوکری کرنے لگوں گا تو ساری رقم لوٹا دوں گا۔ اور تم کیوں فکر کرتی ہو ماں پاپا کی میں انہیں بھی اپنے پاس وہاں بُلا لوں گا۔"

"مطلب ہمارا مائیکہ ہم سے چھین لو گے؟"

"نہیں تم ودیش میں اپنے مائیکے آنا۔ اب چھوڑو بھی دیدی۔ تم جانتی ہو میرے کتنے دوست باہر جا چکے ہیں۔"

"تم تو اکیلے چراغ ہو اس خاندان کے۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں کون سا اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ رہا ہوں۔"

"راگنی چپ ہو جاؤ کوئی فائدہ نہیں بحث کرنے کا۔"

میں نے کمرے میں لیٹے لیٹے کہا۔ بہت دیر سے اُن دونوں کی بحث سُن رہا تھا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

ٹیگ اپنی ضد منوانے میں جیت گیا اور ہم سب ہار گئے۔ ماں کے آنسو اُس کے دل کو نہ پگھلا سکے۔ مغربی زندگی کی چکا چوند کے آگے ہمارا پیار پھیکا پڑ گیا۔ اُسے تو بس زندگی میں کچھ کر دکھانا ہے۔ نہ جانے آج کے نوجوانوں میں ودیش جانے کی کون سی نئی بیماری چل پڑی ہے۔ گھربار سب رشتے ناتے چھوڑ کر باہر بھاگ رہے ہیں۔ شاید ہی ایسا کوئی گھر ہو جو اس بیماری کی لپیٹ میں نہ آیا ہو۔

دل پر پتھر رکھ کر اُسے چھتے چھتے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بینک سے قرض مل گیا اور اُس کے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بھارتی کی آنکھیں جانے انجانے میں بھر آتیں مگر ہم سب سے بڑی صفائی سے چھپا جاتی لیکن رات میں اُس کی سسکیاں میرے کانوں میں درد بن کر میرے دل میں اُتر جاتی۔ دونوں بچیاں ماں کے ارد گرد رہتیں اور اُن کی پوری کوشش ہوتی کہ ماں ایک پل بھی اُداس نہ ہو۔ دونوں نے بھائی کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا سامان اکٹھا کیا اور اُس کی تیاری مکمل کر دی۔ پھر چھتے چھتے دل میں درد چھپائے اُسے بیدا کر دیا۔

نیک کے جاتے ہی گھر بالکل ویران ہو گیا۔ آج کل کی تیز رفتار زندگی اور ماڈرن ٹیکنولوجی (Technology) کے باعث یوں تو فاصلے بالکل کم ہو چکے ہیں سات سمندر دور بیٹھے اپنے کو web camera سے دیکھ سکتے ہیں بات کر سکتے ہیں جیسے آمنے سامنے بیٹھے ہوں مگر پاس نہ ہونے کے احساس سے پھر بھی دل بجھا رہتا ہے۔ بھارتی نے بھی بیٹے کی جدائی کا غم پال لیا تھا اُسے گھن لگ گیا تھا جس نے اُسے اندر سے کھوکلا کر دیا۔

نیک نے نئی آب و ہوا کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا۔ پڑھائی بھی کر رہا تھا اور کما بھی رہا تھا۔ نئے ماحول میں بہت خوش تھا اُس کی ترقی دیکھ کر ہم خوش تھے مگر اُس کی جدائی کا غم خوشی سے بھر نہ سکا۔ راگنی اور رانی کی شادی طے ہو چکی تھی۔ ایک اُمید بندھی تھی اُسے دیکھنے کی۔ دو سال گزر گئے تھے اسی انتظار میں۔ اُس کے جواب نے سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"میں نے ابھی ابھی یہاں مکان لیا ہے اُس کے لئے ہر مہینے بھاری قسط جاتی ہے۔ ابھی چھ مہینے تو میں بالکل نہیں آپاؤں گا۔"

میں نے سوچا تھا اُس سے کہوں گا اب تیری کمائی بھی اچھی ہو گئی ہے جو قرض میں نے تیری پڑھائی اور تجھے باہر جانے کے لیے لیا تھا اُس کے اُتارنے میں میری مدد کرنا شروع کر دے مگر اُس نے اپنے اخراجات پہلے ہی بتا دیئے۔ اس بارے میں میں خاموش ہی ہو گیا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔

بھارتی نے سُنا تو ٹوٹے دل سے آواز نکلی:

"شاید بہن سے ملنے پر بھی نہ پہنچ سکے۔"

"ایسا کیوں کہتی ہو وہ ہمارا بیٹا ہے۔" اُسے حوصلہ تو میں دے رہا تھا مگر دل ہی دل میں اُس سے متفق تھا۔

کبھی کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی رُکتا نہیں۔ بھائی کے نہ ہی اُن کی ڈولیاں دھوم دھام سے اُٹھ گئیں۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنے سارے فرض ادا کر دیئے۔

تنہائی نے ایک بار پھر آ گھیرا۔ گھر کا سناٹا کھانے کو آتا۔ ایک دوسرے کے وجود کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ بھارتی کو خیالوں میں کھوئے دیکھ پوچھ ہی لیا جبکہ میں جواب جانتا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"اب سوچنے کو ہے ہی کیا؟" اُس نے سرد آہ بھری۔

"وقت کے ساتھ چلنا سیکھو بھارتی۔ چڑیا کے بچے بھی جب اُڑنا سیکھ لیتے ہیں تو گھونسلوں میں واپس نہیں آتے اپنے اپنے گھونسلے بنا لیتے ہیں۔"

"میں چڑیا نہیں ہوں۔ ہاڑ ماس کی عورت ہوں۔ ماں ہوں۔"

"اپنی خوشی کے لئے بچوں کو باندھ کر تو نہیں رکھ سکتے بھارتی۔"

"آپ بتایئے انسان اولاد کیوں مانگتا ہے؟"

"تاکہ دُنیا کا چکر چلتا رہے۔" میں نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

"نہیں ایسا نہیں۔ آپ بات بدلنا چاہتے ہیں۔ انسان اولاد اس لئے چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا کہہ سکے جو اُس کے دُکھ سکھ میں برابر کا شریک ہو۔ جو اُس کے بڑھاپے کا سہارا بن سکے۔ جوانی تو ریت کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتی ہے مگر بڑھاپا کمبخت ایسی شے ہے جو ایک بار دستک دے دے تو پھر لوٹ کر نہیں جاتا۔ ساری زندگی بچوں کو پالنے میں اُن کی ضرورتیں پوری کرنے میں ہی گزر گئی اور اب جب آرام کے دن آئے گھر میں رونق دیکھنے کے دن آئے تو ویرانی نے گھر کر لیا۔"

"ایسا کیوں سوچتی ہو۔ ہم بھی تو اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے گاؤں سے شہر آئے تھے۔ تو کیا ہوا اگر ہمارا بیٹا اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے ودیش چلا گیا۔"

"ہم اپنے ماں باپ سے اتنی دور نہیں گئے تھے کہ اُن کے دُکھ سکھ میں اُن کا ساتھ نہ دے سکے۔"

"بھارتی زمانے کا رنگ یہی ہے۔ فکر کرو اس بھگوان کا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ تم ایسا سوچو کہ ہم پھر سفر پر آ کھڑے ہوئے اُسی موڑ پر جہاں سے ہم نے زندگی شروع کی تھی۔ چلو ایک بار پھر نئی شروعات کرتے ہیں۔" میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"اُس وقت جوانی کی جوش تھا مگر اب......"

"اب کیا؟ کیا ہم اِک دوسرے کے لئے طاقت نہیں بن سکتے؟ جینے کا سہارا نہیں بن سکتے؟ کیا اب ہم خود کے لئے نہیں جی سکتے؟ چلو نئی شروعات کریں۔" اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ وہ میری باہوں کے حصار میں آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ نئی شروعات کرنے کے لئے پرانے درد بہہ جائیں تو اچھا ہی ہے۔

تقدیس کا رشتہ

گلزار جاوید

کچھ دنوں سے عجب تذبذب میں گھرا ہوا ہوں۔ کبھی خوابیدہ خواہشوں کے زیرِ اثر پیش رفت پر آمادہ ہونے کو جی چاہتا ہے، کبھی نادیدہ خوف کے مارے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ یک دل کرتا ہے کسی عالم دین سے رجوع کیا جائے دوسرے ہی لمحے نفسیاتی گرہ کشائی کی جانب دھیان چلا جاتا ہے۔ اپنے پیاروں کا خواب میں آنا نیک شگون سہی اُن کا اپنے ہمراہ چلنے کی ترغیب، کبھی کبھی زور جبر سے آمادہ کرنے کی کوشش بہت سے وسوسوں اور واہموں کو جنم دے رہی ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کئی دنوں بلکہ ہفتوں سے ماتھے پر آتی زلفیں لہراتے، وہ بائیں رخسار کے تل کو سہلاتے ہوئے کالے لباس اور چست دوگرگی میں چہرہ پر مخصوص مسکان سجائے شعیدہ رات کے پچھلے پہر خواب میں آ کر اپنے ہمراہ چلنے کی تاکید کرتی ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ہم شعیدہ کو دیکھ کر مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔ کئی بار شعیدہ کو دیکھتے ہی ہماری روح کانپ جاتی ہے۔ ایک وجہ ہمارے اندر چھپا نادیدہ خوف ہو سکتا ہے، دوسری وجہ بڑی واضح، صاف اور نمایاں ہے۔ ہماری عمر، احساس، جذبات، خیالات، سوچ، سمجھ اور صحت باسی ہانڈی کے ابال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شعیدہ ہو بہو پہلے کی طرح تازہ ہانڈی کی گرم بھاپ کی مانند سب کچھ نگلنے قبل کر نکلنا چکنا چور کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ کاش! ایک بار صرف ایک بار کوئی شعیدہ کو اس روپ میں دیکھنے کے بعد اس روپ میں بھی دیکھ سکتا تو موت کبھی اتنی بھیانک، خوفناک اور بےرحم ہرگز نہ لگتی۔

روز روز کی اگر مگر، کیوں اور ہاں ہاں، نہیں نہیں سے تنگ آ کر ہم نے شعیدہ کے ہمراہ چلنے کی حامی بھر لی ہے۔ شعیدہ حسب عادت ناک کی چونچ چمیلی، موتیا اور گلاب ہو کر بھری بھری جوانی میں موت کو بہادری اور دلیری سے خوش آمدید کہہ گئی ہے۔ ہم ترس دیدہ اور بے یقین ہوتے ہوئے بھی موت جیسی اٹل حقیقت سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔ بے وقت، بے آسرا، بے بس مرنے سے بہتر ہے کہ شعیدہ جیسی باوفا اور باذوق دوست اور ہمراہی کے ساتھ باعزت ہو کر جان جانی کو بخشنے کے تحفہ عطا کیا جائے۔

حقیقی زندگی میں دنوں اور گھنٹوں میں کٹنے والے راستے چند ساعتوں میں یوں طے ہو گئے جیسے پلک جھپکتے میں ٹیلی ویژن یا سینما کی سکرین پر منظر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ماں کا آغوش، گھر آنگن، کھیت کھلیان، گلیاں، چوبارے، سکول، مسجد، مندر، بڑی سڑک کا ویران گزرگاہ اور خاموش گردوارا آنکھوں کے سامنے ایک کے بعد ایک کر کے گھومنے لگے ہیں۔ گاؤں کی تنگ اور کچی سڑک اب بڑی سڑک کی مانند پختہ اور کشادہ ہو گئی ہے جس پر گھوڑوں کی ٹاپوں اور بیلوں کی ٹلیاں (گھنٹیاں) کی آوازوں کے بجائے موٹر سائیکلوں کی گھر گھر اور ویگنوں، بسوں کی گھوں گھوں کے ساتھ ڈھول کی تانری اور سرگم کی ملی جلی آوازیں عجیب سی کرافت پیدا کر رہی تھی۔ ایک دفعہ ایسا محسوس ہوا جیسے سانس ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔ زور لگا کر سانس کو واپس لانے کے لیے شعیدہ کی معقول تعداد زخم خوردہ پھیپھڑوں میں بھرنے کا خوف بھی لاحق تھا۔ اچانک کانوں میں حیاتی علی الصلوٰۃ حیاتی علی الفلاح کی کھینچ کو ٹھنڈک پہنچانے والی آواز روح میں بانگی گھولنے لگی۔ سہا آنکھوں کے سامنے اُستاد غلام شاہ امام مسجد کا نورانی چہرہ اور موزوں رنج علی کی مسکین صورت گھوم گئی۔ سفید رنگ کی کپاس سے چرخے پر بنے دھاگے اور کھڈی پر بنے کاڑھے کی شلوار کرتا اور موٹے کھدر کی طرح کی چادر سر پر پگڑی کی بجائے امام صاحب جب بھی گاؤں کی گلیوں سے گزرتے گاؤں کے لوگ کھڑے ہو کر انہیں سلام کرتے، اُن کی خیریت دریافت کرتے۔ کچھ لوگ آگے بڑھ کر مولوی صاحب سے مصافحہ، کچھ معانقہ، کچھ عقیدت سے اُن کے ہاتھوں کو بوسے دیتے اور کچھ قریب لوگ بوسے دینے کے بعد اُستاد غلام شاہ کے دونوں ہاتھوں کو آنکھوں سے مل کر امام صاحب کو عقیدت بھری نگاہوں سے رخصت کرتے۔ امام صاحب کی مخصوص گفتار سنتے ہی گلی گلی میں کھیلنے والے لڑکے بالے اِدھر اُدھر کترا جاتے۔ انہیں پتہ تھا کہ اُستاد غلام شاہ نے کھیلنے کودنے پر اتنا نہیں ڈانٹنا جتنا مسجد میں حاضر نہ ہونے پر سخت سست کہنا اور دوزخ کے عذاب سے ڈرانا ہے۔ رنج علی کی کمزور صحت، تیکھی صورت، سانولی رنگت، کھچڑی داڑھی اور بھیاڑ (مرغ کپاس) سے بنے کاڑھے کے ملگجی کپڑے مخصوص پہچان تھی۔ بہر کیف سے مسکینیت کے ساتھ دھیمی اور دھیمی آواز میں گفتگو کرنے والے رنج علی کی آواز میں خدا نے بہت مٹھاس اور بہت سا سوز بھر دیا تھا۔ رنج علی کی اذان سن کر لوگوں کے کانوں کا تقاضا اور دل کی بے چینی اس طرح ختم ہو جاتی جس طرح آج کے زمانے میں درد اور سکون کی مخصوص گولیوں سے بھی نہیں ہوتی۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی نمازیوں کی چبھتی ہوئی نظروں کے علاوہ عمدہ لباس میں ملبوس تومند امام صاحب کے سوالوں اور اپنی شناخت کے علاوہ مسلک کی بابت بھی تفصیل سے بتانا پڑا۔ ہمارے بیان کے آخری جملے سننے کے بعد امام صاحب کی تیوری پر پڑے بلوں میں مزید کئی بلوں کا اضافہ ہو گیا۔ امام صاحب نے اپنے تحفظات بیان کرتے ہوئے ہماری سلامتی کے پیش نظر دوسری مسجد میں جا کر نماز ادا کرنے کی تاکید فرمائی۔ جواب میں ہم نے امام صاحب سے عرض کیا "ہم اپنی مرضی سے ہرگز یہاں نہیں آئے ہیں" امام صاحب نے چہرے پر ابھرنے والے ناپسندیدہ تاثرات کو لگام ڈالتے ہوئے دریافت کیا "پھر کس کی مرضی سے آئے ہیں؟" "آپ کی مرضی سے" "ہماری مرضی سے؟" "جی جی آپ کی مرضی سے" "حیرت ہے ہم آپ کو جانتے تک نہیں اور آپ....." امام صاحب جملہ ادھورا چھوڑ کر آگے بڑھنے ہی والے تھے ہم نے اُن کے بڑھتے ہوئے قدموں پر حیرت کی بریک لگا دی۔ "حیا علی الصلوٰۃ حیا علی الفلاح کی دعوت آپ ہی کی جانب سے تھی نا.....!" اس بار امام صاحب کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا، بہت کچھ محسوس کرنے کو بہت کچھ ہم نے اُن کے دل، دماغ میں ڈال دیا تھا۔

نماز سے فراغت کے بعد ہماری کیفیت یکسر بدل چکی تھی۔ شعیدہ اور

اُس کی عمر والے جانے کی ضد ذہن سے اس طرح محو ہو چکی تھی جس طرح معصوم بچے سے اُس کی گمی ہوئی چیز' دودھ کی ایک بوند یا مٹھائی کی ایک ڈلی کے عوض محو ہو جاتی ہے۔

"بڑی دیر کر دی تم نے میں بھی تم مجھے ڈار کر اب کے گھر کے بچے گئیں یہی سمجھے ہو" ہمیشہ کی طرح آج بھی شعیدوں کی گفتگو میں طنز و مزاح کی چاشنی عروج پر تھی۔ قبل اس کے کہ ہم شعیدوں کے سوال کا کوئی جواب دیتا اُس سے آگے کی بابت دریافت کرتے شعیدوں نے ماتھے پر پڑی ریشمی زلف کو شان بے نیازی سے لہرا کر بائیں گال کے تل کو آہستہ سے سہلاتے ہوئے کہا "وقت بہت کم بچا ہے جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے میرے پیچھے چلے آؤ" شعیدوں نے جیسے ہی وقت کی قلت کا ذکر کیا' ہماری رگوں میں سست روی سے بہتا ہوا خون ایک طرح سے منجمد ہو کر رہ گیا۔ ہم کن کن کے ہو چکے تھے' گلیوں کا منہ پڑ چکی تھی' دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ سورج مائل بہ زوال تھا پرندے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے مائیں بچوں کی راہ دیکھ رہی تھیں' بہا گھر ہیروں کے تاج کی خدمت کے لئے کمر کس رہی تھیں' بزرگ نماز عشاء کی تیاری میں مصروف تھے' جوانوں میں رات کی آمد کا جوش انگڑائیاں بھر رہا تھا' مولویوں' پنڈتوں' عاملوں' صوفیوں' سنتوں اور سادھوؤں کی خدمت کے دعوے داروں کے لئے آزمائش کی گھڑی تھی۔ ایسے میں ایک بے نوا پنچ جنرل اپنے مستقبل سے بے خبر ہوا کے دوش پر بہے چلا جا رہا تھا۔

اُمید کی ایک کرن' آس کی ایک جیت' خوشی کا ایک دیا سکول کی عمارت کی شکل میں نمودار ہو کر دیتا ہوا کل ہر لیل میں بجا گیا ہمارے سامنے کھڑا تھا "شاباش میرے جوانو! جلدی جلدی چلو اور دوڑ لگاؤ دیکھو ٹھنڈ کے لئے آؤ" (اگلے کے لے آؤ) اپنے اپنے حصے کے آگے گرم کھوڑنے کے بعد جب ہم ستا چکے تو ہیڈ ماسٹر ملک مرزا خان کی پاٹ دار مگر محبت بھری آواز گونجی۔ ہماری واپسی سے پہلے سکول کا پنارا (ماشکی) نیک محمد عرف نیکا عرفی کے ساتھی دونوں گدھوں پر بڑی جستی ٹینکیں پرانے اور بوسیدہ مٹکیں لاد کر سکول کے دو مٹکوں کے لئے پانی بھر لاتا۔ ٹینکیں کے اکثر نیکی جگہ جگہ سے سوراخ زدہ تھیں جن سے پانی رستا رہتا اور نیکا وقتاً فوقتاً ان سوراخوں میں کپڑے کے بچے (ڈاٹ) لگا کر پانی بند کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔

سکول کے مغربی طرف پہاڑی سے ملحقہ تھو (چھوٹا سا تالاب) بھی تھا جسے جنگل کھود کر بنایا گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کا پانی ہمیشہ گدلا اور کالا ہوا کرتا تھا پھر بھی پکی' دوسری تیسری سے لے کر پانچویں تک کے لڑکے کپڑوں' مونڈھوں کے ذریعے ایک دوسرے کو بہاتے ڈبکیاں' اپنی پاکی پر اصرار کرتے ہوئے تختی دھونے اور لیپنے کے بعد ہاتھ بھی اسی کالے اور گدلے پانی سے دھویا کرتے تھے۔ اکثر پہلوں' پہلوں کی تکرار میں کئی بچے آپس میں دھینگا مشتی بھی کر بیٹھتے بہت سے کلاس میں ہونے والی لڑائی کا بدلہ تالاب پر لے لیا کرتے تھے کہ تمام معاملات ماسٹر جیم گل کے سپرد ہوا کرتے تھے۔ کبھی وہ بچوں کی لڑائی کا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا کرتے کبھی انہیں چھڑی کا استعمال' کبھی بچوں کو مرغا بنا کر بھی معاملہ نمٹانا پڑتا۔ بسا اوقات شریر بچوں کو مرغا بنا کر شکایت کنندہ کو اُس کی پیٹھ پر بیٹھنے کا موقع دیا جاتا۔ میری اور بخشا کی کلاس میں اکثر تُو تُو میں میں ہوا کرتی تھی بخشا چونکہ جماعت میں دبدبہ رکھتا تھا اس لئے اپنے معاملات خود نمٹانے کے بجائے ماسٹر جی کی دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ جب کبھی یہ دھمکیاں کارگر نہ ہوتیں تو معاملہ' ماسٹر جیم گل کے پاس شکایت کی شکل میں پیش ہوا کرتا۔ ماسٹر جیم گل بخشا کو کٹر وڈیرو اور معصوم گردانتے ہوئے کئی بار اس کے حریفوں کی مرغا پیٹھ پر بخشا کو بٹھا چکے تھے۔ جب بھی مرد و گردش گھوم پھر کر بخشا کی دوست کی مرغا پیٹھ پر بخشا کئی دن تک اتراتا پھرتا تھا۔ جب کوئی دوست اس سے کسی طرح کا مذاق کرتا' بخشا فوراً ماسٹر جیم گل سے شکایت کی دھمکی دیتا۔ چونکہ بخشا پڑھائی میں بہت لائق تھا اس لئے ماسٹر جیم گل اس کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ اس دن بھی تختی دھوتے ہوئے بات کچھ بھی نہ تھی بس مجھے بخشا کے ماسٹر جیم گل کا منہ چڑھا ہونے اور بے جا اترانے پر غصہ تھا۔ پہلوں' پہلوں کی تکرار ہوئی' غصہ میں ہاتھ بڑھا کر میں نے اُسے تالاب میں دھکا دے دیا۔ تھوڑا گدلا پانی بخشا کی آنکھ ناک' کان کے علاوہ منہ میں بھی جا چکا تھا۔ کپڑوں کے علاوہ بخشا کی چھوٹی سی پگڑی بھی پانی میں گیلی اور کالی ہو چکی تھی۔ بخشا حسبِ سابق ماسٹر جیم گل کے پاس شکایت لے کر پہنچا۔ میرے خلاف شہادتیں پکی تھیں لہٰذا مجھے مرغا بنا کر میری مرغا پیٹھ پر بخشا کو بٹھا دیا گیا۔ سب کچھ میرے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ جیسے ہی ماسٹر جیم گل' ہیڈ ماسٹر ملک مرزا خان کے بلاوے پر دفتر سے نکلے میں دھڑام سے زمین پر جا گرا مجھ سے بھی زیادہ زور سے بخشا دور جا کر گرا جس سے اُسے چوٹ بھی لگی۔ اردگرد کھڑے لڑکوں نے میرے بے ہوش ہونے پر شور مچانا شروع کر دیا۔ ماسٹر جیم گل دوڑے دوڑے آئے اور بخشا کی چوٹوں کو بھول کر ملکوں کے لڑکے کی بے ہوشی پر حواس باختہ ہو گئے۔ جلد ہی ہیڈ ماسٹر ملک مرزا خان' حساب کے ماسٹر دین دیال شرما اور دیگر ماسٹر صاحبان بھی میری چارپائی کی طرف اکٹھے ہو چکے تھے۔ سب کی متفقہ رائے پر' سکول کے چند بڑے اور صحت مند لڑکوں کی مدد سے مجھے گھر پہنچایا گیا۔ اس کے بعد بخشا نے کسی لڑکے کی کبھی شکایت کی نہ ماسٹر جیم گل نے کسی لڑکے کو مرغا بنایا نہ کسی لڑکے کی مرغا پیٹھ پر کسی دوسرے لڑکے کو بٹھایا۔ البتہ! جب بھی ماسٹر جیم گل ہماری کلاس میں پڑھانے آتے میری طرف دیکھ کر عجیب انداز میں غور و فکر میں مبتلا ہو کر زیر لب مسکرانے لگتے۔

"تم تو وقت کے پیدل چلنے کے شوقین ہوا کرتے تھے' نامعلوم کیوں جگہ جگہ رک کر ستانے لگے ہو" شعیدوں کو شاید وقت کی رفتار اور بے رخی کا علم نہ تھا ورنہ وہ اس طرح کی بچگانہ بات ہرگز نہ کرتی۔ "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا ہمارے پاس وقت بہت کم ہے' تم ہو کہ میری بات پر دھیان ہی نہیں دیتے" اس بار شعیدوں کی جانب سے وقت کی کمی کی بابت سن کر ہمارے دل میں کدورت ہوئی نہ حلق میں کانٹے پڑے نہ خون کی رفتار میں کمی آئی۔ ہم نے سوچا جب اس معاہدہ کو قبول کر چکے ہیں تو انجام کی بابت سوچ کر وقت سے پہلے کیوں خون خشک کریں۔ شعیدوں جہاں بے حسی سے خوش اور ہشاش بشاش نظر آتی ہے وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر بضد ہے تو یقیناً اُس کے پیچھے ہماری بہتری اور بھلائی ہوگی۔

چاچا کے کھیت کے ساتھ کنواں دیکھ کر ہمارے قدم خود بخود رکے
گئے۔ ایک کے بعد ایک منظر ذہن کی سکرین پر نمودار ہونے کے لئے پہلیں پہلیں
کی تکرار کر رہے تھے۔ یہاں بھی شعیدوں کی بلند پستی نے ہمیں ہمارے ماضی سے
ہمکلام ہونے نہیں دیا۔ چند قدم کے فاصلے پر چوپال اور اس سے منسوب تھے۔ ہمیں
اپنی جانب بلا رہے تھے۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر مائی چھاں کی جھگی (جھونپڑی)
اور اس سے ملحقہ بیٹھک گز ساؤ اور اس میں پڑی گرم گرم جو ہے میں مکئی کے پھٹ پھٹ
کرتے دانے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر بابا محمد کی ہٹی
(دکان) اور ٹین کے کنستروں میں بھری ریوڑیاں، کھلونے، بتاشے، ٹافیاں، مرونڈے
چھلیاں، مکھانے، مونگ پھلی، تیتر بٹیرے کے چوزے (بچے) ہمیں اپنی جانب کھینچ
رہے تھے۔ شعیدوں کی کمی کی چیز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہر قیمت پر ہم سے آگے چلنے
پر مجبور کر دی تھی۔

دن بھر کی چلچلاتی دھوپ اور شام کی ٹھنڈی ہوا نے اندھیرے کی چادر
اوڑھ کر اپنے زخموں کے گھاؤ اور درد کو پھر سے ہرا کرنے کی ٹھان لی تھی۔ کہیں دیکھے
گھروں میں ملیدے اور چورے گائے جا رہے تھے۔ کہیں رونے والے خیر خواہوں کو داتن
جلا دیا جا رہا تھا۔ کہیں ضدی بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ گڑ کی شکر
اور چھاچھ سے بہلانے کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔ کہیں مدھم ہوتی آگ کو ہوا دے کر
دہکایا جا رہا تھا۔ کہیں دہکتی آگ کو سوا (راکھ) ڈال کر ٹھنڈا کرنے کی جستجو ہو رہی تھی۔
کہیں دن بھر کی تھکن اتارنے کو چسکی ڈالی جا رہی تھی (چارپائی بچھائی جا رہی تھی)۔
کہیں خدا کے حضور حاضری کے لیے وضو کی تکمیل ہو رہی تھی۔ غرض ہر کوئی دن کو اور
رات کی بانہوں میں آسودہ ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔

شعیدوں کی چال مدھم ہوتے ہوتے ایک پرانے اور بوسیدہ مکان کے
سامنے جا کر قطعی طور پر تھم گئی تھی۔ گاؤں کے گلی کوچے تھل تھل (جگمگ) سے
بجلی آ گئی کے باوجود یہ مکان اور اس کے ارد گرد کا علاقہ حافظے کے کسی کونے میں
موجود نہیں تھے۔ مکان اور مکینوں کی بابت معلومات کے علاوہ ہماری خواہش شعیدوں
سے یہاں رکنے کا سبب دریافت کرنے کی تھی مگر شعیدوں کے ماتھے پر پڑی تیوری نے کو
کسی بھی طرح کی جنبش دیے بغیر اور بائیں ہاتھ کی کلائی کو ہلاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے
سے ہمیں مکان کے اندر جانے کے لیے مجبور کر دی تھی۔ اب تک جو حوصلہ اور
جو فرق ہم نے عارضی طور پر طاری کی ہوئی تھی شعیدوں کے اشارے پر اکیلے بوسیدہ
مکان میں جانے کے باعث پل بھر میں غائب ہو چکی تھی۔ ہماری خواہش تھی کہ
شعیدوں ہمارے ہمراہ مکان کے اندر چلے ہم پر جو بھی بیتے، اس کا مداوا نہ بھی
کرے کم از کم اپنی آنکھوں سے ہمارا انجام اور استقامت تو دیکھ لے۔ ہمارے انگ
انگ سے التجا سوال بن کر آنکھوں میں سمٹ آئی تھی جسے ڈھال بنا کر ہم نے نہایت
مسکینیت سے شعیدوں کو اپنے ہمراہ مکان کے اندر چلنے کی ترغیب دی۔ شعیدوں نے
ہماری منت سماجت کے جواب میں اشاروں کی مدد سے ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا
”گھبراؤ مت تمہاری واپسی تک میں یہیں کھڑی ہوں۔“

”چڑی جی خیر تے اسے بڑی دیال اڑ دے ہو“ حافظے کے تمام گھوڑے
دوڑانے اور ماضی کے تمام اوراق کھنگالنے کے باوجود بڑی ہیں کے چہرے میں
شناسائی کی ذرہ بھر رمق نہ پا کر ہمارے چہرے پر وحشت نے مزید گھر کر لیا۔ ”آ جا
بھائی افضل اندر لنگ آ، باہر کیوں کھڑا ہے“ اس قدر مانوس آواز کانوں میں پڑتے ہی
وحشت کی گرد اور خوف کا غبار یک دم نو دو گیارہ ہو گئے۔ بستر میں پڑا ہوا شخص ہڈیوں کا
پنجر ہونے کے باوجود اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”آ بیٹھ میرے نزدیک بیٹھ، تجھے کیا پتا،
میری آنکھیں کب سے تجھے دیکھنے کو ترس رہی ہیں، شاید انہیں تیرا ہی انتظار ہے۔ ہاں
ہاں انہیں تیرا ہی انتظار تھا، اب یہ چین سے .....“ ”تمہاری حالت ایسی خراب
ہو گئی اور تم نے مجھے خبر تک نہ کی تاج“ آواز کی مانوسیت نے اجنبیت کے تمام
دروازے ایک ہی جست میں بند کر کے تاج محمد کو برآمد کر لیا تھا۔

تاج محمد سکول کا سب سے سخی، دلیر، بہادر اور کڑیل جوان تھا۔ تاخیر سے
سکول میں داخل ہونے کے باعث طالب علمی کے دوران اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں
جس سے اسے فائدہ اور نقصان دونوں تھے۔ فائدہ یہ کہ سکول کے تمام لڑکوں پر اس کی
جوانی اور تندرستی کی دھاک ہونے کے باعث کوئی تاج محمد اور اس کے دوستوں کی
جانب آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ نقصان یہ کہ سکول کے ماسٹروں اور ہیڈ ماسٹر صاحب
کو ہر آئے وقت میں تاج محمد کی یاد ستایا کرتی۔

ماسٹر حیات محمد اردو اور اسلامیات پڑھایا کرتے تھے۔ پابند شرع اور
پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ نماز کی ادائیگی کے لیے سکول میں مسجد نہ ہونے کا انہیں بڑا ملال
تھا۔ کئی بار ماسٹر حیات محمد نے ہیڈ ماسٹر ملک مرزا خان سے سکول کے احاطہ میں مسجد نہ
ہونے کا گلہ کیا۔ ہر بار ہیڈ ماسٹر ملک مرزا خان فنڈز کی عدم دستیابی کا عذر پیش کر کے
ماسٹر حیات محمد کی امیدوں کو مایوسی کا لبادہ پہنا دیتے۔ ایک بار یہی مسئلہ ماسٹر حیات محمد
نے ہماری کلاس کے سامنے بڑے دکھ اور افسوس سے بیان کیا۔ ماسٹر حیات محمد خان کا
بیان ابھی نامکمل ہی تھا کہ تاج محمد نے مسجد بنانے کی ذمہ داری اٹھانے کا وعدہ کر لیا۔
تاج محمد کے کھرے پن اور خدمت کا بہت پہلے ہی سے اندازہ کرتا تھا مسجد کے کام پر حقیقت بھی
شامل ہو گئی۔ تاج محمد نے سب سے پہلے اپنے جاں نثار دوستوں کی میٹنگ طلب کی اور
اس کے بعد ماسٹر حیات محمد کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ طے یہ پایا کہ ہر روز صبح
گاؤں سے سکول آتے ہوئے تاج محمد اور اس کے دوست تھوڑی تھوڑی مٹی اٹھا کر لیں
گے جب مطلوبہ مٹی جمع ہو جائے گی تو تمام دوست کھیتوں اور پگڈنڈی کی جانب سے
آنے کے بجائے پہاڑی کی طرف سے آتے ہوئے ایک ایک پتھر بھی اٹھا کر لیں گے۔
تاج محمد کی اس تجویز نے ایسا کام دکھایا کہ کچھ ہی دنوں میں نماز پڑھنے کا چبوترا اینٹ میں
مٹی اور چاروں طرف پتھروں کا کر بنا دیا گیا۔ اسی سکیم کو بروئے کار لاتے ہوئے وضو خانہ
بھی تعمیر ہو گیا۔ اس کے بعد مسئلہ چھوٹی (استنجا خانہ) کا درپیش تھا۔ یہ مسئلہ بھی مٹی
اور پتھر کی دیوار بنا کر حل کر لیا گیا۔ یہاں ایک بات بتاتا چلوں کہ طلبا کو استنجا خانہ استعمال کرنے کی
اجازت نہ تھی۔ سکول کے تمام طلبا حوائج ضروریہ کے لیے اکثر کھیتوں اور پہاڑوں کی
اوٹ کا رخ کرتے جہاں اکثر کیڑے اور سانپ بھی دستیاب ہوتے جنہیں لڑکے پتھروں

کی مدد کے علاوہ مزا، بھوؤں بیٹیوں کی آوازوں سے بھاگنے پر مجبور کر دیتے اور بیشتر ٹولیوں کی شکل میں ہی کھیتوں اور پہاڑوں کا رخ کرتے۔

ایک محکوڈل نے کہا کہ یہ وہ تاج محمد نہیں ہے، یہ وہ تاج محمد ہو ہی نہیں سکتا جو خوش قسمتی، بزرگوں، بچوں، استادوں، دوستوں، معذوروں اور بیماروں پر جان نچھاور کرنے کو ہر دم تیار رہتا تھا۔ کس منہ سے، کس زبان اور کن احساسات کے ہوتے ہوئے اتنے زندہ دل اور جوان مرد انسان سے اس خستہ حالی اور شکستگی کی بابت دریافت کیا جائے؟

"تم تو جانتے ہو پروردگار نے مجھے ایک ہی جذبے، ایک ہی احساس اور ایک ہی تمنا دے کر پیدا کیا ہے۔ اسی جذبے، احساس اور تمنا کو پورا کرنے کی غرض سے سکول کے بعد میں تعلیم کا سلسلہ مزید جاری نہ رکھ سکا۔ تم جس بیک روڈ لگن اور جستجو سے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھے میرے اندر کی طلب اور تڑپ اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے سکول کی تعلیم کے بعد اپنے اندر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے خدمت کے اس میدان کا انتخاب کیا جس پر ملک و قوم کے ساتھ فرشتے اور ملائک بھی رشک کرتے ہیں" گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے تاج محمد نے عارضی بے زبانی کو زبان عطا کر دی تھی۔

"شرم کرو شرم، بڑے نکمے، بال دا ہو دا اے" بابا محمد کا عمر والی کڑی چٹا ہوا لنگڑا لنگڑا کر بھاگتا جاتا تھا اور یہ جملہ بھی دہرائے جاتا تھا۔ درمیان میں کئی بار "چھڈوں گا نئیں" بھی اس کی زبان سے ادا ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف تاج محمد بابا کے آگے بھاگتے ہوئے پیچھے منہ کر کے کہہ رہا تھا "تو وی تے روز جا کے بال ڈھاندا ایں، اج تیرے بال ڈھا ہو گیا تے شور پاندا ایں۔" قصہ دراصل یہ تھا کہ گاؤں کے بچے ایک پیڑ لگا کر سے لے جا کر اپنا چورا کر گندم، مکئی، باجرہ، جوار یا بابا محمد کے پاس دیتے اور اس کے بدلے بابا سے اپنی پسند کی ریوڑیاں، مکھانے، پتاسے، ملوک، مرونڈے، مکھلوایاں، سنگ تریاں وغیرہ خرید لیا کرتے۔ بابا محمد بچوں کے ساتھ ہمیشہ انصاف کرتے ہوئے جنس اور اجناس کے بدلے پوری چیز دیتا جس کا گرو دوستوں کی محفل میں اکثر ہوا کرتا۔ تاج محمد ایک دن کھیتوں سے تھوڑی سی مکئی چن کر اس کے اندر مٹی کا بڑا سا ڈھیلا چھپا کر بابا محمد کے پاس لے گیا۔ مکئی تول کر بابا محمد نے تاج محمد کو بہت ساری مطلوبہ چیز دے کر جونہی تاج محمد کی لائی ہوئی مکئی کو جنس کے کنستر میں ڈالا، دھم کی آواز نے بابا محمد کو چونکا دیا۔ جس وقت بابا محمد نے تاج کی لائی ہوئی مکئی کنستر میں ڈالی اس وقت جنس کا کنستر خالی تھا جس کے باعث دھم کی آواز زور سے پیدا ہوئی اور بابا محمد، تاج کے پیچھے آواز لگاتا ہوا بھاگا مگر تاج محمد بابا کے ہاتھ کب آنے والا تھا۔

"ملازمت ملتے ہی میری خوشی انتہاؤں کو چھونے لگی تھی۔ میری شخصیت اور لباس میں کئی طرح کے کلفی ستارے دیکھ کر میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا۔ میری زندگی میں خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور ڈسپلن دیکھ کر گاؤں والوں کے دلوں میں میری عزت و احترام میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ جو لوگ پہلے مجھے دیکھ کر ہنسی مذاق کیا کرتے تھے، تاج محمد کے بجائے تاجے کے نام سے پکارا کرتے تھے، ان میں سے بیشتر تاج محمد جی کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے"

تاج محمد نے کہانی کے طویل دورانیے کے بعد وقفہ لے کر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو میں خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔ مجھ کو دل میں یہی خیال آتا تھا کیا یہ وہی تاج محمد ہے جو صبح سویرے میرے گھر کے باہر "قفل ہوئے" کہہ کر زور کی ہانک لگایا کرتا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے سکول جایا کرتے۔ جس وقت تاج محمد میرے گھر کے باہر آ کر "قفل ہوئے" کی آواز لگایا کرتا اس وقت سردیوں میں چھٹ پٹے کا وقت ہوا کرتا، گرمیوں میں سورج بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہوتا۔ بابا ملک اس وقت دونوں بھینسوں کا دودھ دوہ (کھنڑا) بالٹی میں دوہ کر لاتا اور بے بے (پھوپھی) کے سپرد کر کے حقے کی تلاش میں مصروف ہو جاتا۔ بابا ملک کے لائے ہوئے دودھ کو بے بے چولہے کی دھیمی آنچ پر گرم کرنے کے لئے رکھ دیتی۔ گرمیوں کی دوپہر میں بابا ملک کا لایا ہوا دودھ کا ڈولا بالٹی روٹیاں پکنے کے بعد تنور کی آگ میں کھولنے کے لئے رکھ دیا جاتا۔ بعد میں ابلے ہوئے دودھ کو چاٹی میں ڈال کر چھوٹی ڈھکن کر (مٹی کا ڈھکنا) جو اس کے اوپر کپڑا باندھ کر گرمیوں میں چھڑ ین (لکڑی کا اسٹینڈ) اور سردیوں میں بھڑولے (باورچی خانہ) کا کارنس پر رکھا کرتے اور شام کا پکا دودھ صبح کا پکا دودھ ملا کر جھاگ مار کر دہی جمایا کرتے۔ تنور گرمیوں کی دوپہر میں گرم کیا جاتا تھا مگر سردیوں میں چولہے کے اوپر مکئی باجرے اور جوار کی روٹیاں "گھاٹی" میں سینک کر پکائی جاتیں۔ روٹیوں میں ڈگے (گڑھے) بنا کر مکھن یا گھی بھرا جاتا اور دوسری روٹی اس کے اوپر اوندھی رکھ کر کپڑے میں لپیٹ کر سر تک (ٹھلا یا پرات) میں ڈھک کر رکھ دی جاتیں۔

جس وقت بابا ملک دودھ کا ڈولا یا بالٹی بے بے کے سپرد کر کے جاتا اس وقت اکثر ہم لوگ بیٹھک میں اور تاج سکول جانے کی تیاری میں مصروف ہوتے۔ اکثر ہمیں ناشتہ کا خیال نہ رہتا، بے بے ہمیں آوازیں دے کر بلاتیں۔ رات کی بچی روٹی جو دہی میں ڈال دی جاتی تھی، کٹھل کر ہم دونوں کو کھانے کے لئے دیتی اور بے بے خود پیڑھی پر بیٹھ کر چاٹی میں لگی مدھانی کی مدد سے چاٹی کے ڈھکن پر ہاتھ رکھ کر مدھانی چلایا کرتی۔ بے بے گھی نکالا کرتیں، نظر لگنے کے خوف سے مکھن (گھی کا ڈبہ) میں چھپا کر رکھا کرتیں۔ اس وقت تک ہم دونوں اپنے اپنے حصے کی روٹی ختم کر چکے تھے۔ بے بے ہم دونوں کے لئے ایک ایک گلاس تازہ لسی لے کر آتیں جسے پی کر ہم دونوں منہ کے چاروں طرف بنے والی سفید مونچھوں کو صاف کرتے ہوئے سکول کی راہ لیتے۔

"ملازمت کے چند سالوں بعد جب آزمائش کی گھڑی سر پر آن پڑی" تاج محمد نے ماضی کا وقفہ دونوں نے خیالات کے وسیع سلسلے کو خیر باد کہہ کر سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔ "آزمائش کیا تھی ہر خوشی و سرمستی کی ایسی کیفیت تھی کہ ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے، بہادری اور شجاعت کی نئی داستانیں رقم کرنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ بیشتر شہید اور غازی بننے کی لگن نے زندگی کو حقیر سے حقیر تر بنا دیا تھا۔ ہماری بابت کمزور اور ناتجربہ کاری کی رائے قائم کرنے والے حیران و پریشان تھے۔ مستقبل کی بابت ان کی سوچ اور حکمت عملی کو ہم نے اور ہمارے جذبوں نے جس طور

ناکام ہو کر واپس آیا تھا اس سے قبل ہی اُن کے سرپرستوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ ہمارے حوصلے اور عزم میں پہلے سے زیادہ استقامت آ گئی تھی۔ اپنوں کی جانب سے بے پناہ داد و تحسین اس حوصلے اور عزم کی تائید کرتی تھی۔ ہم جہاں بھی جاتے جدھر سے بھی گزرتے ہمارے لوگ ہمیں دیکھ کر پرجوش نعروں سے ہمارا استقبال کرتے آگے بڑھ کر ہمیں گلے لگاتے ہم سے ہاتھ ملانے پر فخر کا اظہار کرتے ہمارے ہاتھ چوم کر ہمارے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر عقیدت کا اظہار کرتے ضروریات زندگی کے لئے ہم جب بھی دفتروں، دکانوں، بازاروں، بسوں، اسٹیشنوں، سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں پر جاتے لوگ باگ ہمیں اہمیت و فوقیت دینے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہم پر اعتماد اور احساس ذمہ داری کے جذبات کو اُجاگر کیا کرتے۔"

"پھر وہ چونک گئی اسے تو رتی (دسترخوان) ہو چکی روٹی بنڈ (دو منزلہ لیٹ رہا تھا) ہو چکی اسے آرام حال ہے کے کھانا ٹونگی تاج محمد نے پھولی ہوئی سانسوں کو درست کرنے کے لئے کچھ وقفہ کیا پھر خیالوں کی وادیوں میں پھر سے کھو گیا۔ سکول سے واپسی پر ہمارا معمول تھا کہ ہم تاج محمد کے کھیتوں سے ہوتے ہوئے مزدور گزارا کرتے تھے جہاں تاج محمد کے والد چارپائی پر بیٹھے ہوئے حقہ پیتے اور کاموں (کھیتوں کے مزدوروں) کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ تاج محمد کی والدہ روزانہ کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کا کھانا گھر سے لایا کرتی تھیں جس میں روٹیوں میں تنگے ہاڑی کی لسی کے علاوہ اچار، چٹنی، گڑ، پیاز بھی ہوا کرتی تھی۔ بسا اوقات ہمارے کھانے کے لئے گھر سے لایا ہوا گڑ، پیاز، چٹنی، اچار ہوتا تو تاج محمد کے والد کوئی مزدور کو ہی کے دوسرے کھیتوں میں لگے مولی، گاجر، شلجم، ہری مرچ، پیاز، ٹماٹر وغیرہ توڑ کر لاتے اور پیاز وغیرہ توڑ کر ہمیں کھانے کے لئے دیتے۔ کبھی کبھی نزدیک میں خربوزوں کے کھیتوں کے مالک سے خربوزے مانگ کر بھی ہمیں کھلاتے جاتے خربوزے کے کھیت کے مالک روشن دین کو میٹھے پکے خربوزے کی اس قدر پہچان تھی کہ کبھی کبھی خربوزہ دیتے وقت اس سے پھیکا خربوزہ دینے کی غلطی نہ ہوتی۔ بیشتر تاج کے والد ملک بہرور خان جنہیں تاج بیشتر بابا کہہ کر پکارا کرتا تھا اور تاج کی پیروی میں ہم بھی تاج کے والد کو بابا کہتے تو وہ بہت نہال ہوا کرتے تھے۔

"مشکل سے پانچ چھ سال سکون کے گزرے ہوں گے" تاج کی والدہ نے تاج کی جھولی ادھر کو پھیلاتے ہوئے کہا۔ آرام آرام سے بولتے کہ تاکید کی جس کے بعد تاج محمد ایک لمحے کے بعد وقفہ کر کے بولنے لگا اس دوران وہ کئی بار سانس لے کر سانس کی تنگ سانسوں کو کشادہ کرنے کی کوشش کرتا۔ گفتگو کے یہ طویل اور چھوٹے بڑے وقفوں میں جب بھی ہم نے تاج کی بیماری اور علاج کی بابت تاج محمد یا اس کی والدہ سے دریافت کرنے کی کوشش کی تو تاج محمد کی والدہ نے یہ راز ہمیں بتایا کہ تمام ڈاکٹر، حکیم، مولوی، ملا کو دکھانے، ہر طرح کی دوائی دارو، تعویز گنڈا کرنے پر بھی تاج کی بیماری کا کچھ پتا چل سکا نہ بیماری میں کسی طرح کا افاقہ نظر آتا ہے۔ تاج نے سینے میں گھٹی ہوئی سانسوں کو پھر سے باہر لانے کی کوشش میں چھاتی کو ملتے ہوئے سانس لینے کی کوشش کی اور ہم ماضی کی حسین وادیوں میں کھو گئے۔

"قریب قریب ہر سال بارش کے دنوں میں، گاؤں میں طغیانی آیا کرتی بہت سے لوگ کھیتوں، کھلیانوں، مکل، چھاپوں سے دور گھروں کے ہو کر رہ جاتے۔ سکول چونکہ دریا کے اس پار تھا اس لئے ہم لوگوں کا سکول جانا بھی موقوف ہو جاتا۔ اکیلا تاج محمد ہمارے گاؤں کا ایسا طالب علم تھا جو ہاتھوں اور پیروں میں سنٹرائی (چمڑے کی مشک نما شے) کے بند پھنسا کر سنٹرائی کو سینے سے لگاتا اور منہ کے ذریعے اس میں ہوا بھرتے ہوئے بے خطر پانی میں دور تک تیرتا ہوا نہ صرف سکول کی خیر خبر لے آتا بلکہ کئی کمزور اور ناتواں لوگوں کے بہتے ہوئے اناثے کو بھی ڈوبنے سے بچا کر بہت سی دعائیں لیتا۔

"آزمائش کی ایک اور گھڑی نے ہمارے ذہنوں پر دستک دینا شروع کر دی۔" تیسرے جذبات، احساسات اور آرزوئیں تاج محمد کی بہت سی دیکھی ان دیکھی خوبیوں اور کاموں کو بیان کرنے کے لئے تھیں تھے تاج محمد نے سلسلہ کلام شروع کر کے خوابوں اور خیالوں کے تمام منظر کو پھر سے دھندلا دیا تھا۔ "عمر، تجربہ، حالات اور حیات نے ہمیں کڑے سے کڑے حالات میں ثابت قدم رہنے اور بہادری کے جوہر دکھانے کا عادی کر دیا تھا۔ اس بار بھی ہم شجاعت، بہادری، دلیری اور ایثار کی نئی داستانیں رقم کر کے اپنے آپ سے، اپنے پروردگار سے اور اپنے لوگوں سے سرخرو ہونے کے لئے شدید بے چین تھے۔ حالات اگرچہ اس بار اتنے موافق اور ماحول سازگار نہ تھا اس کے باوجود ہم میں ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہمیں انتظار رہتا اپنے سردار کے اشارے، حوصلے اور رہنمائی کا تھا وقت تیزی سے گزر رہا تھا حالات پل پل کروٹ بدل رہے تھے انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی گئیں نادیدہ خوف آہستہ آہستہ ہمیں اپنے حصار میں لے رہا تھا۔"

"ایک دن" یہاں آتے آتے تاج محمد کی سانسیں رکتی اور آنکھیں بند ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ تاج محمد جو کہنا، سننا اور بتانا چاہتا تھا وہ درمیان میں ہی رہ گیا تھا۔ تاج محمد کے ساتھ ہمارے چہرے کی رنگت بھی انجانے خوف کے باعث پیلے سے زرد ہو رہی تھی۔ "ایک دن" تاج محمد نے گھٹی گھٹی سانسوں اور آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں کو قابو کرتے ہوئے سلسلہ کلام کو پھر سے لفظوں میں ڈھالنا شروع کیا۔ اس روز صبح ہی سے بادلوں پر چیلیں اور چمگادڑیں منڈلانے لگی تھیں، ہواؤں اور فضاؤں میں بارود کی بو محسوس کی جانے لگی تھی۔ بھوک، پیاس، محبت، چاہت، ہمدردی، لگاؤ کے جذبے برف کے گولے کی مانند سرد پڑ چکے تھے زبانوں پر حیرت اور بے توقیری کے تالے پڑ چکے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم اپنی روح کی امانت داری کے بجائے بزدلی اور بے غیرتی کے کفن کیوں اوڑھے جا رہے تھے۔ ہماری جیب کٹ جاتی، ہم گلہ نہ کرتے ہمارا اثاثہ لٹ جاتا ہمیں ہرگز ملال نہ ہوتا، ہمارے گلوں پر چھری پھر جاتی ہم اف نہ کرتے جو کچھ ہم سے چھینا گیا تھا اور جس ذلت آمیز طریقے سے چھینا گیا تھا اُسے بھلا اور بھلا کر زندہ رہنا اور اپنوں کی جدائی کا عذاب سہنا بڑا ہی کٹھن اور تکلیف دہ مرحلہ ہیں لگتا تھا جیسے کسی نے کھینچا کھینچ سے دل نکال لیا ہے۔

تاج محمد کی بگڑتی ہوئی حالت کا تقاضا تھا کہ اُس سے کسی اور موضوع پر گفتگو کی جائے اور اُس کی توجہ ہٹا کر اُس کی صحت کو مزید خراب ہونے سے بچایا جائے "تاج محمد تمہیں وہ واقعہ یاد ہے جب تم نے رمضان کے مہینے میں لوگوں کو رات کے بارہ بجے سحری کرا کر سُلا دیا تھا۔ سحری کے وقت جب بابا واسلا غنی بجاتا ہوا لوگوں کے گھروں کے سامنے سے گزرا تو گاؤں کے لوگوں نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔" تاج محمد نے ہوں ہاں کے ساتھ ہماری بات کو ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات کو پھر سے آگے بڑھانا شروع کیا۔

"ہمارا خیال تھا وطن پر لوگ ہمارا ماحول نا سے، ہار جگہ ہے اور ہار پھول سے استقبال کریں گے مگر اُس وقت میرے دل کو سخت دھچکا لگا جب رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں مہمان کے بجائے مجرم کی طرح داخل ہونا پڑا۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے، شہر اور گاؤں والے ہماری خیریت سے زیادہ ہمارے عمل کی بابت دریافت کرکے طرح طرح کے گھٹیا قیاس کرکے ہمیں ذمہ دار ٹھہراتے اور افسوس ذکر ملال کا اظہار کرتے ہوئے کبھی ہاتھ ملتے، کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور بہت سا اُس نقصان کا ذکر کرکے ہمیں طعنے مار کر رونے لگتے جس کا ہمارا وہم و گمان یا توڑ بھی کسی کے بس میں نہ تھا۔

"محمد حسن تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔" محمد حسن کے نام پر ایک دفعہ تاج محمد نے ہماری جانب حیرت سے دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں بجلی بھی کوندی، دوسرے ہی لمحے وہ پھر سے اجنبی بن چکا تھا۔ "زندگی کی گاڑی اُس کے بعد کسی نہ کسی طور پٹری پر آ چکی تھی۔ لباس کی ہماری تہذیب اور چمک دمک میں اضافے کے ساتھ زندگی کی آسائشیں پہلے کی نسبت بہت زیادہ میسر ہو چکی تھیں۔ لیکن ایک چیز! لوگوں کا پیار، محبت، خلوص، جذبہ، عزت، احترام، عقیدت آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے ناپید ہوتی جا رہی تھی۔ اب نہ ہمیں دیکھ کر کوئی نعرے لگاتا، نہ آگے بڑھ کر استقبال کرتا، نہ مصافحے، معانقے پر آمادہ ہوتا، نہ ہاتھ ملا کر چومنے اور عقیدت سے آنکھوں پر لگانے کی طرف مائل ہوتا۔ حتیٰ کہ اب تو ہمارے لوگ ہمیں دیکھ کر اس طرح آنکھیں پھیر لیتے جیسے وہ ہمارے یا ہم اُن کے مقدس بھائی ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ وہی لوگ جو ہمارے لئے دفتروں، دکانوں، بازاروں، سکولوں، کالجوں، بسوں، اسٹیشنوں پر ہمیں فوقیت اور اہمیت دینے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتے تھے اب وہی لوگ ہمیں دیکھ کر اس طرح اجنبی ہو جاتے جیسے جانتے تک نہیں۔ ہماری کوشش اور خواہش ہوتی کہ کوئی بھولا آدمی آگے بڑھے اور ہمیں پہچانے، ہمیں ہمارا کھویا ہوا استحقاق دے...... مگر...... اب تو......"

"چلو چھوڑو دل چھوٹا نہ کرو۔ تم نے جو کچھ کیا، درست کیا۔ تمہارے پیشے اور ذمہ داری کا تقاضا ہر گز سا طلب کرنا نہیں ہے۔ زمانے کے تیور اور چلن ہمیشہ سے وقت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ تم بھی اس لگی ڈگر زمانہ جان کر درگزر کرو اور......"

"درگزر کر سکتا ہوں، سب کچھ درگزر کر سکتا ہوں، پروردگار عالم نے ہمیں بہت ہی دہشت کی دولت اس قدر فیاضی اور فراخ دلی سے نوازی ہے کہ تخت سے تخت وقت نہیں کر گزر سکتا ہے مگر جو کچھ میرے اوپر گزر چکی ہے اُسے بھلا اور فراموش کرنا میرے بس میں ہرگز نہیں۔" ہماری بات مکمل ہونے سے پہلے تاج محمد نے اپنی بپتا بیان کرنا شروع کر دی۔ جذبات اُس پر اس طرح غالب ہوئے کہ اُس نے ہمیں سوال کی مہلت نہ دیتے ہوئے خود بخود سلسلہ کلام دوبارہ شروع کر دیا۔

"میں تو محض ساجد مراعات کی بیوی کا طالب تھا اس کے علاوہ میں نے لوگوں سے اپنی ذات کے لئے کچھ طلب نہ کیا تھا......" "مثلاً کون سی مراعات......؟"

اس بار تاج کے طویل سانس لینے کے باعث ہمیں سوال کرنے کا موقع مل چکا تھا۔

"سعید کی آمد کے باعث گھر والے، بچوں، والدین کے لئے جوتی، کپڑے، میوہ، مٹھائی، گھی، چائے کی پتی، پھل اور کھلونے وغیرہ پہلے سے خرید کر رکھے تھے۔ گھر اور گھر والوں کی یاد شدت سے ستانے لگی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔ مگر چونکہ آخری وقت میں صاحب کی جانب سے حیدر کا رپورٹ کرنے کے حکم نے خاصا پریشان کیا تھا مگر اپنے جابات لیے اعزاز اور اپنی خدمات کے باعث مجھے ملک واپس جاتے ہوئے شخص پر عوام کے رشک کی تحسین گنگ تھی۔ میرا خیال تھا پہلے کی طرح فوقیت و فضیلت دیتے ہوئے ملک واپس کے ملک کا ہر عوام اپنے مقدس بھائی کو عزت و احترام دیتے ہوئے منٹوں اور سیکنڈوں میں فارغ کر کے اپنے پیاروں سے جلد سے جلد ملنے اور چھوٹے چھوٹے گلے شکوے دور کرنے کا موقع فراہم کریں گے......

اول طویل قطاروں میں کھڑے کسی بھی شخص نے میری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور مجھے اہمیت دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ میری توجہ دلانے پر ان سنی کرتے ہوئے ہر کسی کی یہ کوشش تھی کہ وہ جلد سے جلد لائن میں کھڑے اگلے شخص اور اپنے درمیان کے فاصلے کو کم سے کم کرتے تا کہ میں ان کے درمیان حائل ہو کر اپنی باری پر اصرار نہ کرنے لگوں...... لوگوں کی بے مروتی اور بے اعتنائی پر میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا "لوگو! مجھے پہچانو میں آپ کا مقدس بھائی آپ کے جان، مال، عزت، آبرو کا محافظ ہوں...... وہ دن بھول گئے جب آپ لوگ خوش آمدید اور زندہ باد کے نعروں سے میرا استقبال کیا کرتے تھے...... آگے بڑھ کر گلے لگایا کرتے تھے...... مجھ سے ہاتھ ملانے پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے...... میرے ہاتھوں کو بوسے دے کر آنکھوں سے لگایا کرتے تھے...... دفتروں، دکانوں، بازاروں، بسوں، اسٹیشنوں اور ہسپتالوں میں مجھے فوقیت دے کر فخر محسوس کیا کرتے تھے...... میں وہی ہوں آپ کا مقدس بھائی...... آپ کی جان، مال، عزت، آبرو کا محافظ......

میں چیختا چلاتا رہا کسی نے میری باتوں پر دھیان نہ دیا...... کچھ نے میری جانب سے دوسری طرف منہ پھیر کر...... کچھ نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر...... کچھ نے برملا...... کچھ نے زیر لب...... وہ کچھ کہا تھا...... جسے سننے کی مجھ میں ہمت تھی، نہ تم میں سننے کی تاب ہے...... وقت اور حالات نے...... کس قدر بے رحمی سے...... تقدس کے رشتے کو...... تذلیل کے رشتے میں تبدیل کر دیا......؟؟؟؟؟؟"

قلبِ صمیم

مدحِ مُرسَلِ مختار

عبدالعزیز خالدؔ

وہ دُرِ یتیم یمِ موجِ افکنِ امکاں
پہنائے مکاں جس کی شعاعوں سے درخشاں

دے خود کو نہ گو یونسِ متّی پہ فضیلت
ہے واقعۃً شہپرِ اکلیلِ رسولاں

وہ آخرِ اَرسال ہے وہ اوّلِ اَرواح
یعنی کہ گُلِ سرسبد گلشنِ یزداں

وہ شافعِ محشر ہے لقب جس کا ''مُشَفَّع''
ہوں صبح شمیں ہی سے میں اس کا ثنا خواں

ہر خوبی و ہر خیر کا وہ پیک وہ پیکر
خُوبانِ زمانہ کہیں جس کو شہِ خوباں

رکھے جو نہ ہر شے سے عزیز اس کو تو سمجھو
پس مردِ مسلماں کا ابھی خام ہے ایماں

ہیں نوکِ زباں اس کے جو ہر دمِ دم گفتار
ملتے نہیں اوراق میں وہ معنیٔ پنہاں

اس ساز کوئی غدر پزیر غدۂ تقصیر
اس ساز کوئی مہر و مروّت کا زباں داں

اسلام سے شیطان ہوا جس کا مشرّف
کھینچا رقمِ کفر پہ جس نے خطِ بطلاں

بعثت ہوئی جس کی پئے تکمیلِ مکارم
ظلماتِ جہالت میں کیا جس نے چراغاں

فُحاش نہ سَخّاب نہ عَیّاب نہ مدّاح
افضال و محامد میں جو ہے آیتِ قرآں

ظالم کی نہ کی جس نے کبھی پشت پناہی
بیکس کا طرفدار مددگارِ غریباں

دنیا میں کرے نامِ خدا کی وہ منادی
قول اس کا ہے دعویٰ تو عمل اس کا ہے بُرہاں

میں رہرو درماندہ ہوں وہ صاحبِ منزل
میں تفتہ و تفسیدہ وہ سرچشمۂ حیواں

وہ شاہدِ احوال ہے میں قائلِ اقوال
میں مورِ فرومایہ وہ صد رشکِ سلیماں

مجھ میں کوئی خوبی نہ جبلّی ہے نہ کسبی
اک شخص ہوں میں دربدر و بے سروساماں

ہر موجِ نفس میں گُھلی خوشبوئے حضوری
اس کا سرِ داماں مجھے سرمایۂ غفراں

اظہارِ تشکّر سے مُعَوّر مری آنکھیں
ہوں اس کا ثنا سنج تو یہ اس کا ہے احساں

یہ بھی ہے کرم اس کا کہ اشعار ہیں میرے
مشکوٰۃِ نبوت کی تجلّی سے فروزاں

میں خاکِ رہِ مُرسلِ مُختار ہوں خالدؔ!
وہ خاک اٹھے جس سے خمیرِ دُر و مرجاں!

سخنِ تازہ

سید مشکور حسین یاؔد

اپنی جاں کو جاوداں انداز میں رکھتے ہیں ہم
اور دل کو کُن فکاں انداز میں رکھتے ہیں ہم

یوں تجھے ساتھ اپنے جھلکے ہیں سات آسماں
اس طرح سر کہکشاں انداز میں رکھتے ہیں ہم

برق کی صورت چمکتے ہیں معانی و خیال
آگہی کو ناگہاں انداز میں رکھتے ہیں ہم

توڑتے ہیں سرحدیں ندرت کی تیغ تیز سے
ہر کراں کو بیکراں انداز میں رکھتے ہیں ہم

روک کر چلتی ہوا کو کام میں لاتا ہے وہ
یوں سخن کو بادباں انداز میں رکھتے ہیں ہم

چھوٹی سی مخلوق میں کیا رنگتی ہیں وسعتیں
چیونٹی کو آسماں انداز میں رکھتے ہیں ہم

رفعتِ کون و مکاں قدموں میں ہو کیونکر نہ یاؔد
آسماں کو آستاں انداز میں رکھتے ہیں ہم

O

انور سدید

آرزو تازہ ہوئی کچھ داد پانے کے لیے
اک غزل لکھی نئی اُن کو سنانے کے لیے

دن کو بھی تاریکیاں رہتی مسلط ہیں یہاں
اک دیا درکار ہے اس آستانے کے لیے

جن کی لاشیں ہم اٹھا لائے دیارِ غیر سے
وہ گئے تھے گھر سے کچھ ڈالر کمانے کے لیے

جب کہا اس نے کہ اب میں گوش بر آواز ہوں
پاس میرے کچھ نہ تھا اس کو سنانے کے لیے

ہو اجازت تو اسے رکھ دوں میں سب کے سامنے
اک نئی جو چیز لایا ہوں دکھانے کے لیے

پھر اندھیرا چھا گیا' چاروں طرف انور سدؔید
اس زمیں سے آفتاب نو اگانے کے لیے

O

امجد اسلام امجد

مکیں ہے ایک، مگر گھر بدلتے رہتے ہیں
ترے خیال کے پیکر بدلتے رہتے ہیں

یہاں پہ کوئی بھی رستہ کہیں نہیں جاتا
بھٹکنے والے مسافر بدلتے رہتے ہیں

سمے کے ساتھ بدلتی ہے دل کی کیفیت
ہمیں یہ لگتا ہے منظر بدلتے رہتے ہیں

خود اپنے حال پہ رہتی نہیں ہے یہ دنیا
کہ اپنی سوچ کے محور بدلتے رہتے ہیں!

بدلتی رہتی ہیں ساحل پہ دیکھتی آنکھیں
اور اُن کے ساتھ سمندر بدلتے رہتے ہیں

جو میری آنکھ میں ٹھہرے ہیں ایک سے منظر
حریم خواب میں شب بھر بدلتے رہتے ہیں

سفر میں ریت کے ٹیلوں پہ مت بھروسہ کر
کہ یہ نشان تو اکثر بدلتے رہتے ہیں

مرے خیال کے موسم تمام رنگ اپنے
ترے لباس کی شہ پر بدلتے رہتے ہیں

مشیت اُس کی نہیں ہے کسی کی بھی محتاج
ستارے کب یہ مقدر بدلتے رہتے ہیں!

کبھی کبھی یونہی امجدؔ کسی سبب کے بغیر
ہم اپنی ذات کے اندر بدلتے رہتے ہیں

محمود الحسن

بات کرنے میں بھی فکرِ بیش و کم ہونے لگی
یوں بھی اب رسوائی لوح و قلم ہونے لگی

جب فقیہِ شہر کی فکرِ کرم ہونے لگی
پارہ پارہ اُمّتِ شاہِ اُممؐ ہونے لگی

زندگی کی ہر گھڑی وقفِ الم ہونے لگی
جب دلِ ناداں کو فکرِ بیش و کم ہونے لگی

خاک میں مل جائے گی ہے جو بھی غم کی آبرو
آنسوؤں کے ساتھ جب تفسیرِ غم ہونے لگی

کر چکا ہوں کب سے میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں
آج کیوں بیٹھے بٹھائے آنکھ نم ہونے لگی

ہر کسی کے سامنے پھر سر مرا جھکنے لگا
جب مجھے کچھ خواہشِ جاہ و حشم ہونے لگی

منزلِ جاناں کی جانب جب قدم اُٹھنے لگے
راہِ ہستی اور بھی پُر پیچ و خم ہونے لگی

دیکھ کر صحرائے یثرب میں غلامانِ رسولؐ
پانی پانی سطوتِ دارا و جم ہونے لگی

جب مجھے مفہومِ جنّت کا سمجھ آنے لگا
تیرے کوچہ کی زمیں باغِ ارم ہونے لگی

چشمِ نم محمودؔ جب لے کر گیا اُن کے حضور
ایک پل میں بارشِ لطف و کرم ہونے لگی

O

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہؔ

ویسے تو اب مجھے کسی سے بھی گِلہ نہیں
پر دل میں بات رکھنے کا بھی حوصلہ نہیں

اُس نے کہا تھا آؤنگا پرسوں کے روز میں
یہ اُس کا فیصلہ تھا، میرا فیصلہ نہیں

سحر سے شام ہو چلی آیا نہیں ابھی
ملنے کا بنتا اب کوئی معاملہ نہیں

تنہائی کے احساس سے برسوں جلا ہے دِل
اپنے پن کا اب تو کوئی بھی سلسلہ نہیں

کارِ جہاں دراز میں اُلجھے ہیں اس طرح
اب تو کسی کو کوئی بھی پہچانتا نہیں

تنہائی کے احساس میں ہم شام و سحر جئے
اشکِ بے اختیار کو ملا راستہ نہیں

اے تشنہؔ بہرطور گزر جا تُو دہر سے
تسکینِ دل کا یاں کوئی معالجہ نہیں

O

سروؔ رانبالوی

جنونِ عشق میں حاصل ہوئی جب آرزومندی
تو جل اُٹھی دیارِ شوق میں شمعِ خردمندی

بہاریں لوٹ آئی ہیں گلستانِ تمنا میں
ہوئی خونِ جگر سے جب بھی لالے کی حنا بندی

تعیّن کی حدوں کو توڑ کر آگے نکل آیا
مرا جوشِ جنوں کب مانتا ہے کوئی پابندی

حجابوں سے نکل کر خود سرِ بام آ گیا ہے وہ
بالآخر رنگ لائی ہے ہماری آرزومندی

حریمِ حُسنِ معنی کے عجب انداز ہوتے ہیں
بکھر رہ گیا ہے پل میں سامانِ خردمندی

صلیب اپنی اُٹھا کر خود سرِ مقتل چلے آئے
کبھی مانی نہیں ہے عشق نے کوئی بھی پابندی

رگِ جاں رکھدی ہم نے ظلم کی شمشیر پر بڑھ کر
ہمیں جس وقت حاصل ہو گئی تیری رضامندی

سروؔ رانبالوی اُس کی رضا سے منہ نہیں موڑا
تو حاصل ہو گئے ہیں تجھ کو الطافِ خداوندی

O

ڈاکٹر صابر آفاقی

جو جامِ صافی میں رنگِ ملال ڈالتے ہیں
بسے بسائے گھروں پر وبال ڈالتے ہیں

ہماری جیب میں کچھ بھی نہیں ہے دینے کو
گدا کے کاسے میں تازہ خیال ڈالتے ہیں

تمام عمر ہی فکرِ وصال میں گزری
سو اس خیال کو دل سے نکال ڈالتے ہیں

سخن میں رنگ جو قوسِ قزح کے جھلکے ہیں
ہم اک حسین کا عکسِ جمال ڈالتے ہیں

منانی ہوتی ہیں نفرت کی ظلمتیں جب بھی
ہم ایک شعر فضا میں اچھال ڈالتے ہیں

کسی جواب پہ ان کو یقیں نہیں آتا
لکھیں وہ جو بھی نشانِ سوال ڈالتے ہیں

جنہیں ہے تندیِ طوفاں کا خوف آفاقیؔ
وہ بے وقار سرابوں میں جمال ڈالتے ہیں

O

رند ساغری

موسم کا بوجھ فصل نے ڈھویا نہیں ابھی
پھلدار جو درخت تھا بویا نہیں ابھی

گہرے سمندروں پہ شفق پھوٹنے کو ہے
دن پانیوں میں ہم نے ڈبویا نہیں ابھی

مُٹھی میں ریت، ریت میں احساس کا طلسم
تشنہ لبی نے ضبط کو کھویا نہیں ابھی

زخموں کا کرب رنگتی تنہائیوں میں ہے
وہ قہقہہ مزاج تھا رویا نہیں ابھی

سوکھی پڑی ہیں آنکھ کی ویران سرحدیں
مدت ہوئی وہ پھوٹ کے رویا نہیں ابھی

اس شخص کا نصیب تھا ہجرت کا اضطراب
گھر سے چلا تو راہ میں سویا نہیں ابھی

کتنا شفیق ہے یہ سمندر نہ پوچھئے
گرداب میں سفینہ ڈبویا نہیں ابھی

جس کی مہک سے رات میں کچھ تازگی ہے رندؔ
گلدان میں وہ پھول سجایا نہیں ابھی

O

اکبر حمیدی

اک شور ہے ہجومِ خریدار کی طرح
ہم آنے والے کل کے ہیں اخبار کی طرح

آنکھوں میں اور بات ہے ہونٹوں پہ اور بات
ہے کوئی میرے یار طرحدار کی طرح

کس حوصلے سے ہجر کے صدمے اٹھائے ہیں
مَیں جی رہا ہوں عاشقِ جی دار کی طرح

خود ہی وہ زخم کھا کے سرِ خاک جا گرا
جس کی زبان چلتی تھی تلوار کی طرح

بیرونِ در ہی رکھی ہیں سب وضع داریاں
محفل تو اس کی ہے مگر دربار کی طرح

سب اپنے اشتہار لگانے کو آئے ہیں
مَیں بھی ہوں جیسے اک بڑی دیوار کی طرح

اکبر کی نہیں ہے طرفداروں کی مگر
لیکن ہیں سب غریب طرف دار کی طرح

o

غلام مرتضیٰ راہی

کیسے یہ کہوں اثر نہیں ہے
پتھر کا مرا جگر نہیں ہے

ترتیب سے حُسن ہے جہاں کا
اک چیز اِدھر اُدھر نہیں ہے

اربابِ علم و آگہی کو
ہمسائے کی کچھ خبر نہیں ہے

کافی تھا جہاں اشارہ پہلے
کہنے کا بھی اب اثر نہیں ہے

رکھے وہ لحاظ فاصلے کا
کم زور مری نظر نہیں ہے

اک دار پہ ہے تو ایک در پہ
کاندھوں پہ کوئی بھی سر نہیں ہے

سمجھو کہ قیام ہے سفر میں
دنیا ہے سرائے گھر نہیں ہے

o

غالب عرفان

ہر گام' یہ ہر لحظہ' ہر باہر اُلجھتا ہے!
مجھ سے مرے باطن کا خوددار اُلجھتا ہے

اُس پار مرے دل کا دریا جو لگے اچھا
اُتروں تو یہی دریا اِس پار اُلجھتا ہے

خوشبو کے تعاقب میں محتاط رویہ کیوں
گلشن میں تو دامن سے ہر خار اُلجھتا ہے

اُس عشق کا صورت گر کیسے کوئی ہو پائے
جس عشق سے تخلیقی فنکار اُلجھتا ہے

میں اونچی چٹانوں سے نیچے اتر آؤں تو
شہرت کی بلندی کا کہسار اُلجھتا ہے

قانون ہو لفظوں کا یا لفظ ہوں قانونی
بحثوں میں عدالت کا کردار اُلجھتا ہے

لڑتا ہوں اماؤں سے میں دن کے اجالے میں
جیسے شبِ کلفت سے بیمار اُلجھتا ہے

آئینۂ عرفاںؔ میں سچائی کی صورت سے
ہر خوف مرا یونہی بیکار اُلجھتا ہے

O

خیال آفاقی

کسی کو کیا بتائیں ہم کہ یہ سوزِ نہاں کیا ہے
سراسر آتشِ سیّال ہے' اشکِ رواں کیا ہے

زمیں کیا ہے' امیں ہے میرے اجزائے پریشاں کی
مری آہوں کا مسکن ہے' نہیں تو آسماں کیا ہے

جو صورت میں عیاں ہے دیکھ لیتی ہیں اسے آنکھیں
کسی کو کیا خبر سینے میں کیا' دل میں نہاں کیا ہے

ابھی رو کر چکا ہوں' زحمتِ پرسش نہ کر ہمدم
یہی دو اشک ہیں بس اور اپنی داستاں کیا ہے

محبت ابتدا ہے' انتہا بھی ہے محبت ہی
تو پھر کیا سوچنا اے دل' یہاں کیا ہے' وہاں کیا ہے

ابھی تو اپنے افسانے سے ہی فرصت نہیں مجھ کو
پھر اس کے بعد دیکھوں گا تمہاری داستاں کیا ہے

کہاں کے رنگ و بوٗ کیسا اُجالا' کیسی آوازیں
مرے ہونے تلک ہیں سب' حقیقت میں جہاں کیا ہے

ہر اک پل ہے فنا جیسے قیامت ہے ہر اک لحظہ
ہمارے واسطے یہ ایک مرگِ ناگہاں کیا ہے

خیالؔ اک نام کی تختی لگا لینے سے کیا حاصل
مکیں ہی جب نہیں گھر میں تو پھر خالی مکاں کیا ہے

حمیدہ معین رضوی

پلکوں پہ چراغوں کو جلائے ہوئے ہم ہیں
شانوں پہ صلیبوں کو اٹھائے ہوئے ہم ہیں

بے مہری حالات کا شکوہ بھی کریں کیا
اِس دور پر آشوب کے مارے ہوئے ہم ہیں

جو قافلہ دیدہ وراں گزرا کبھی تھا
گرد اس کی ہی چہروں پہ سجائے ہوئے ہم ہیں

باطن میں ہے مقتل کا سماں اور بظاہر
چہروں سے ہر آزار چھپائے ہوئے ہم ہیں

تھا خوف سدا لوٹ کر آ جائے نہ اک دن
وہ یاد جسے دل سے بھلائے ہوئے ہم ہیں

ان دیکھا ارادہ ہے تعاقب میں نہیں سمت
اک شہر ہیولوں کا بسائے ہوئے ہم ہیں

قدروں کے نصابوں میں خسارہ ہی لکھا ہے
اب دل سے خساروں کو لگائے ہوئے ہم ہیں

اس دشتِ صعوبت میں سفر ہی ہے مقدر
اک عہد صداقت کو نبھائے ہوئے ہم ہیں

میں کہتی ہوں اسلاف کی عظمت کا بھرم رکھ
وہ کہتے ہیں مغرب کے پڑھائے ہوئے ہم ہیں

فراغ روہوی (کولکتہ، بھارت)

کسی کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے مجھ کو
ہزار غم دے مگر اُن کا توڑ دے مجھ کو

کہیں نہ اور کوئی توڑ پھوڑ دے مجھ کو
کسی کڑی کا میں حصہ ہوں، جوڑ دے مجھ کو

میں وہ سکوت ہوں جو مدتوں نہیں ٹوٹا
صدائے حشر اُٹھے، اُٹھ کے توڑ دے مجھ کو

کیا ہے منصبِ دریا پہ جب مجھے فائز
سُلگتے دشت کی جانب بھی موڑ دے مجھ کو

مری رگوں میں محبت نہ زہر بن جائے
کوئی نچوڑ سکے تو نچوڑ دے مجھ کو

مرے مزاج کو سختی نہ راس آئے گی
جو موڑنا ہے سلیقے سے موڑ دے مجھ کو

غبارِ قلب کا چھٹنا بہت ضروری ہے
کبھی سسکتا ہُوا بھی تو چھوڑ دے مجھ کو

کوئی تو اتنا سُنے سسکیوں کے بیچ فراغ
کہ اُس کے کرب کی شدت جھنجھوڑ دے مجھ کو

O

حفیظ انجم کریم نگری

تا تنی ہے بہت آجکل دماغوں میں
یہ کس نے گھول دیا زہر اب فضاؤں میں

ہمارے طفل بھلا کیسے سیکھ پائیں گے!
وفا کا ذکر نہیں آجکل نصابوں میں

ہمارے واسطے مندر بھی ہیں مسجد بھی!
ہماری روزی ہے روٹی ہے کارخانوں میں

مری کتاب کو چھو کر چلا گیا کوئی!!
مہک اُسی کی ہے دیکھو مری کتابوں میں

ہر ایک فرد کا دعویٰ ہے میں ہی سب کچھ ہوں
عجیب جنگ چھڑی ہے یہاں خداؤں میں

بڑا عجیب لگے گا تمہیں بھی سننے میں
قرار ڈھونڈ رہا ہوں میں بیقراروں میں

اے دوست تجھ سے بچھڑ کر بہت اکیلا ہوں
کہاں چھپا ہے بتا دور تو خلاؤں میں

اندھیرے اور بھیانک سے ہونے والے ہیں
چلے بھی آؤ ادھر نقرئی اجالوں میں

تمہارے دعوے دلائل میں من گھڑت بلکل
نہیں ہے پارسا کوئی بھی پارساؤں میں

یہ کیسا بیٹا ہے رہتا ہے دور ماں سے الگ
یہ ماں ہے یاد کیا کرتی ہے دعاؤں میں

ہمیں وہ غیر سمجھنے لگا ہے کیوں انجم!!!
کبھی تھا نام ہمارا بھی جاں نثاروں میں

دِل نواز دِلؔ

اُس سے دِل کی بات کیوں کرنے لگا
دن میں اَب میں رات کیوں کرنے لگا

میں نے جنگل تو نہیں کاٹا کوئی
پھر وہ مجھ سے گھات کیوں کرنے لگا

میں نے بارش کی دعا مانگی نہیں
اَبر پھر برسات کیوں کرنے لگا

جس نے رَہ پر ڈال رکھا ہے اُسے
اُس کو میرے ساتھ کیوں کرنے لگا

ہاتھ میرے تو بندھے ہیں دیکھ لے
پھر تُو مجھ سے ہاتھ کیوں کرنے لگا

میں نے تُجھ سے کب کوئی حیلہ کیا
پانچ پھر تُو سات کیوں کرنے لگا

پوچھ اُسے تفریطِ زر سے اَب تُہی
زَر کی وہ افراط کیوں کرنے لگا

وَقت کا احساس ہے اُس کو نہ وہ
رائیگاں اَوقات کیوں کرنے لگا

اُس کو اَوچھی حرکتوں سے چڑ ہے تُس
ایسی وہ حرکات کیوں کرنے لگا

جو خرابی کی خبر رکھے خراب
وہ بھلا حالات کیوں کرنے لگا

جس نے جِتوایا ہو اُس کو عمر بھر
اُس کو اَب وہ مات کیوں کرنے لگا

پیڑ کے سایے میں جو بیٹھا ہے وہ
پات پات اک پات کیوں کرنے لگا

مَیں نے اُس کی ذات کب پوچھی تھی دِلؔ
وہ مری گُم ذات کیوں کرنے لگا

سید خورشید انور رضوی

چاند اب بھی تو چمکتا ہے مرے آنگن میں
جانے کیوں پھر یہ اندھیرا ہے مرے آنگن میں

جانے والا تو نہ کوئی بھی پلٹ کر آیا
پھر یہ کس شخص کا سایا ہے مرے آنگن میں

کس کی چیخوں کی ہے آواز ہوا کے اندر
کون اس درد سے روتا ہے مرے آنگن میں

پھر گئی آس اے دلدار ترے آنے کی
جب بھی کاگا کوئی بولا ہے مرے آنگن میں

جو بھی آئے گا اِدھر اس کا ثمر کھائے گا
اک محبت کا جو پودا ہے مرے آنگن میں

آج پھر یاد کے گلشن میں کوئی پھول کھِلا
آج پھر پیار کی برکھا ہے مرے آنگن میں

O

صابرؔ عظیم آبادی

ہر شخص آنسوؤں سے یہاں بھیگ جائے گا
جو وقت آ رہا ہے تماشا دکھائے گا

اس زیست کے سفر میں کبھی میرے ہم سفر
کس کو خبر تھی ساتھ ترا چھوٹ جائے گا

بت خانۂ گماں کو گرا دو زمین پر
ورنہ یہ وسوسوں کا چمن لہلہائے گا

سہمے ہوئے ہو کس لیے ہمت سے کام لو
ڈرتے رہو گے تم تو زمانہ ڈرائے گا

جو خود ہی عیب سے ہو بھرا سر سے پاؤں تک
آئینہ ایسا شخص مجھے کیا دکھائے گا

کہہ دو کسی سے دل نہ لگائے کوئی یہاں
اندر سے ورنہ وہ بھی بہت ٹوٹ جائے گا

منزل پہ اپنی پہنچے گا صابرؔ یہاں وہی
اس بھیڑ میں جو راستہ اپنا بنائے گا

O

علی آذر

سودا یہ کیسا سمایا ہے تمہارے سر میں
رب کے ہوتے ہوئے جھکتے ہو زمانے بھر میں

ہو نہیں سکتی زمانے میں پھر عزت اُس کی
جب کسی شخص کی عزت نہ ہو اُس کے گھر میں

کبھی اس بات پہ بھی غور کیا اے ہم دم
ایک طاقت چھپی ہوتی ہے ہمارے ڈر میں

تیرا یہ فرض ہے کہ تُو مجھے خوش حال رکھے
اور تُو رکھتا ہے ہر وقت مجھے ٹھوکر میں

جب بھی ہوتا ہے گزر دیکھتا ہوں شوق سے میں
کتنی بکھری ہوئی یادیں ہیں پُرانے گھر میں

اتنا مایوس نہ ہو، رزق تجھے بھی دے گا
رزق پہنچاتا ہے، کیڑے کو بھی جو پتھر میں

اڑ نہیں پایا تو یہ میری ہی کوتاہی تھی
علی آذر کوئی خامی نہ تھی میرے پَر میں

O

سیفی سرونجی

یہ مت سمجھنا کہ چپ چاپ سو رہا ہوں میں
خود اپنی راہ میں کانٹے تو بو رہا ہوں میں

ہنسو ہنسو کہ یہ کپڑے بھگو رہا ہوں میں
تمہارے خون کے دھبوں کو دھو رہا ہوں میں

دلوں کے درمیاں دیوار کھنچ نہ جائے کہیں
اسی لئے تو اکیلے میں رو رہا ہوں میں

تمام شہر تو بے فکر سو رہا ہے مگر
نجانے کس لئے بے چین سو رہا ہوں میں

مجھے خبر ہے یہ ممکن نہیں مگر پھر بھی
بکھر چکے ہیں جو موتی پرو رہا ہوں میں

زمین بک گئی گھر میں بھی کچھ نہیں سیفی
مگر یہ شوق کتابوں میں کھو رہا ہوں میں

O

ارمان نجمی (یو۔کے)

گھنی آبادیوں کی بے امانی کا تماشا کر
نکل کر گھر سے مرگِ ناگہانی کا تماشا کر

صفِ ماتم بچھی ہے بے نوا آفت رسیدوں کی
اذیت سے گذرتی لامکانی کا تماشا کر

جو زندہ آگ میں ڈالے گئے لاشیں نہ گن اُنکی
جو بچ نکلے ہیں اُنکی سخت جانی کا تماشا کر

جو تخت و تاج کے مالک ہیں کیا وہ معتبر بھی ہیں
شر انگیزی میں ڈوبی حکمرانی کا تماشا کر

نئی تاریخ کے صفحوں پہ لکھا جا رہا ہے کیا
حروفِ قہر کی آتش فشانی کا تماشا کر

جو دل میں ہے اسے ناگفتہ رہنے دے تو بہتر ہے
بدلتی صورتِ حرف و معانی کا تماشا کر

نہ کوئی خواب باقی ہیں نہ آنسو خشک آنکھوں میں
تہی دستوں کی گم صم نوحہ خوانی کا تماشا کر

ہر اک شب شکر کرتی ابھی گردن سلامت ہے
ہر اک دن سیلِ خوں کی بیکرانی کا تماشا کر

قیامت سر تک آ پہنچی ہے رکھ لے ہاتھ آنکھوں پر
متاعِ زندگی کی رائیگانی کا تماشا کر

مشتاق شبنم

درونِ ذات سے آگے کہاں گئے ہملوگ
کہ گردِ ذات رہے ہیں جہاں گئے ہملوگ

ترے سلوک و طلب کی نہ کی کبھی پروا
ہتھیلیوں پہ لئے نقدِ جاں گئے ہملوگ

نہ پوچھ مجھ سے زمانے نے کیا سلوک کیا
جو راہ تو نے دکھائی وہاں گئے ہملوگ

جو آئے ہم تو لبوں پر تبسّموں کی طرح
گئے تو جیسے برنگِ فغاں گئے ہملوگ

تلاش کرنی تھی دنیا نئی نئی ہم کو
سرِ فلک بھی لئے کارواں گئے ہملوگ

جو رہنما ہوئی جذباتیت کی اندھی طلب
تو خود بخود سوئے ایذا رساں گئے ہملوگ

فتور کس کے رویے کا تھا کہ اے شبنم
خنک فضاؤں سے شعلہ بجاں گئے ہملوگ

O

حصیرؔ نوری

میں کہ پانی ہوں کسی ڈھلوان سے اترا ہوا
اس جگہ ہیں پستیاں، میں ہوں جہاں ٹھہرا ہوا

اس کے لب پہ آخرش سچائی کیسے آ گئی
جو مفادِ ذات میں رہتا ہے خود الجھا ہوا

اپنے شعلوں کی تپش سے جلنے والو سوچنا
آ رہا ہے قہر کا موسم صدا دیتا ہوا

نقش پا کیوں چھوڑ جاتا ہے دیارِ خواب میں
نصف شب کو نیند میں پیکر کوئی چلتا ہوا

آئینہ اوصاف ہوں اے وحشتِ دل کیا کروں
آ رہا ہے میری جانب سنگ زن بڑھتا ہوا

بے محابا کھل کے ہر اک شخص سے ملتا ہوں میں
میری اس سادہ دلی کا شہر میں چرچا ہوا

اپنی پرچھائیں سے میں ڈرنے لگا ہوں اے حصیرؔ
کیا کروں کہ میرا دشمن خود مرا سایہ ہوا

O

انور جاوید ہاشمی

تمہارے عشق نے پاگل کیا تھا رقص کرتے ہیں
مچا کر شور کر کے تھیا تھیا رقص کرتے ہیں

ضرورت آدمی کو جب سرِ بازار لاتی ہے
دکھا کر مال بیٹے اُلٹا سیدھا رقص کرتے ہیں

ستارے آسماں کے اور زمیں پر پھول گلشن کے
مناظر اور بھی فطرت کے کیا کیا رقص کرتے ہیں

ہوا، خوشبو، پرندے، چاندنی، تنہائی، سرگوشی
ہم ایسی کیفیت میں رہ کے تنہا رقص کرتے ہیں

سبھی مشتاق ہوں یہ بات ممکن ہو نہیں سکتی
سلیقہ جن میں ہوتا ہے وہ اچھا رقص کرتے ہیں

O

عزم بہزاد

یہ کون سر پہ اُٹھائے عذاب تنہائی
ہر اک سے پوچھ رہا ہے جواب تنہائی

وہ اور ہوں گے جنہیں دوسروں نے ہجر دیا
یہاں تو خود ہی کیا ارتکاب تنہائی

نہ جانے کب سے مرے روز و شب کا حصہ ہیں
نفس کی تیز روی اور حساب تنہائی

برائے حفظ بڑی حسرتوں سے دیکھتے ہیں
یہ گشت گانِ رہ و رسم خواب تنہائی

کبھی تو عزمؔ کوئی لغزشِ وصال بھی کر
بہت سمیٹ چکا تو ثواب تنہائی

احمد ظہور

عرش سے جاری پھر حکمِ کن فکاں ہونے کو ہے
پھر زمیں کوئی کسی کا آسماں ہونے کو ہے
ٹوٹنے والا ہے تفریقِ مذاہب کا طلسم
دینِ حق سے آشنا سارا جہاں ہونے کو ہے
جنگ ہوگی اب نہ کوئی مذہبوں کے نام پر
متحد اس بات پر سارا جہاں ہونے کو ہے
ٹوپیوں اور چارجوں کی مصلحت اپنی جگہ
حرمتِ انساں منشورِ زماں ہونے کو ہے
مادرِ تقدیس ہے پھر دردِ زہ میں مبتلا
کوکھ سے اس کی نیا پیدا جہاں ہونے کو ہے

O

جاوید رحمانی

اس نے ٹھکرایا نہیں تہمت آبادی ہے
ہم نے بھی پنجرے کی دیوار ہر اک ڈھادی ہے
اس نے اندازۂ وحشت کا تہیہ کر کے
ہم کو میدان بھی بخشا تو یہ دنیا دی ہے
اس کی پلکوں سے بھی دو آبہ بہا کرتا ہے
میری آنکھوں کے سمندر نے صدا کیا دی ہے
ہم بھی قائل نہ تھے تقدیر کے تم سے پہلے
اب کھلا ہم پہ کہ کتنی ہمیں آزادی ہے
اب ترے نام کی تہمت سے بہت دور ہیں ہم
تو نے کیسی یہ سزا جانِ تمنا دی ہے
وہ مرے پاؤں میں زنجیر کہاں تک ڈالے
تا بہ زنجیر بھی کیا کم ہمیں آزادی ہے

طالب انصاری

اتر نہ جائے کہیں یہ خمار آخری ہے
اب آ بھی جا کہ ترا انتظار آخری ہے

پھر اس کے بعد یہ موقع ملے ملے نہ ملے
سو اس کو پہلے چلوں گا جو وار آخری ہے

ہر اک شکست کو اس عزم سے قبول کیا
میں جیت جاؤں گا آخر یہ ہار آخری ہے

بچا کہ میں ہی اکیلا بچا ہوں لشکر میں
صفِ عدو میں بھی لیکن سوار آخری ہے

سپاہِ ملکِ سلیماں اسے گزرنے دے
قطارِ مورِ نحیف و نزار آخری ہے

چمن سے میں بھی کوئی برگِ سبز لے آتا
مجھے پتا ہی نہیں تھا بہار آخری ہے

ذرا سی دیر میں یہ بھی نہیں رہے گا یہاں
پرند ایک سرِ شاخسار آخری ہے

اب اس کے بعد ملوں گا تمہیں بیاباں میں
طوافِ جلوۂ لالہ عذار آخری ہے

ابھی تو اور بھی مجھ کو فریب کھانے ہیں
یہ مت سمجھ کہ ترا اعتبار آخری ہے

سیف الرحمٰن سیفی

ہمارا دل جسے مانے وہی حقیقت ہے
یہ کائنات وگرنہ تو اک حکایت ہے

ترے حوالے سے کرتے ہیں گفتگو مجھ سے
یہ میرے گھر کی مرے بام و در کی حالت ہے

عجیب سادہ ہیں بستی کے شب گزیدہ لوگ
سمجھ رہے ہیں اُسے روشنی جو ظلمت ہے

گھروں سے کم ہی نکلتے ہیں لوگ گلیوں میں
کئی دنوں سے مرے شہر کی یہ حالت ہے

تم آتے جاتے رہو ایک دوسرے کے پاس
سخنورو! یہی مل بیٹھنے کی صورت ہے

قلم کی نوک سے بہتا ہے خونِ دل سیفیؔ
یہ شاعری بھی مری جاں عجب مشقت ہے

O

پرویز ساحر

مثالِ آئنہ حیران کرکے دیکھ مجھے
کبھی تُو میری طرح آنکھ بھر کے دیکھ مجھے
عجب نہیں کہ مَیں تجھ کو دکھائی دینے لگوں
کبھی تو عرشِ انا سے اُتر کے دیکھ مجھے
کوئی بھی مجھ سا مگر رازدارِ حُسن نہیں
مَیں تیرا آئنہ ہوں بَن سنوار کے دیکھ مجھے
پھر اُس کے بعد مجھے جاننے کا دعویٰ کر
تُو کوئی دِن مرے اندر اُتر کے دیکھ مجھے
مَیں تیرا چاہنے والا ہوں کوئی غیر نہیں
خدارا یُوں نہ مری جان! ڈر کے دیکھ مجھے
یہ کیا کہ سرسری سی اِک نگاہ اِدھر کر دی
جو دیکھنا ہے تو ساحرؔ ٹھہر کے دیکھ مجھے

ہما اعظمی

خوشی کے سانچے میں غم رہیں گے مگر تم اپنا خیال رکھنا
صدف کے سانچے بھی نم رہیں گے مگر تم اپنا خیال رکھنا
جو زندہ رہنا تپش میں رہنا نہ سائباں تم تلاش کرنا
جو سایہ گم ہو تو ہم رہیں گے مگر تم اپنا خیال رکھنا
جو تتلیوں کی طلب میں تم بھی مری طرح سے جھلس رہے ہو
وہ نقش چہرے پہ ضم رہیں گے مگر تم اپنا خیال رکھنا
زمانے بھر کے دکھوں کو تم نے جو میرے سینے میں بھر دیئے ہیں
انہیں سے روشن قلم رہیں گے مگر تم اپنا خیال رکھنا
کسی کے در پہ جھکی ہو تم بھی کسی کی خدمت بھی کی ہے لیکن
ابھی تو دل کے بھرم رہیں گے مگر تم اپنا خیال رکھنا
ہماؔ زبانِ شاعری سے جو درد اپنے بتا رہی ہو
وہ لفظ دل پہ رقم رہیں گے مگر تم اپنا خیال رکھنا

'اردو زبان اور لسانیات'
گوپی چند نارنگ کا موقف

ڈاکٹر مشتاق صدف (میرٹھ، انڈیا)

پروفیسر گوپی چند نارنگ گزشتہ پچاس برس سے تنقیدی و تحقیقی اور لسانیاتی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ چھٹی دہائی میں ان کی تین کتابیں 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'، 'اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی' اور 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' شائع ہوئیں جبکہ وسکانسن میں قیام کے زمانے میں Readings in Literary Urdu Prose پر کام کیا۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دور میں 'املا نامہ'، 'پرانوں کی کہانیاں' اور راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور بلونت سنگھ پر انتخابات تیار کیں نیز یک موضوعی بین الاقوامی سیمناروں پر خصوصی توجہ دی۔ اسی عرصے میں ان کی قابل قدر کتابیں 'اردو افسانہ: روایت اور مسائل'، 'انیس شناسی'، 'اقبال کا فن' اور 'لغت نویسی کے مسائل' منظر عام پر آئیں۔ آٹھویں دہائی میں 'امیر خسرو کا ہندوی کلام'، 'سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ' اور 'اسلوبیاتِ میر' کا ذکا ہوا۔ بعد ازیں 'ادبی تنقید اور اسلوبیات' اور 'تاریخی اساس تنقید' نے اردو تنقید کو ایک نئی جہت بخشی۔ نویں دہائی میں 'ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات' اور 'اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ' نے ایک بار پھر اردو ادب کو نئی کشادگی عطا کی۔ اسی طرح ان کی انگریزی کتاب Urdu Language & Literature : Critical Perspectives جو اسٹرلنگ سے چھپی، نے نئی سوچ کو فروغ دیا۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے جاتے جاتے Let's Learn Urdu کے نام سے انگریزی اور ہندی میں ان کی چار کتابوں کے سیٹ کی اشاعت اہل زبان و ادب کے لیے محیر العقول ثابت ہوئی اور 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب'، 'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' اور 'جدیدیت کے بعد' نقوش شائقین ادب کی تشنگی بجھادی۔

اب گوپی چند نارنگ کی تازہ تصنیف 'اردو زبان اور لسانیات' رضا لائبریری رام پور کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوئی ہے جو لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ در حقیقت یہ پروفیسر نارنگ کے اردو زبان اور لسانیات کے زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ لسانیاتی مضامین کے اس گنج گراں مایہ میں علمی و تاریخی، تجزیاتی اور نظریاتی تحریریں اور لسانی سرمایہ ہے جن سے اردو زبان کی گہرائیوں پر ان کی نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور جدید لسانیاتی مباحث کا دریچہ کھلتا ہے۔ حقیقتاً ان مضامین سے بین الاقوامی شہرت یافتہ دانشور گوپی چند نارنگ کے لسانیاتی زاویے اور تخلیقی و تنقیدی فکر و بصیرت سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ نیز ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل سے نبرد آزما ہونے اور گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے کی سمت میں لسانیات جدید کے بنیاد گزار کی حیثیت سے گوپی چند نارنگ کا واضح موقف سامنے آتا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین کے گہرے مطالعہ سے نارنگ صاحب کی اردو زبان سے دیوانگی کی حد تک وابستگی اور اردو کے جدید لسانیاتی مسائل و مباحث سے گہری دلچسپی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اردو زبان سے ان کی والہانہ محبت کا بانگ دہل اظہار اور وہ بھی اس وقت جب کیان چند جین کی متنازع کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' بحث میں ہے اور بعض فرقہ پرست اور فرسٹریٹڈ عناصر اس تصنیف کے انتساب کے حوالے سے گوپی چند نارنگ کے نام کو گھسیٹنے کی سعی نا کام کر رہے ہیں، اپنی حق گوئی کو اجاگر کرتا ہے اور بدنہاد لوگوں کو آئینہ دکھاتا ہے۔ زیر نظر ادبی تحفہ میں زبان اور لسانیات میں گزشتہ چالیس برس کے دوران لکھے گئے مضامین بھی ہیں اور ایک جامع اور مبسوط دیباچہ بھی۔ یوں تو یہ دیباچہ صرف چار صفحات پر مشتمل ہے لیکن گویا کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے۔ اس دیباچہ سے ان تمام سوالوں کا جواب مل جاتا ہے جو اردو زبان سے اب تک کیے جاتے رہے ہیں۔ جو لوگ خود کو اردو زبان و ادب کا اجارہ دار سمجھتے ہیں اور دوسروں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کے منہ پر مصنف کا یہ اقتباس ہی ایک طمانچہ ہے بلکہ ان کے لیے بھی کارگر جواب ہے جو اردو کو غیر سیکولر اور فرقہ وارانہ زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ مانجھ ہے جس نے ہمیں گڑ ھا اور سنوارا ہے۔ یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔ یہ ایک طرز حیات، ایک اسلوب زیست، ایک انداز نظر یا جینے کا ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط

سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔" ("اردو زبان اور لسانیات"، ص 11)

جین صاحب نے اپنی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کا انتساب امرت رائے اور گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے یہی بنیاد ہے نارنگ صاحب کو گھیرنے کی۔ لیکن گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب میں پہلے کی طرح ایک بار پھر کسی کا نام لیے بغیر تمام فرقہ پرست سوچ رکھنے والوں کو للکارا ہے اور ان کی کج رویوں کو رد کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اردو کبھی دلوں کو توڑنے والی زبان نہیں رہی۔ وہ رقم طراز ہیں:

"اردو کا ایک نام سیکولرازم یعنی غیر فرقہ واریت' اور 'بھائی چارہ بھی ہے۔ اردو نے صدیوں سے اس کی سچی نظیر مثال قائم کی ہے اور ہر طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محاذ باندھا ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ کیا کسی ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد جمہوری معاشرے نہ صرف یہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا جواز فراہم کر سکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر وہ زندہ بھی رہ سکتے ہیں؟" ("اردو زبان اور لسانیات"، ص 11)

گوپی چند نارنگ نے گیان چند جین جیسوں کی باتوں کو بھی بہت ہی مہذب انداز میں رد کیا۔ ذرا یہ حصہ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

"میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میرا سفر اردو سفر عشق ہے۔ عشق اثبات خودی کی نہیں تسلیم خودی کی راہ ہے جس میں 'لین' کچھ نہیں 'دین' ہی دین ہے اور میں نے تو دیا کچھ بھی نہیں، میری بساط ہی کیا، اور لے لیا کتنا کچھ۔ یہ کسر نفسی نہیں کہ میری پہچان جو بھی اور جیسی بھی ہے اردو کی بدولت ہے۔ یہ اردو کی فیاضی نہیں تو کیا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہ دے سکا اور اس نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کسی کو بھی کسی نے کیا دیا ہوگا!" ("اردو زبان اور لسانیات"، ص 11-12)

شمس الرحمن فاروقی نے اپنے تبصراتی مضمون 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

"دنیا جانتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اردو کی ساری دنیا سے جتنے اعزاز، اکرام، ایوارڈ اور انعام ملے ہیں اتنے اردو کے کسی ادیب کو نہیں ملے ہوں۔ شاید آئندہ مل سکیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ممدوح گوپی چند نارنگ کو اردو کی دنیا میں اپنے بزرگوں اور معاصروں کے ساتھ کسی دوڑ میں مبتلا کرانا پسند فرماتے ہیں۔۔۔ دراصل صورت حال تو یہ ہے کہ اردو والے گوپی چند نارنگ کو اپنا 'ہمسر' تو کیا اپنے سے برتر مانتے ہیں"۔ (اردو ادب، شمارہ اپریل، مئی، جون 2006، ص 36)

دراصل گوپی چند نارنگ نے اپنے سفر اردو کو سفر عشق بتا کر اپنی پہچان کو اردو کی بدولت قرار دے کر اور اردو کی فیاضی کا ذکر کر کے اردو کے تعلق سے اب ٹھپ لکھنے والوں کی خبر بھی لی ہے۔

جہاں تک 'انتساب' کی بات ہے تو اس حوالے سے گوپی چند نارنگ کے خلاف سازش کرنے کی کوشش حد درجہ غیر ذمہ دارانہ اور فرقہ وارانہ ہے۔ جو شخص اردو سے اپنی وابستگی کو دیوانگی کی حد قرار دیتا ہے اپنے 'سفر اردو کو سفر عشق' بتاتا ہے، اردو کو زبانوں کا 'تاج محل' کہتا ہے، اردو کے امتیاز کے لیے اردو رسم الخط پر اصرار کرنے کو نہ صرف فطری بلکہ ضروری سمجھتا ہے بلکہ رسم الخط بدلنے کو زبان کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے اور وہ بھی تحریری شکل میں تو پھر ایسے شخص پر اردو کے تعلق سے بے جا بہتان تراشی کیا گیان چند جیسی شخصیتوں کی فکر کو جلا بخشنا اور ان کی اعتراضات کو صحیح ثابت کرنا نہیں ہے؟ گوپی چند نارنگ اردو کو اپنی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی مادری زبان کا درجہ دیتے ہیں اور اس کی جادوئی کشش کے ساتھ اس کے جنوبی ایشیا کی لنگوا فرینکا زبان ہونے کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ کیا ان سب کے باوجود انھیں ایک مخصوص 'عینک' سے دیکھنا کیا ہماری تنگ نظری اور عصبیت پر دال نہیں؟ دراصل یہی سوال سوچنے کا ہے۔ ان کا یہ اقتباس ان کی گہری وابستگی اور صدق دلی کا بین ثبوت ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"اردو میری مادری زبان نہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائیکی بولی جاتی تھی، میری ماں دلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی، نرم اور رسیلی زبان ہے لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری و ساری نہیں ہے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی یہ جتنا کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے۔ میں اردو کو زبانوں کا 'تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے باخبری و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے کیسے ہند آریائی کے بطن میں عربی فارسی ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگا رنگ دھنک تنی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول و عرض میں وہ آج 'لنگوا فرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس کے رس جس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔" ("اردو زبان اور لسانیات"، ص 12)

ہمارے عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم جو کچھ نہیں دیکھتے اس پر بعض خود غرض لوگوں کے بھڑکانے پر یقین کر لیتے ہیں، اور خود اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ گوپی چند نارنگ کے تعلق

سے یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ان کے کچھ کرم فرما ایسے ہیں جو بہ جائے حسد و بغض و عناد ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ نارنگ صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کی بجائے اپنی کج روی کی بناپر غلط فہمیوں کو ہوا دیتے ہیں، اور جو کچھ نہیں ہے اسے گھڑنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ یعنی جو شخص نصف صدی سے اردو زبان و ادب کا دفاع کرتا آیا ہے اور جس کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہے اسے نشانہ بنایا جارہا ہے۔ یہ نہ صرف بد دیانتی ہے گروہ بندی ہے بلکہ خبث باطن بھی ہے جس کی مذمت کرنا چاہیے۔ یہاں یہ عرض بھی کردوں کہ گوپی چند نارنگ پر انگشت نمائی کرنے والوں کی تعداد ان کے چاہنے والوں کے مقابلے میں چاند پر داغ کی مانند ہے۔ اس قسم کی سازشوں سے بھی وہ کبھی بد دل نہیں ہوئے کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ آسمان پر تھوکنے والے خود ہی ذلت اٹھاتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا: میں اس معاملے میں سر سید احمد خاں کا قائل ہوں جن کا قول ہے کہ خدا کا شکر ہے اس نے ٹھو ر بنایا ہے کسی کا حاسد نہیں۔

اکثر اخبارات و جرائد اپنے قارئین کی آرا اور خطوط شائع کرنے سے پہلے یہ فقرہ لکھ دیتے ہیں کہ "مراسلہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں"۔ مطلب یہ کہ قارئین کی رائے سے ایڈیٹر یا جملہ ذمہ داران کا کوئی سروکار نہیں۔ پھر بھی ہم یہ سمجھیں کہ قارئین کی جو رائے شائع کی جاتی ہے اس سے ادارہ جڑا ہوا ہے تو یہ ہماری لاعلمی ہوگی۔ یہ ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اس میں شائع کسی مضمون نگار کی ہر بات سے ادارہ متفق ہو یا جڑا ایک سے۔ گیان چند نارنگ کی کتاب صفحہ 17 اپر "اظہار تشکر" کے عنوان سے مصنف نے واضح انداز میں یہ تحریر کیا ہے کہ "کتاب میں جو کچھ ہے اس کی پوری ذمہ داری خود اسی پر عائد ہوتی ہے"۔ اس کا متن آپ بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ مصنف نے کیا لکھا ہے اور کن کن شخصیتوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس کے باوجود صرف ایک شخص کو ہی کیوں ہدف بنایا جارہا ہے:

"اظہار تشکر

مندرجہ ذیل اصحاب کا شکر گزار ہوں:

1 پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی
2 جناب مشفق خواجہ کراچی
3 ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی
4 جناب شمس الرحمٰن فاروقی، الہٰ آباد
5 ڈاکٹر ضیاالدین انصاری، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، پٹنہ
6 ڈاکٹر محمد انورالدین، پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

مندرجہ بالا حضرات نے مطلوبہ متعدد کتابیں اور رسالے فراہم کیے۔ اگر ان کا کرم شامل حال نہ ہوتا تو میں امریکہ میں بیٹھ کر یہ کتاب نہ لکھ سکتا۔ لیکن یہ واضح کردوں کہ کتاب میں جو کچھ ہے اس کی پوری ذمہ داری مجھ پر اور صرف مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ میری آرا کے لیے یہ لوگ نہیں میں خود پوری طرح ذمہ دار ہوں۔"

گیان چند جین نے نصف درجن افراد کا اظہار تشکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں محمد حسن اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے ان کی کتاب پر مقدمہ لکھا ہے جس سے گیان چند جین کے لسانی Thesis کی توثیق ہوتی ہے لیکن حیرت اور استعجاب ہے یہ دیکھ کر کہ ان تمام لوگوں میں صرف گوپی چند نارنگ کے نام کو ہی اچھالا گیا۔ کیا اس لیے کہ وہ ہندو ہیں؟ اب تک جتنے بھی مضامین اس حوالے سے آئے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی مندرجہ بالا ناموں میں سے کسی دوسرے نام کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ آخر کیوں؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اردو میں رواج ہے کہ انتساب کرنے سے پہلے کسی کی اجازت نہیں لی جاتی۔ اگر منسوب سے ہم مواد کو بھی منسوب کرنے لگے تو ایک نئی بحث چھڑ جائے گی۔ اسی لیے اس فرقہ وارانہ حرکت کی شدید مذمت کی ضرورت ہے۔ کیا اس لیے کہ حق کا گلا کچھ حیلوں کے حلق کا کانٹا بن گیا ہے؟

گوپی چند نارنگ نے اپنی تازہ کتاب میں سیاسی ہنگامہ پروری کے اس عہد میں پھیلنے والی غلط فہمیوں اور اردو رسم الخط کے ساتھ اردو–ہندی کے معنی خیز رشتے کا ذکر کرکے تعصب پسند افراد کے سینے کو اور بھی چھلنی کردیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اردو کا خصوصی امتیازی نشان اس کے عربی فارسی اثرات ہیں۔ سیاسی ہنگامہ پروری کے عہد میں غلط فہمیوں کا پھیلنا ایک عام سی بات ہے۔ یوں بھی جذباتی کاروبار علم سے کم ہی نسبت رکھتا ہے۔ اس لیے اس عرفان کو عام کرنا از بس ضروری ہے کہ اردو کی جڑیں اسی سرزمین میں ہیں اور اس کی کشش و دل آویزی اور مٹھاس اور رس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اس میں کئی زبانوں اور کئی ثقافتوں کا پیوند لگا ہے۔ اردو کا چلن ہندوستان اور پاکستان یعنی پورے برصغیر میں ہے۔ اردو اور ہندی کی بنیاد ایک ہے یعنی کھڑی بولی لیکن اب یہ دونوں زبانیں الگ الگ آزاد اور مستقل زبانیں ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی طاقت ہیں اور ایک کے بغیر دوسری مکمل نہیں۔ اردو ہندوستان اور پاکستان کی متعدد بولیوں اور زبانوں کے درمیان ایک سماجی لسانی و تہذیبی پل ہے۔ اسی لیے حق ہے کہ برصغیر کی بیس پچیس زبانوں میں سے کوئی دو زبانیں ایک

دوسرے سے اتنی قریب نہیں جتنی کہ اردو اور ہندی۔ ہندوستان میں اردو کی بقا کے لیے اس رشتے پر زور دینا بیحد ضروری ہے۔" (اردو زبان اور لسانیات، ص 13)

مذکورہ تمام حقائق سے پردہ پوشی کرتے ہوئے وہ حضرات جو پہلے گونگے اور بہرے دونوں تھے، ان کی تربیت نارنگ صاحب نے کی اور انھیں قوتِ گویائی اور قوتِ سماعت عطا کی اور ممکنہ حد تک ان کی مدد بھی کی لیکن اگر وہی ان کے خلاف سب کشائی کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ افراد جن کی پوری تنقیدی بساط نارنگ صاحب کی مرہونِ منت ہے تو تعجب ہوتا ہے۔ حقانی القاسمی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

"نئی نسل نارنگ کے تنقیدی فرہنگ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ پائی۔ وہی نارنگ کی ساختیات، پس ساختیات، تصورِ اسمیت و قطعیت، وہی نحوی واحدے، طویل مصوتے، وہی حرفی نحوی امتیازات۔ نارنگ کے جملے، ان کی اصطلاحات، لفظیات نئی نسل اپنے مضامین میں کچھ اس طرح استعمال کرتی ہے کہ لوگ نارنگ کی گہرائی و گیرائی کو نئے قاری کے ذہن کی گہرائی و گیرائی سمجھنے کی حماقت کر بیٹھتے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ نارنگ کی وضاحتِ فکر اور سلاستِ زبان کی جگہ نئے قاری کے ذہن اور زبان کی ژولیدگی تحریر کو چوں چوں کا مربہ بنا دیتی ہے۔" (تونی ری سے بندھا گونہ، حقانی القاسمی، استعارہ، شمارہ 22)

میں خود گیان چند جین کی متعصبانہ آرا کو رد کرتا ہوں اور فرقہ واریت خواہ کسی کی ہو اس پر لعنت بھیجتا ہوں لیکن یہ بات گلے سے نہیں اترتی کہ صرف 'احتساب' کا بہانہ بنا کر نارنگ صاحب کی ہشت جہت شخصیت پر چھینٹا کشی کی جائے اور ان کی جملہ خصوصیات پر پردہ ڈالا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جملہ فرقہ پرستوں بلکہ سازشیوں پر گوپی چند نارنگ کی یہ کتاب نہ صرف بہت بھاری ہے بلکہ زبردست طمانچہ بھی۔

اس کتاب میں شامل ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی، افسر بکار خاص رام پور رضا لائبریری کے 'حرفِ آغاز' اور مشہور ماہر لسانیات و صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے عالمانہ 'پیش لفظ' نے تو اردو زبان اور اس کے رسمِ خط سے نارنگ صاحب کے والہانہ لگاؤ اور ان کی گراں قدر خدمات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے کچھ تیرہ نہادوں کے چہرے مزید روشن ہو جائیں گے۔

پچیس مضامین سے آراستہ زیرِ نظر تصنیف پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سات، دوسرے میں تین، تیسرے میں پانچ، چوتھے میں پانچ اور آخری حصے میں پانچ کے علاوہ انگریزی کے دو مضامین بھی شامل ہیں جو ہر اعتبار سے منفرد، یکتا اور معلوماتی ہیں۔ پہلے حصے میں اردو ہماری اردو، اردو کی ہندوستانی بنیاد، اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ، اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر، اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک (اول و دوم) اور قصہ اردو زبان کا' کے عنوانات سے مجموعی طور پر اردو اور ہندی کے لسانی رشتوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور اردو کے تاریخی تناظر میں موجودہ درپیش مسائل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے نارنگ صاحب کی اردو سے گہری مطابقت اور سچی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ برصغیر کے تناظر میں اردو کی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی غرض و غایت کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ درحقیقت پہلا حصہ اردو۔ ہندی کے حتمی خیر رشتے کی مختلف جہتوں کو واضح طور پر اجاگر کرتا ہے۔

دوسرے حصے کے تحت 'اردو رسم الخط — ایک تاریخی بحث، اردو رسم الخط: تہذیبی و لسانیاتی مطالعہ' اور 'اردو املا اور لسانیات' کے عنوانات سے مضامین شامل کیے گئے ہیں جن سے روایت اور اجتہاد پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ ان تینوں مشمولات کا محور و مرکز اردو رسم الخط ہے اور جو انتہائی علمی اور سائنسی انداز میں لکھے گئے ہیں اور جن کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا شوشہ لسانی کی بجائے خالص سیاسی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے صاف صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ اردو اور ہندی کے لیے ایک ہی رسم الخط کا اختیار کیا جانا دونوں کے حق میں نقصان دہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے تیسرے حصے میں تین ممتاز شخصیتوں دتاتریہ کیفی، احتشام حسین اور فرمان فتح پوری کی ادبی اور لسانیاتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے زبان سے متعلق بڑے اہم موقف کو بیان کیا گیا ہے جبکہ چوتھے حصے میں 'کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ، اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی، انجمن ترقی اردو کی کل ہند اردو کانفرنس، بہار کا تاریخی اقدام اور کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس' سے متعلق مضامین ہیں۔ کربل کتھا پر ان کا مضمون جامع اور پر مغز ہے اور اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی کا جائزہ بھی کافی بھرپور ہے جو نارنگ صاحب کی ایک اہم لسانیاتی تلاش و جستجو ہے۔ اس طرح اردو کانفرنسوں میں شرکت کر کے اردو کے درپیش مسائل سے اہلِ زبان و ادب کو آگاہ کرنے کی بے حد ادبی گفتگو نے اس حصے کو معنی خیز بنایا ہے۔ اس طرح بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے سے متعلق تاریخی اقدام پر پروفیسر نارنگ کی تحریر نے اور بھی معنویت پیدا کر دی ہے۔

پانچویں اور آخری حصے میں پانچ مضامین 'اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت، ہمزہ کیوں؟، ن یا ں، اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی اور اردو صوتوں کی نئی درجہ بندی' کے عنوانات سے ہیں۔ یہ تمام

مضامین تکنیکی انداز میں خالص لسانیاتی نوعیت کے ہیں۔ یہ بیشتر وہ مضامین ہیں جن پر خوب خوب بحثیں ہو چکی ہیں۔ اردو آوازوں اور اردو صوتوں کی نئی درجہ بندی کے حوالے سے شامل مضامین امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں لکھے گئے۔ آخر میں انگریزی کے دو مضامین اردو اور ہندی کی Generative Phonology کے مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جو مختلف یونیورسٹیوں میں لسانیات کے کورسوں میں حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین سے گوپی چند نارنگ کے مطالعہ کی عرق ریزی اور اردو سے ان کی محبت کی تصویر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اردو کی محبت میں زبان کی کیسی کیسی جہات کو روشن کیا ہے۔

مختصر یہ کہ 'اردو زبان اور لسانیات' گوپی چند نارنگ کے اردو سے متعلق موقف کا واضح اظہار یہ ہے اور اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ نارنگ صاحب نہ صرف ایک ممتاز اور بلند پایہ نقاد اور نظریہ ساز ادیب و دانشور ہیں بلکہ ماہر لسانیات بھی ہیں۔ ان کے دلائل اتنے مربوط اور دل کش ہیں کہ ان کی تخلیقی، تنقیدی اور لسانیاتی فکر و بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مگر گیان چند جین جیسے منفی سوچ رکھنے والوں کے ذریعہ پیدا کی گئی تند فضا میں بروقت اس کتاب کی اشاعت سے اس کی معنی خیزی اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے اور اس کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر معاشرے کا کوئی ایک شخص ذہنی عدم توازن کا شکار ہو جائے تو پورے معاشرے کو عدم توازن کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ 'اردو زبان و لسانیات' جیسے ہتھیار اور تصنیف کی ضرورت ہے۔ رہی بات فرقہ پرستی کے توڑ کی تو گوپی چند نارنگ جیسے جید عالم کا ایک صفحہ ہی کافی ہے۔

گوپی چند نارنگ کی یہ عالمانہ اور فکر انگیز تصنیف اردو زبان اور لسانیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے اردو ادب اور لسانیات کے اہل نظر کو برسوں روشنی ملے گی اور یقیناً یہ کتاب فکر و نظر کی نئی بستیاں آباد کرنے میں کامیاب ہوگی۔ بالخصوص آج کی مسموم فضا میں یہ تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے۔ یہ کتاب گوپی چند نارنگ کے معاندین اور مخالفین کے منہ پر زناٹے دار طمانچہ بھی ہے۔ نارنگ صاحب کے موقف کو کسی دوسرے کے حوالے سے نہیں بلکہ خود ان کی تصنیف کے حوالے سے جاننے اور پرکھنے کی ضرورت ہے اور یہی دیانت داری اور دروبست کا تقاضا بھی ہے اور یہی اہل نظر اور ارباب تحقیق کا شیوہ رہا ہے۔

ہر چند کہ اوپر ہم نے نارنگ صاحب کی فقط ایک کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' کے حوالے سے گفتگو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نارنگ صاحب کی اکثر تصانیف سے اردو زبان کے بارے میں بار بار ان کا جو موقف سامنے آتا ہے اسے یوں بیان کر سکتے ہیں:

(1) اردو زبان ہندو اور مسلمانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی اور اس کی حیثیت دو فرقوں کے درمیان ایک لسانی اور تہذیبی پل کی ہے۔
(2) اردو گنگا جمنی تہذیب یعنی مشترک تہذیب کی بہترین ترجمان ہے۔
(3) جمہوری ہندوستان میں سیکولرازم کا کوئی تصور اردو کے بغیر مکمل نہیں۔
(4) ادبی اور جمالیاتی حسن کاری کے اعتبار سے ہندوستانی زبانوں میں اردو کی حیثیت تاج محل کی سی ہے۔
(5) اردو رسم الخط کو تبدیل کرنا اردو کی شخصیت کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔ اردو کا تحفظ اس کے اپنے رسم الخط کے ساتھ ہونا چاہیے۔
(6) اردو اور ہندی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں جو لسانی اور تعلیمی حقوق ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی وغیرہ کو حاصل ہے وہ اردو کو بھی مساویانہ طور پر ملنا چاہیے۔ اردو علاقے میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اسکولوں میں اردو تعلیم کا نفاذ بے حد ضروری ہے۔

یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ تقریباً پچاس برسوں سے پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے مندرجہ بالا Thesis کے ساتھ اردو کے دفاع میں سینہ سپر رہے ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی اردو کے سیکولر کردار اور حقوق کے لیے انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ (ان کی 64 سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں چالیس پینتالیس اردو میں اور دس گیارہ ہندی اور انگریزی میں۔) اس موضوع پر بلاشبہ انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے ہوں گے اور دنیا کے کونے کونے میں اردو کا پرچم بلند کیا۔ انھیں بیرونی دنیا میں بالعموم 'سفیر اردو' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ عہد میں بشمول اردو کے دیگر ادیبوں کے کسی دوسرے جید ادیب نے اردو کے لسانی اور تہذیبی موقف کو سائنسی اور معروضی دلائل کے ساتھ اتنے موثر پیرائے میں بیان نہیں کیا ہوگا جتنا کہ گوپی چند نارنگ نے کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اپنی مثال آپ ہیں اور ان کی خدمات بے مثل ہیں۔

قرآن کریم کی آیت ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَلَّا تَعْدِلُوا

کسی قوم کی دشمنی میں عدل و انصاف سے منحرف ہو جانا، نہ اہل ایمان کا طریقہ ہے اور نہ ہی اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ تمام معاملات میں عدل و انصاف شرط ہے چاہے نظریاتی، لسانی، فکریاتی مسائل ہوں یا دیگر معاملات حزم و عدل واحتیاط برتنا ضروری ہے۔ گوپی چند نارنگ پر بہتان تراشی کرنے والے جن میں اکثر 'اہل ایمان' بھی شامل ہیں کیا قرآن کریم کی اس آیت یا فرمان کو مسترد کرنے کا گناہ نہیں کر رہے ہیں۔

☆

فیمنسٹ تحریک کا دوسرا اور تیسرا دور

حمیدہ معین رضوی

فیمنسٹ تحریک کے دوسرے دور میں جو اغراض و مقاصد سرفہرست رکھے گئے ان میں جانچنے کی کوشش کی گئی کہ مردوں اور عورتوں میں کیا فرق ہے؟ اور کس طرح یہ دونوں جنس ذاتی اور معاشرتی دونوں حیثیت سے اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان نعروں کو جاری رکھا گیا "نسائی اتحاد" اور "بہناپے میں قوت ہے" "ذاتیات کا مطلب ہے سیاسی"۔

خواتین کے خلاف حق تلفیوں کو خارجی داخلی اور گھریلو کے خانوں میں درج کرنے کے بجائے ان کو ایک جنسی اہمیت دی گئی گھروں میں مردوں کے ہاتھوں عورتوں اور بچوں پر تشدد کے خلاف پناہ گاہیں بنانے کی تجاویز ہوئیں۔ اشتہار بازی میں اور فلموں اور ڈراموں میں اس ذلت آمیز خیال، نظریے کے خلاف بھی آواز اٹھائی کہ "عورتوں کو جنسی معاملات میں تشدد اور جارحیت پسند بتایا جاتا ہے یا یہ کہ "عورتیں سخت مزاج یا بد مزاج مردوں کی نگوی میں رہنا اور کھلونا بنے رہنا پسند کرتی ہیں" فحش فلموں میں جو عورت کو ایک شے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ ذلت آمیز ہے ان تمام چیزوں کے خلاف قوانین بنانے کا مطالبہ کیا گیا "زنا بالجبر" میں پولیس اور عدالت کے رویہ پر کڑی نکتہ چینی کی گئی۔

دفتروں، ہسپتالوں، اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں خواتین کو نوکریاں ملنی چاہئیں اور وہی تنخواہ انہیں ملنا چاہئے جو مرد لیتے ہیں بلکہ فیکٹریوں اور گھروں دوکانوں اور دوسری جگہوں پر مزدوری کرنے والی خواتین کو بھی برابر کی تنخواہ ملنی چاہئے۔ نوکری اداروں اور گھروں جہاں بھی عورتیں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہوں وہاں ان پر زیادتی کرنا، ان سے غیر مساوی سلوک کرنا، ان سے فحش مذاق کرنا ممنوع قرار دیا جائے۔

گھریلو زندگی میں جنسی زبردستی کو ممنوع قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا اور اس حکومت، ثقافت اور قانون پر لعنت بھیجی گئی اور اسے مسترد کیا گیا جس میں شوہر کو محبت کرنے والے دیکھ بھال کرنے والے کے بجائے ظالم اور جارح بننے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بچے پیدا کرنے یا ضائع کرنے کا فیصلہ عورت کے ہاتھ میں ہونا ضروری قرار دیا گیا اور مغرب کے عمرانی Nuclear family کی تصویر اور تعریف پر بھی کڑی نکتہ چینی کی گئی۔ خواتین کے خیال میں "خاندان" کا محدود تصور بھی جنسی شناخت کے لئے سم قاتل ہے اس بات کو بھی ہوا دی گئی کہ عورتوں پر ہر قسم کی زیادتی یہ کہہ کر دی گئی کہ عورتیں جسمانی طور پر مختلف ہیں یعنی کمزور ہیں اس لئے کمتر ہیں اور مرد طاقت کی بنا پر بہتر تخلیق ہیں۔ اس لئے معاشرہ میں عورت کی مرکزی حیثیت کو بدلنے کا مطالبہ ہوا۔ عورت کی اہمیت میں اضافہ کیا جائے۔

جہاں تک جسمانی طاقت کی برتری کا خیال ہے "یہ بھی پدرانہ نظام کی دین ہے" تا کہ قوت کے سارے سرچشموں کو اپنی مٹھی میں رکھ کر کمزور کر دیا جائے اور اسی لئے مرد جب تک چاہتا ہے عورت سے کھیلتا ہے اور جب چاہتا ہے جوتے کی نوک سے ٹھکرا دیتا ہے جن میں سے اکثر مطالبات برطانوی قوانین کا حصہ بن چکے ہیں۔

امریکہ میں نسائی تحریک کے اس دور میں جن سنجیدہ خواتین نے علمی میدان اور معاشرتی مورخ کی حیثیت اختیار کی ان کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) Ann Douglass
(۲) Nina Auerbach
(۳) Dorothy Sayers
(۴) Sylvia Path
(۵) Muriel Spark

ستر کی دہائی میں جن خواتین نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ معاشرہ کے ہر طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تعلیمی معیار بہتر ہونے اور مساوات کے قوانین پر عملدرآمد کے باعث خواتین میں تعلیم کا اوسط بہت بڑھ گیا اور ذرائع ابلاغ، اخبار، ریڈیو، ٹی وی، اساتذہ، یونیورسٹی لیکچرز، ماہرین لسانیات، مترجمین سب عورتیں بن گئیں اور اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا دیا۔ انہوں نے جہاں بھی کام کیا وہاں خواتین کے لئے مساوات کے تصور کو عام نہیں کیا ان اداروں میں اندرونی نظم پیدا کیا جو خواتین کی صلاحیتوں اور فن و ہنر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ نسائی نقطہ نظر کے ساتھ معاشرتی تاریخ، عمرانی مسائل اور ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا اور پدرانہ نظام کی زیادتیوں اور نسائی صلاحیتوں کی حوصلہ شکنی کے اعداد اور ثبوت کے بعد متبادل نظریات پیش کئے اور کتابیں لکھیں۔

سیاسی لحاظ سے بھی یہ انتہا پسندی کا دور کہا جا سکتا ہے کارل مارکس ان دنوں بہت مقبول ہوا اور بہت سی خواتین اشتراکیت کے خواب دیکھنے لگیں مگر جلد ہی انہیں احساس ہوا کہ اس تحریک کے لئے برابر سے محنت کرنے کے باوجود ہوا یہ کہ مرد میزوں پہ بیٹھ کر ڈینگیں اڑاتے ہوئے انتہا پسندی اور اشتراکیت کے مسائل پہ بحث کرتے جبکہ عورتیں جھاڑو پوچا لگانے اور مردوں

کے چھوٹے برتن دھونے پہ مجبور تھیں یہ خاص طور پہ جنگ عظیم دوم کے درمیان اور بعد کے زمانے میں ہوا۔ چنانچہ خواتین نے طے کیا کہ وہ مردوں سے علیحدہ آپس میں متحد ہو کر حقوق کی جنگ لڑیں گی انہوں نے اس جدوجہد کا باقاعدہ اعادہ کیا جو جنگ کے زمانے میں روکنا پڑا تھا۔ Betty Krieden نے ایک کتاب 1963-71 میں لکھی کتاب کا نام Faministe Mystique ہے اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ کیسے خواتین پہ مجبوری مسلط کی گئی۔ کتاب Female Enuch یعنی نسائی ہیجڑا فیمنسٹ مسٹیک سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں علمی انداز میں نسائی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے لکھی گئی ہیں اور دونوں خواتین برطانوی ہیں یہ کتاب سادہ پر تاثیر ہے نسائی کلاسک کی حیثیت رکھتی ہے اور مرد بھی اسے پڑھ کر پسند کرتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔

1971 میں کیٹ ملر نے ہنری ملر اور ڈی ایچ لارنس کی خوب خبر لی ہے جنہوں نے اپنے نسوانی کرداروں کو بھدے پن اور پھوہڑ پن سے پیش کیا اور انہیں جوتے کی خاک بنا دیا۔ یہ "جارحیت کوئی ہنر نہیں" بلکہ لارنس نے اپنے ہی کسی جذبے یا کمزوری کی وجہ سے ایسا کیا ہے یعنی عورت کی تذلیل کی ہے۔ 1971ء میں ہی ایک اور کتاب سانڈرا گلبرٹ اور سوزن گوبار نے لکھی "کوٹھڑی میں پاگل عورت"۔ انہوں نے کھوج لگایا کہ کیوں انیسویں صدی کی ادبی تاریخ میں خواتین خال خال پائی جاتی ہیں۔ ان کا خیال ہے یہ سادہ مزاجی میں مصروف کر لیا کہ "مسلسل جذباتی اور ذہنی استحصال اور جبر انسانی نفسیات پہ کیسے اثر انداز ہوا ہے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ خواتین خود پدرانہ نظام کی چیرہ دستیوں کا شکار رہ چکی تھیں۔ اس لئے انہیں یہ جاننے کا خیال آیا۔ MOI کی کتاب Sexual and Contextual Policies میں سنجیدگی سے بحث کی گئی ہے۔ جبکہ فرانسیسی فیمنسٹوں نے عورتوں کی ہر کمزوری کو منفی مثال کے طور پہ گفتگو اور تحریر میں غیر منطقیت کو خوبی بھی گردانا اور چونکہ فرانس میں عربی کی طرح مذکر و مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے اس لئے انہوں نے مردوں کے اعتراض انہیں کو لوٹا دیئے کہ مرد خود بہت بڑی غیر منطقی مخلوق ہے۔ فرانسیسی خواتین نے ہی ریزن روایت پسندوں کی طرح فرائڈ کی تحلیل نفسی اور ایڈی پس کامپلکس جو مردوں کا آوردہ ہے مردوں کے نظام کے استرداد کے لئے استعمال کیا یعنی انہیں ہسٹریا کی تعریف کی گئی کہ یہ پدرانہ نظام سے بغاوت اور خلاف ورزی کا نسائی اعلامیہ ہے یا بے زبانی کی زبان ہے۔ Kristava نے اپنے مضمون "شاعرانہ زبان میں انقلاب" میں اس نکتے کی بہت قاعدہ اور سمجھداری سے وضاحت کی ہے۔

جولیٹ مچل نے انقلابی نظریات کو برطانیہ میں عام کیا اور ایلین شوالٹر نے امریکہ میں شور شرابے سے آگے بڑھ کر سنجیدہ کاموں کی طرف توجہ دی اس نے اس علم کو Gyno critic کی اصطلاح نکالی۔

ایلین ایک یونیورسٹی پروفیسر اور بے حد بااثر خاتون تھی اس نے خصوصی طور پہ خواتین ادیبوں کی کتابیں پہ نئے سرے سے بحث و تمحیث کا انتظام کیا اور طالبات کے لئے تحقیق کے مواقع ڈھونڈے نسائی تحریک کے تیسرے دور کی ابتدائی دو دہائیوں میں بھی زیادہ تر نسائی کوششیں حق تلفیوں کے ماتم اور فن کے تماشا احتجاج کی منزل صرف خود مختاری کی تمنا پہ ختم ہوتی نظر آتی ہے کرسٹوا اور Cix os نے بہت وقت ضائع کیا۔

جہاں ریزن روایت نے فیمنسٹ تحریک کو بدنام کیا اور اس کے خلاف قدامت پسند مرد امریکیوں کو ناراض کیا گیا وہاں ایلین شوالٹر اور ایلن مگنس نے علمی مباحث کئے۔ برطانیہ میں عملی کام بھی بہت کئے جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ ووٹ کے علاوہ طلاق کا حق بچے رکھ لینے کا حق مرد کی وراثت میں نصف جائداد کا حق ضرور حاصل کر لیا۔ جبکہ ہندوستان پاکستان میں عورتوں نے دکھاوے کی تحریروں کا چرچا تو کیا لیکن حقیقی معنوں میں ان بنیادی سوالوں پہ کوئی تجزیہ یا منطقی بحث نہیں کی جن کے باعث مذہب، تہذیب اور روایت کے نام پہ عورتوں کی حق تلفیوں کی رسم پڑی نہ عملی طور پہ خواتین نے کسی معقول تنظیم کا اہتمام کیا۔ اس کے مقابلے میں اسی دور کی مصری خواتین نے باقاعدہ شرعی تحریروں پہ علمی بحث کا آغاز کیا ہے۔ خواتین اردو ادب میں تقریباً اسی برس سے لکھ رہی ہیں ان میں کوئی بہناپا نہیں ایک دوسرے کی عملی مدد کا کوئی جذبہ نہیں بلکہ اکثر اوقات مردوں کے ساتھ مل کر خواتین خود خواتین کو کاٹتی ہیں۔ خواتین نے آج تک کوئی ایسا رسالہ نہیں نکالا جس میں نسائی نقطۂ نظر پہ بحث کی جائے۔ یا ان لکھنے والیوں کی مدد کی جائے جن کے پاس کتابوں کو چھپوانے اور منظر عام پہ لانے کے ذرائع نہیں ہیں اور بعض خواتین خود فیمنسٹ ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود مردوں پہ بھروسہ کرتی ہیں جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ وجوہات ڈھونڈے جائیں نتائج اخذ کئے جائیں اور اصلاح کے لئے اقدامات کئے جائیں اور خود کئے جائیں۔

بہرحال مغرب کی سنجیدہ نسائی تحریک کی ادیبوں نے رفتہ رفتہ سنجیدہ موضوعات پہ لکھنا شروع کیا۔ ژل میشلر کی کتاب "مردوں کی ساختہ زبان" میں یہ لکھا کہ مرد اور عورتیں دونوں کی ذہانت ہے دونوں اچھا لکھ سکتے ہیں۔ اس لئے ادیب، شاعر اور افسانہ و ناول کے لئے صرف "ادیب" اور نقاد اور پڑھنے والے کے لئے صرف قاری کا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔

Gale Robin گیل روبن نے 1975ء میں جو کتاب Traffic in Women's میں بہت سے مثبت مطالبے کئے اور ان الفاظ کو مسترد اور غیر قانونی قرار دیئے جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے اس بات پہ تعجب کا اظہار بھی کیا اور احتجاج بھی کیا کہ لیوی اسٹراس نے کہا ہے کہ "مرد اور عورتوں کے کردار معاشرہ متعین کرتا ہے" جب کہ اس کا فرض تھا کہ وہ خواتین کی المیہ زندگی کی وجوہات سے بحث کرتا اور اصلاح کا طریقہ سوچتا۔

خواتین نے اپنے رسالوں اخباروں اور ریڈیو پروگراموں میں اس بات کو بہت اہمیت دی اور اس سلسلے میں قانونی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش کی کہ عورتوں کے لئے تضحیکی اور تذلیلی الفاظ کا ورے ضرب الامثال استعمال نہ کئے جائیں۔ جیسے چڑیل، جادوگرنیاں، ڈھنڈو، کھوسٹ، جاہل، ڈائن۔ اردو میں بھی اس طرح کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ بچوں کی ان کہانیوں اور گیتوں کو بھی مسترد کیا گیا جن میں مردوں کی برتری دکھائی گئی ہے۔ میری ڈیلی نے لزبیزم کو بھی ایک مسلمہ طرز زندگی بتایا اور دکھلایا ہے یا ایک مسلمہ حقیقت جبکہ ہمارے معاشرہ میں اس حرکت کو ان بوڑھی غیر شادی شدہ خواتین کی جنسی ضرورت کی تسکین کی صورت بتائی گئی ہے ورنہ ہمارے خیال میں ازلی زندگی مرد و عورت کے اتحاد پہ منحصر ہوتی ہے۔

ایلین شوالٹر اور ایلیس مور نے 80-1970ء میں کالی خواتین کے حقوق کی طرف بھی اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں خواتین کی بیچارگی کے بارے جاننے کو بھی منشور کا حصہ بنایا۔ کیتھرین میکنن امریکہ میں اور آنڈریا ڈورکن نے عملی طور پہ اپنے ملک میں بہت سے قوانین منظور کروائے اور عورتوں کے خلاف بہلک قوانین کو منسوخ کروایا اسی کا نتیجہ تھا آیزن رواے نے جہاں فیمنسٹوں کے خلاف اتنا تعصب پھیلایا تھا کہ ایک لیزبین کے قتل کا مقدمہ عدالت میں پہنچا تو جیوری کے سب مرد و عورتوں اور جج نے مقدمہ میں مقتول کی ہتک کی اور اس کو اپنے قتل کا خود ہی ذمہ دار قرار دیا گیا۔ جنوب کے قدامت پسندوں میں اب بھی فیمنسٹ تحریک سے نفرت لیزبین کی وجہ سے بے تحت جذبات پائے جاتے ہیں جبکہ اب پڑھی لکھی بااثر خواتین نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ انہوں نے ایک بہت فحش فلمیں بنانے والی کمپنی پہ عورتوں کی ہتک اور تذلیل کا مقدمہ چلایا اور ان کمپنیوں کو جرمانہ بھی ہوا اور پورنوگرافی کے خلاف قوانین بھی بنے۔

آنڈریا لورڈ نے سفید فیمنسٹ خواتین سے سخت شکایت اور تنبیہہ کی کہ ساری دنیا کی خواتین ایک ہیں ان میں کالی یا ایشیائیوں کی تفریق نہیں ہونی چاہیئے یہی وجہ کہ اس نے 1983ء میں کالی خواتین کے مضامین کا مجموعہ چھاپا اور میری ایگلٹن نے اپنی کتاب Reader میں ہر قوم اور ہر ملک کی خواتین کو مضامین لکھنے کی دعوت دی۔

جبکہ فرانس میں مشہور فیمنسٹ مادام سیمون ڈی بوئر نے بہت اہتمام کے ساتھ یہ انکشاف کیا کہ عورتوں کو حمل ہونے کی وجہ سے اس کا استحصال ہوتا ہے اور انہیں گھاٹے اٹھانے پڑتے ہیں نوکری میں ترقی نہیں ہوتی وہ معاشرتی طور پہ پیچھے رہ جاتی ہیں ترقی نہیں حاصل کر پاتیں۔ بحث کے انداز اور جوش سے یہ محسوس ہوتا کہ وہ بحث کے بعد مردوں سے بچہ پیدا کرنے کی کوئی ترکیب لکھے گی مگر اس نے بحث بچوں کی پیدائش کی وجہ سے صرف عورتوں کے خساروں پہ بات ختم کر دی جبکہ مثلاً متھاوراڈ اسٹون نے عورتوں کی صحت بہتر کرنے کے انتظامات کا مطالبہ کیا خاندانی منصوبہ بندی کے لئے اسے کلی اختیارات کا مطالبہ کیا۔ اور اگر عورت بیمار رہتی ہے تو اسے بچے پیدا کئے جانے پہ مجبور نہیں کرنا چاہیئے بچوں کی پیدائش پہ چھٹی لے کر جانے والی خواتین کو زچہ خانے کا خرچ اور معاوضہ ملنا چاہیئے اور واپسی پہ اس کی ترقی نہیں روکی جانی چاہیئے۔ واضح رہے کہ یورپ میں یہ سارے مطالبے قانون کا حصہ بن گئے ہیں اور 1980ء کی دہائی کے بعد سے ان پہ عملدرآمد ہو رہا ہے۔

ہولی ذرگیں Hetrosexoality and Lesbien Existences لیزبین کے بارے پہلی کتاب لکھی 1985

اپڈرین ریچ کی کتاب شاعری کی ہے Of Womens' born۔ کتاب کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس نے یہ لکھا ہے کہ عورتیں صدیوں ایک مخصوص کردار میں رہنے کی وجہ سے مفعولیت کی عادی ہو جاتی ہیں مگر اس کو مقدر سمجھ لیتی ہیں۔ ہمارے مسلمان معاشرہ میں بھی بچی آٹھ برس کی عمر سے یہ سننا شروع کرتی ہے "اللہ تعالیٰ کسی کو سجدے کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم ہوتا کہ شوہر کو سجدہ کرے" اس حقیقت پہ کبھی کسی نے اعتراض نہیں اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا مگر معاشرہ کیوں مرد کو معبود بنا بیٹھا ہے اور عورت بیان کرے تو اس کی گردن تو ڑدی جاتی ہے کیوں؟

جولیٹ مچل نے سرمایہ داری کو خواتین کی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیا اس کی کتاب The Longest New Revolution میں کارل مارکس سے ایقان حاصل کیا کہ عورت کی اہمیت ہونی چاہیئے جبکہ تحریک کے ابتدائی دنوں میں خواتین نے مردوں کے ساتھ جدوجہد شروع کی اور

مردوں نے انہیں پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی خواتین کو عملی میدان میں اترنا پڑا اور حکومت سے انہوں نے منوالیا کہ تعلیم کے ساتھ یا تعلیمی صلاحیت و اسناد کی موجودگی میں عام مزدوری میں عورتوں کو مردوں کے برابر کی تنخواہیں اور سہولتیں ملنی چاہئیے۔ 1990 تک امریکہ، برطانیہ میں یہ تمام مطالبے منظور ہو گئے اور ان پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔

نسائیت کے دوسرے دور کو انتہا پسندی انکشاف اور زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رول میں عورت کی کمزوریوں اور ان کی وجوہات کا سراغ لگا۔ اس سے جھنجھلاہٹ اور شدید ردِعمل ظاہر ہوا۔ بات احتجاج سے گزر کر انتہا پسندی تک پہنچی فرانسیسی فیمنسٹوں نے غیر معقولیت کی طرف قدم اٹھا دیا اور میرن کی روایت ڈالنے والوں نے بہت سے دشمن پیدا کئے۔ کیونکہ قدامت پسند مردوں کے لئے یہ تحریک ہی وبال جان تھی کہ لزبین کے فلسفہ اور ان کی حرکتوں کے بارے میں بھی حوصلہ افزا کتابیں شائع ہونے لگیں اور لوگوں میں یہ تاثر ہونے لگا کہ فیمنزم اور لزبینزم ایک ہی چیز ہے اور جتول بڑی بوڑھیوں کے لوگوں نے شریف بہو بیٹیوں کو اس شر سے بچانا ضروری سمجھا امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں ہر سطح پر ان کے خلاف محاذ ہوا اور دور پر دباب بھی ہے یہ تعصب تیسرے دور کی ابتدا تک بھی فیمنسٹوں کا وقت خواتین کی حق تلفیوں کی وجوہات ڈھونڈنے اور ان پہ ماتم کرنے میں بھی صرف ہوا اور آزادیٔ نسواں کا بے مقصد نعرہ ہی ان کی منزل بنا رہا۔ مثبت رویہ اتنی کی دہائی سے شروع ہوا۔

فیمنسٹ تحریک کے اس دور میں بہت سا ادب بھی لکھا گیا مگر وہ سب قنوطیت کے المیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ادیب کی موت، ماں کے کردار اور اس کی موت کا المیہ اس دور کا ایک اور پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ریکاویسٹ خود لکھتی ہے ''اس دور کے افسانوں اور ناولوں میں دکھ ہی اصل کہانی ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں خودکشی اور بے بسی میں خود آزاری کا رجحان عام ہے۔ بہت سے لوگ ان کہانیوں کو غنائی بھی کہتے ہیں۔ بعض خواتین نے غم کو مقدر بنا لیا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں۔ خواتین کے ادب کو اب پاگل پن غم کی موت اور قنوطیت سے باہر آجانا چاہئیے'' ریکاویسٹ غالباً اس قسم کے مثبت خیالات کا اظہار دوسری خواتین نے بھی کیا ہو گا۔ اسی وجہ سے روش بدلنے لگی اور یہ غنائی دور ایک خوش آئند حقیقت دور کی ابتدا ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایڈرین ریچ ایک اچھی شاعرہ ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل نظم ایک نئے دور کی بشارت معلوم ہوتی ہے۔

میری تنہائی کی وجہ شاید یہ ہے

صبح کے تڑکے اٹھ کر میں
نسیم سحری کے جھونکے سے اپنے اندر
کھینچ رہی ہوں تازہ ہوا
نسیم سحری صبح کو پورے شہر کو اپنے جھونکوں کی ہوا
بانٹتی پھرتی ہے
میں اس گھر کی تنہا فرد ہوں جو بیدار ہے
جبکہ پورا کنبہ میرا اب تک گہری نیند کی چادر میں لپٹا ہے
اور سویا ہوا ہے۔

1980ء کے ارد گرد بہت سی پڑھی لکھی خاندانی خواتین نے فیمنزم کی حمایت میں قلم اٹھائے اور درمیانہ اور معقول رویہ اپنانے کا مشورہ دیا اور یہ بھی سوچا جو حقائق و نتائج منظرِ شہود پر نظر آنے لگے ہیں ان کی کھال اور کیسے کھپت کی جائے؟ اور کس طرح حق تلفیوں، زیادتیوں اور ظلم کا خاتمہ کر کے ایک متوازن راہ ڈھونڈی جائے؟ اس دور کے لکھنے والوں میں سیاسی اور علمی سنجیدگی آئی اور تحریک کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروایا گیا۔ اس کے علاوہ میری ایگلٹن کی کتاب ''نسائی ادبی کلیات'' کا پہلا ایڈیشن 1987ء میں چھپا۔ اس میں بہت سی لکھنے والی خواتین سے سنجیدہ مضامین لکھوائے گئے اور ہر طباعت کے ساتھ اس میں تبدیلی اور اضافے کئے گئے۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں یہ کتاب چھاپی گئی۔ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ 1996ء کا ہے امریکہ میں بھی کئی بار چھپا ہے۔ اس کتاب کے اس 1996ء کے ایڈیشن میں مغربی دنیا سے باہر کے لوگوں سے بھی مضامین لئے گئے ہیں۔ جن میں انڈیا سے گائتری چکرورتی اور سیلادن حبیب کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی خواتین تو ہیں ہی۔ عورت کا وجود، اس کی تخلیقی قوت، اس کی فلاح و بہبود، اس کی جسمانی اور ذہنی صحت کے بعد اس کی ادبی تخلیق کی طرف خیال جانا ضروری تھا۔ وہ کیسے مرد سے مختلف سوچ رکھتی ہے؟ کیسے مختلف اظہار کرتی ہے؟ کس کو مخاطب کرتی ہے؟ کس اصول پہ انحصار کرتی اور اس تخلیقی تحریر کی جانچ پرکھ کا کیا معیار ہے؟ یہ بھی انہوں نے سوچا۔ اس کے ساتھ بیسویں صدی کا آخری دہائی سے قبل سر دقلم کاروں نے بھی خواتین کے مطالبات پہ سنجیدگی سے غور کیا اور ان کی حق تلفیوں کا احساس بھی اور تدارک اور تجاویز بھی پیش کیں۔ خواتین کے تنقیدی نظریات بھی بہت دلچسپ ہیں اور ادب کے ہر طالب علم کو ان کا جاننا ضروری ہے۔ فیمنسٹ تنقیدی خطوط پہ میرا اگلا مضمون ہو گا۔ خاص کر Deconstruction اور ژاک دریدا فیمنسٹ حرم میں کیسے داخل ہو گیا۔

طوفان کی آہٹ

ارمان نجمی

تاریخی ناول نگاری جوئے شیر لانے کی مثال پیش کرتی ہے۔ اس میں تاریخ کے ساتھ ساتھ اس صنف سے اچھی طرح واقفیت بھی ضروری ہے۔ تاریخ صرف واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں زمان و مکان کی وسعتیں بھی سمٹی ہوتی ہیں اور ایک خاص دور کے خواص و عوام اور مختلف طبقات کے درمیان کشمکش کے علاوہ عوام کی تمنائیں، کامیابیاں، ناکامیاں، لاحاصل اور حاصل کی روداد بھی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اردو ادب میں تاریخی معیاری ناولوں کی شدید کمی رہی ہے۔ تاریخی ناول نگاروں میں عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، صادق سردھنوی، نسیم حجازی اور محمد علی طیب کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کے ناول نیم پختہ رومانی جذبات، اکہرے کردار اور موضوع کی تہہ میں اترنے کی ناکام کوششیں ہیں۔ ہاں قاضی عبدالستار کو نہیں بھلایا جا سکتا۔ جنہوں نے اپنے ناول میں دارا شکوہ کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

گرچہ دیگر زبانوں میں ان سے پہلے بھی تاریخی ناول لکھے گئے اور والٹر اسکاٹ نے آئی وین ہو (Ivanhoe) اور دی ٹیلسمین (The Talisman) لکھ کر غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ اور ٹالسٹائی نے امن و جنگ لکھ کر اس صنف کو اعلیٰ عروج پر پہنچا دیا، پھر بھی تاریخی ناول نگاروں کے عزم میں کمی نہیں آئی ہے۔ ٹالسٹائی کا ناول اس دور پر محیط ہے جب نپولین نے انیسویں صدی کے اوائل میں روس پر حملہ کیا تھا۔ ٹالسٹائی نہ صرف میدان جنگ میں گیا بلکہ اس نے جنگ کے پرانے نقشوں کے علاوہ متقابل فوجوں کی معرکہ آرائی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے ناول کے کرداروں میں تازہ روح پھونک دی۔ اس ناول کو لکھنے میں اس نے آٹھ سال صرف کیے تھے۔

اردو ادب میں چند ایسے ناول ضرور ہیں جن کا پس منظر تاریخی ہے۔ جیسے آگ کا دریا، آنگن، اداس نسلیں، دو گز زمین اور قرات وغیرہ۔ لیکن ان کا زمانہ مختلف ہے اور ان کے کردار تخیلی ہیں۔ اس کے برخلاف طوفان کی آہٹ میں سارے کردار حقیقی اور اٹھارہویں صدی کے ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصطفیٰ کریم نے ناول میں ۱۷۵۶ تا ۱۷۵۷ء کے اس بنگال کو پیش کیا ہے جس پر سراج الدولہ کی حکمرانی تھی اور جس میں اس وقت کا بہار اور اڑیسہ بھی شامل تھا۔ سراج الدولہ تاریخ کا وہ المیہ کردار ہے جس کے مقدر میں شکست لکھی تھی۔ وہ نہ آئین جہاں بانی سیکھ سکا تھا اور نہ ہی اس کی ذہنی بلوغت مکمل ہوئی تھی۔ اسے ابتدا ہی سے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اندرونی و بیرونی سازشوں کا جو فردی سے سامنا کرتا ہوا ناکام ہو گیا۔ مصطفیٰ کریم نے طوفان کی آہٹ میں ماقبل نوآبادیات (Pre Colonialism) کی یلغار اور ہندوستانیوں کی مزاحمت کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گرچہ یہ منظر نامہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں بنگال تک ہی محدود ہے لیکن اس زمانہ کا بنگال، ملک کی دوسری ریاستوں کے علی الرغم معاشی خوشحالی کے ساتھ ساتھ امن کا گہوارہ بھی تھا۔

مصطفیٰ کریم ۱۹۳۲ء میں بہار کے ایک ممتاز علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق گھر پر حاصل کی۔ میٹرک پٹنہ یونیورسٹی سے کیا اور پھر الہ آباد سے آئی۔ ایس سی کرنے کے بعد علی گڑھ سے بی۔ ایس سی کیا۔ اس کے بعد ڈھاکہ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری لی اور پاکستانی فوج میں کیپٹن افسر رہنے کے بعد انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لئے چلے گئے۔ جسے حاصل کرنے کے بعد دل کی بیماری کی وجہ سے اسی ملک میں بس گئے۔ ان کے بزرگوں کو فرخ سیر کے دور حکومت ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء میں قاضی کے خطاب کے ساتھ مرشد آباد کے پاس بالدما نامی جگہ میں زمین ملی تھی۔ مرشد آباد بنگال کا دارالسلطنت تھا اور بنگال اس وقت ہندوستان کا زرخیز ترین علاقہ تھا۔ کہ ناول کی تصنیف میں ان کی اپنی ذات اور خاندانی پس منظر بھی موجود ہے لیکن یہ ناول غیر شخصی طریق اظہار کا آئینہ دار ہے اور تقریباً دو سال ۱۷۵۶ء ۱۷۵۷ء پر محیط ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کی مکمل روداد ہے۔ جس میں ایک طرف ملکی امرا اور حکمران طبقہ کی تصویر کشی کی گئی ہے تو دوسری جانب عوام یعنی غریب کسان کی روزمرہ کی فاقہ کشی اور مصائب میں گھری زندگی کی دل میں اترنے والی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کی کارستانیوں کو ان تمام واقعات سے اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ ناول قاری کی توجہ جذب کر لیتا ہے۔

ناول کے آغاز میں علی وردی خاں کی وفات کے بعد اس کے نواسہ سراج الدولہ کا بنگال صوبہ کی مسند نوابی پر متمکن ہونے اور وراثت کی کش مکش کا مسلسل جاری رہنے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب دلی کی مرکزی حکومت کمزور ہو کر روبہ زوال ہو چکی ہے۔ مختلف صوبے خاص کر دکن اور بنگال مطلق العنان ہو چکے ہیں۔ مرہٹہ گردی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے سے مرکز کی رہی سہی ساکھ ختم ہوتی جا رہی ہے اور متحدہ ہندوستان کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ علی وردی خاں جو بہادر اور جرأت مند صوبہ دار تھا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی چالوں کو ناکام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کی وصیت کے مطابق سراج الدولہ مسند نشیں ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس کی مشکلات بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ جن کا علم سراج الدولہ کی سگی خالہ مہر النسا عرف گھسیٹی بیگم اور ان کی والدہ کے درمیان مکالمے سے ہوتا ہے۔ گھسیٹی بیگم کسی حال میں سراج الدولہ کو بنگال کا صوبہ دار یا نواب تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنی دوسری بہن کے بیٹے شوکت جنگ کو بنگال کا

نواب بنانا چاہتی ہیں۔ شوکت جنگ پورنیا علاقے کی ریاست کا نواب ہے۔ گھسیٹی بیگم اسے دہلی دربار سے فرمان حاصل کر کے بنگال کا نواب بننے کے لئے خط لکھتی ہیں۔ لیکن قاصد پکڑا جاتا ہے اور بنگال میں خانہ جنگی کا امکان ہونے لگتا ہے۔ لیکن سراج الدولہ اپنے مشیر خاص میر مردان کے مشورے پر جنگ نہیں کرتا۔ میر مردان کی دوستی گھسیٹی بیگم کے سپہ سالار رحم علی سے ہے جو گھسیٹی بیگم کا عاشق بھی ہے۔ میر مردان کے بہکانے پر وہ اپنی محبوبہ کے خزانے سے زر و جواہر چرا کر فرار ہو جاتا ہے۔ گھسیٹی بیگم ہار نہیں مانتی اور صوبے کے سابق بخشی میر جعفر خاں سے مل کر سراج الدولہ کے خلاف دام فریب کا جال بچھانے لگتی ہے۔ اسی دوران یہ واقعہ بھی گذرا کہ پھر اچانک گھسیٹی بیگم کا دیوان لاکھوں روپوں کا غبن کر کے روپوش ہو گیا اور اس دولت کو اپنے بیٹے کشن داس کے ہاتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس کلکتہ بھجوا دیا۔ کمپنی کا رویہ سراج الدولہ کے خلاف اس کی مسند نشینی کے وقت ہی سے جنگ آمیز رہا تھا اور ساتھ ہی وہ ایک متوازن طاقت بن کر ابھرنے لگی تھی۔ نواب کے حکم کے خلاف وہ اپنی قلعہ بندی مضبوط کر رہی تھی اور قلعہ کے گرد خندق بھی کھودنے لگی تھی۔ سراج الدولہ ان وجوہات کی بنا پر کمپنی کے خلاف جنگ کا اعلان کرتا ہے اور فتحیاب ہوتا ہے۔

ان واقعات کے پس منظر میں سراج الدولہ کی شخصیت کے وہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں جس سے بیوی اور بیٹی کے ساتھ محبت اور فوزیہ نامی رقاصہ سے وابستگی اور دل کے علاوہ عاشق سے والہانہ پیار کا علم بھی ہوتا ہے۔ مرشدآباد نہ صرف بہت بڑا شہر ہے بلکہ وہاں ہاتھی کے دانت سے بنے حسین اشیا اور ریشم و مخمل کا بڑے پیمانے پر کاروبار بھی ہوتا ہے۔ وہاں ترکمان عورتیں چوگان کھیلتی ہیں اور بنیا کمپنی لگان وصول کرنے کا دن جب آتا ہے تو اس روز بہت بڑا میلہ بھی لگتا ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ خضر کی یاد میں شہر میں جو تہوار ہوتا ہے اور آتش بازیاں چھوٹتی ہیں۔ اسی جشن کے دوران جب سراج الدولہ حسین کشتی پر بیٹھا اپنے نانا کے مزار پر فاتحہ کے لئے جا رہا ہوتا ہے تو اپنی رقاصہ کی بدتمیزی پر سکھوں کے سامنے اسے ملتا ہے۔ جس کا بدلہ وہ سراج الدولہ کے سامنے لا کر اپنا جسم حوالے کر کے لیتی ہے۔ سراج الدولہ جن سیاسی مشکلات میں گھرا ہے ان کی وجہ سے وہ اپنی بیوی سے دور ہونے لگتا ہے اور فوزیہ سے بھی اسے سکون نہیں ملتا اور وہ بھی جذباتی سطح پر اس سے دور ہو چکی ہے۔ جس کا اظہار خوبصورت بیانیہ سے کیا گیا ہے۔

فوزیہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اس کا سر پیچھے کی جانب جھک گیا تھا اور ٹھوڑی اوپر اٹھ کر اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ گردن کا خم کانوں کی دکتی اور نیم وا چشم آنکھیں بھی جیسے سراج الدولہ کا مذاق اڑا رہی تھیں۔"

نوٹ کی قید سے فرار ممکن نہیں۔ اسے بس اتنی خوشی تھی کہ دل کے جام سے وارفتگی کا نشہ نہیں چھلکا۔ اس کے وجود میں کوئی ایسی شے تھی جو اب بھی آزاد تھی خود مختار تھی۔ یہ آزادی محترم تھی۔ کاش اس سوچ کا کسی کے سامنے اظہار کرتی اور اسے یقین آ جاتا۔ پھر وہ بھی اس کے ساتھ قہقہہ مار کر ہنستی۔ اس کے بعد زندگی کتنی آسان ہوتی۔ سراج الدولہ اس کے خیالات سے بے خبر تھا۔ وصل کے لمحات کتنے مختصر تھے۔ اسے خیال آیا۔ سراج الدولہ کو خالی پن کا احساس ہونے لگا۔ فوزیہ کے لئے کشش، جذبۂ رفاقت اور قربت کی خواہشیں رخصت ہو چکی تھیں۔ فوزیہ اور اس کے درمیان اب خلیج کی دھندلائی ہوئی دیوار حائل تھی۔

ہمیشہ کی طرح اس عہد کا جاگیردارانہ نظام ڈھیلا ڈھالا تھا۔ جس میں سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں ملتیں اور کسان اس قدر غریب ہیں کہ دو وقت کا کھانا بھی انہیں نہیں میسر آتا۔ لگان کی ادائیگی اس حد تک دشوار ہے کہ اپنے مویشی اور بچوں کو حوالے کر کے اپنی جان چھڑاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایسٹ انڈیا کے کارگذاروں سے سرمایہ داری کی منظم اور جارحانہ طاقت کا علم ہوتا ہے۔ جس کے سامنے جاگیردارانہ نظام کا ٹوٹ کر بکھر جانا ناگزیر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں اور فرنگی سوداگروں کے باہمی تعلقات سے ان کی تہذیب ان کے رنج و غم اور اس وقت کے انگلستان کے سیاسی اور معاشرتی زندگی کا پتہ چلتا ہے اور ان سب کی بیویوں کی آمد سے نسل پرستی کا جس طرح آغاز ہو رہا ہے وہ بھی ناول میں نمایاں ہے۔ ان کی دعوتوں میں کوئی ہندوستانی شریک نہیں ہوتا اور جو ہندوستانی نظر آتے ہیں وہ بھی ان کے خادم ہیں۔ کمپنی کے افسروں کی ایک دعوت میں اس راہبر کا بھی ذکر ہے جسے شہر میں رعب ایک فوجی افسر اس وقت زنا بالجبر کا نشانہ بناتا ہے جب وہ اسے دعوت کے بعد اس کے گھر پہنچانے لے گیا ہے۔

کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کی شکست کے بعد اس کے بچے کچھے سپاہیوں اور افسروں کو اس قید خانے میں رکھا گیا جو بلیک ہول (Black Hole) کے نام سے مشہور ہے۔ کو مصنف نے اس وقت کی تاریخ کے گہرے مطالعے اور تحقیق کے بعد ناول تحریر کیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ درست نہیں اور یہ مسلمانوں پر محض الزام تراشی ہے۔ مدراس میں کمپنی کا ہیڈکوارٹر تھا۔ وہاں جب کلکتہ میں کمپنی کی شکست کی خبر ملتی ہے تو کلائیو کے زیر کمان بدلہ لینے کے لئے فوج روانہ کی جاتی ہے۔ رابرٹ کلائیو نہ صرف انتہائی چالاک اور دلیر افسر تھا بلکہ اسے اس وقت کے ہندوستان کی سیاسی کمزوریوں کا اچھی طرح علم تھا۔ اسے کلکتہ کو فتح کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس شہر کی مدافعت کے لئے مانک چند نام کے ایک نااہل شخص کو تعینات کیا گیا تھا۔ اور وہ کلائیو کی منظم فوج کے سامنے کچھ نہیں کر سکا۔ کلائیو نے بڑی عیاری سے سراج الدولہ کے وزیر اعلیٰ اور فوج کے سالار اعظم میر جعفر کو لالچ دے کر اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا لیا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم ترین افسر رائے درلبھ بھی تھا۔ اسے بھی کلائیو نے اسی طرح عیاری سے خرید لیا تھا۔ جب ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں کلائیو اور سراج

الدولہ کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی تو میر جعفر تقریباً ساری فوج کے ساتھ تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر بھی شروع میں سراج الدولہ کا پلہ بھاری رہا لیکن جب اس کے وفادار سپاہیوں میں میر جعفر کی غداری کی خبر پھیل گئی تو انہوں نے ہمت ہار دی اور میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ اس طرح سراج الدولہ کو شکست ہو گئی اور ہندوستان کی غلامی کا آغاز ہو گیا۔ سراج الدولہ بھی اس جنگ کے بعد جب فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو راج محل نامی جگہ میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کروا دیا۔

ناول ختم کرنے کے بعد قاری ایک احساس زیاں کا اسیر ہو جاتا ہے لیکن اس کی نگاہ کرداروں اور واقعات پر بھی نہیں بلکہ اس کے پس منظر پر بھی جاتی ہے۔ معاشرہ ان دنوں جہالت اور غربت کا شکار تھا۔ توہم پرستی اور مذہب کی غلط تاویلات نے انہیں بے عملی کا شکار کر رکھا تھا۔ ہندو عورتوں کو ستی کیا جاتا یعنی زبردستی نذر آتش کر دیا جاتا تھا۔ بس گنتی بھر لوگ خوشحال تھے۔ سراج الدولہ اور اس کا نظام سلطنت جاگیرداری کے دور کا پروردہ تھا۔ جس میں بہت ساری خامیاں تھیں۔ اس کی فوج کے لئے اس طرح کے بہتر اور جدید ہتھیار نہیں تھے جیسے کہ کلائیو کی فوج کے پاس تھے۔ نہ ہی سراج الدولہ کو جدید انکشافات کی خبر تھی۔ الغرض وہ بے عملی اور بے علمی کے غار میں اپنے معاشرے کے ساتھ ڈوب رہا تھا اور ایک منظم طاقت اور دشمن کی یلغار کے سامنے وہ کچھ نہیں کر سکا۔ مصنف نے حقیقی واقعات اور اپنے تخیل نیز تاریخی شعور سے ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے جس نے طوفان کی آہٹ کو دلچسپ اور قابل مطالعہ ناول بنا دیا ہے۔ جس کا ایک وصف کرداروں کی تہہ داری بھی ہے۔ سراج الدولہ کی شخصیت میں غیظ و غضب اس حد تک ہے کہ اپنے نانا کے ایک عزیز دوست کو بھرے دربار میں طمانچہ مار کر ذلیل کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس حد تک انسانیت بھی ہے کہ اپنے مرحوم بھائی اکرام الدولہ کی غیر منکوحہ خادمہ سے جو اولاد ہے اسے بھی بہت عزیز رکھتا ہے۔ گو وہ مذہبی فرد نہیں پھر بھی خدا کے سامنے جھک کر سکون تلاش کرتا ہے۔ اور جب سراج اورنگ آبادی کی مشہور صوفیانہ غزل سنتا ہے' جس کا مطلع ہے:

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

تو ایک روحانی تلاطم سے دوچار ہو جاتا ہے۔ وہ ایک روشن خیال انسان ہے جو سمجھتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان صدیوں سے ساتھ رہتے آئے ہیں اور اگر ہندوؤں کی چتا کی راکھ ہندوستان کی زمین پر بکھری ہے تو اسی زمین کے سینے میں مسلمانوں کی ہڈیاں بھی دفن ہیں۔ گو مصنف نے ذکر نہیں کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ سراج الدولہ کی بیوی لطف النسا ہندو تھی جس کا پہلا نام راج کنول تھا۔ رابرٹ کلائیو نہ صرف انتہائی عیار اور جابر انسان تھا بلکہ وہ بہت ذہین اور دلیر انسان بھی تھا۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک محرر کے عہدے سے ترقی کر کے کمپنی کی فوج کا اعلیٰ افسر بن گیا تھا۔ اس کی گھریلو زندگی خوشگوار تھی اور وہ اپنے قریبی عزیزوں کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ گو میر جعفر ایک دغاباز اور لالچی انسان تھا لیکن اس میں انسانیت کی رمق بھی تھی۔ وہ اپنی غربت کے دنوں کو نہیں بھولا تھا اور اپنے اچھے دنوں میں غریب بچوں کی دلجوئی کیا کرتا تھا۔ اور جب کلکتہ کی پہلی جنگ میں سراج الدولہ کو فتح ہوئی تو میر جعفر نے انگریز قیدی عورتوں کو اپنے ایک ذمہ دار افسر کی حفاظت میں کمپنی کے افسران جہاں پناہ گزیں تھے وہاں پہنچوا دیا تھا۔ گھسیٹی بیگم کے کردار میں ایک عورت کی توانائی اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر حربہ استعمال کر سکتی تھی۔ وہ چوگان کے کھیل میں مہارت رکھتی تھی اور اس کی اپنی فوج بھی تھی جس کے بل بوتے پر وہ بنگال کی حکومت کو پامال کر سکتی تھی۔ مردوں کی دنیا میں اس کی خود مختاری چونکا دیتی ہے۔ فوزیہ گو سراج الدولہ کی رکھیل ہے لیکن پھر بھی ایک آزاد روح رکھتی تھی۔ جس کی خواہشوں اور آرزوؤں میں ایک عورت کی معصومیت بھری ہوئی تھی۔ آج کے ترقی یافتہ ملکوں کی ان گنت خوبیوں کے باوجود یہاں معاشرے میں تحمل اور بردباری کی کوششیں مسلسل ہوتی رہتی ہیں۔ اور انسان کی توقیر کے تحفظ پر زور دیا جاتا ہے اسی وجہ سے تانیثی تحریک کے مثبت پہلو نمایاں ہیں۔ ان وجوہات سے دانشوروں کی حیات کی مختلف سطحیں ہیں جن کی جانب توجہ جاتی ہے۔ ان حیات کو اٹھارہویں صدی کے معاشرے میں مصطفیٰ کریم نے اپنے ناول میں کچھ اس طرح سمویا ہے کہ پیچیدہ کاری کا شبہ نہیں ہوتا۔ سراج الدولہ کا اپنے ترائی بھتیجے سے محبت کرنا۔ گھسیٹی بیگم اور فوزیہ کا خود کو مردوں کے برابر سمجھنا۔ اور سراج الدولہ کا خالہ زاد بھائی شوکت جنگ' کو زنانہ کپڑے پہنتا ہے' لیکن وہ شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی حاملہ بھی ہے اس کے علاوہ میدان جنگ میں دلیری سے لڑتا ہوا جان دے دیتا ہے۔

کتاب میں کرداروں کی زبانی اشعار ادا کئے گئے ہیں۔ بعض نقل کرنے یا کمپوزنگ کی غلطیوں کی وجہ سے درست محسوس نہیں ہوتے۔ ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے' .... قرآن اور حدیث کے دائرے میں مقید تھے۔' قرآن بار بار تجسس کرنے کی دعوت دیتا ہے ایک جگہ اور قابل اعتراض حوالہ ہے' وہاں حدیث کے حوالے سے مجھے یہ بھی پڑھایا جاتا تھا کہ آسمان ایک اژدھا ہے جو خدا کے حکم سے جب سانس چھوڑتا ہے تو گرمی کا موسم آ جاتا ہے اور جب سانس لیتا ہے تو سردیاں آ جاتی ہیں' گو ادیب کو حق حاصل ہے کہ وہ مروجہ مذہبی اور معاشرتی اعتقادات کو عقل پسندی کی روشنی میں پرکھے پھر بھی ایسے ضعیف حوالے سے مصنف کو بچنا چاہئے تھا۔ مصطفیٰ کریم کا یہ دوسرا ناول ہے اس سے قبل ان کے افسانوں کے دو اور ادبی مضامین کا ایک مجموعہ آ چکا ہے۔ طوفان کی آہٹ کو شہر زاد پبلشرز کراچی نے شائع کیا ہے۔

نوبل انعام یافتہ حقیقت نگار

انور سدید

مصر کے نوبل انعام یافتہ مصنف نجیب محفوظ کا کوئی ناول عربی سے اردو میں ترجمہ نہیں ہوا لیکن وہ پاکستان کے ادیبوں کے لیے اجنبی نہیں' اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ انہیں 1988ء میں سویڈن اکیڈمی نے نوبل انعام کے لیے منتخب کیا تو پوری دنیا کی توجہ ان کی طرف ہو گئی اور اس میں اردو کے ادیب بھی شامل تھے۔ وہ عربی زبان کے پہلے ناول نگار تھے جنہیں دنیا کے اس عظیم ترین ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس ایوارڈ کے ساتھ تین لاکھ نوے ہزار ڈالر کی خطیر رقم بھی دی گئی تھی۔ دنیا بھر کے ادیب للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے اور نجیب محفوظ کے لیے یہ ایوارڈ اس لیے اہم تھا کہ وہ مصر کے ایک ایسے ادیب تھے جن کی تصنیفات آمدنی کے اعتبار سے ان کی کفیل نہیں تھیں اور زندگی کے اوائل میں عربی ادب میں ان کی کہانیوں کا مجموعہ "جنون کی سرگوشی" اور ناول "قسمت کا کھیل" لکھنے پر شہرت ان پر خود بخود نازل ہو گئی تھی تو وہ اپنے خاندان کو پالنے کے لیے سرکاری ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سرکاری ملازمتوں کا عروج دیکھا اور مصر کے "بیورو آف آرٹ" میں ڈائریکٹر آف سنسر شپ" اور "فاؤنڈیشن فار دی سپورٹ آف سینما" کے اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دینے کے علاوہ وزارت ثقافت میں کنسلٹنٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے لیکن انہیں زیادہ طمانیت قلم و قرطاس سے رشتہ قائم کرنے سے ہوتی تھی۔ قلم و قرطاس سے ان کا یہ رشتہ پچاس برس تک استوار رہا۔ انہوں نے اس عرصے میں 33 ناول' 13 افسانوی مجموعے 30 سکرین پلے اور متعدد ڈرامے لکھے۔ ان کے ناول انگریزی' فرانسیسی' جرمن اور سویڈش زبانوں میں ترجمہ ہوئے تو ان کا موازنہ دوستوئفسکی' چارلس ڈکنز اور ایمیل زولا کے ساتھ کیا گیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے قارئین نے نجیب محفوظ کو نوبل ایوارڈ ملنے کے بعد زیادہ توجہ سے پڑھا اور ایک امریکی نقاد ریڈ کیسلر نے 1990ء میں لکھا کہ "نجیب محفوظ کی زبان شیکسپیئر کی انگریزی کے مساوی قرار دی جا سکتی ہے اور وہ بہت مرصع عربی لکھتے ہیں۔"

نجیب عبدالعزیز ال سبیلگی محفوظ قاہرہ میں 1911ء میں اس وقت پیدا ہوئے جب مصر برطانوی حکومت کی عملداری میں ایک محکوم نو آبادی کی حیثیت رکھتا تھا۔ قاہرہ یونیورسٹی میں نجیب محفوظ نے طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا لیکن وہ ایک پیدائشی مفکر تھے اس لیے میڈیکل کا شعبہ چھوڑ کر انہوں نے ادب اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور لوگوں کی جسمانی بیماریوں کا علاج کرنے کی بجائے ذہنی روگ دریافت کرنے شروع کر دیئے۔ ٹالسٹائی' چیخوف' پراؤسٹ' دوستوئفسکی' بالزاک' تھامس مان' اونیل' کافکا' جوائس اور ہرمن برگ جیسے عالمی مصنفین کا مطالعہ انہوں نے گہری نظر سے کیا لیکن ان کے زیادہ اثرات قبول نہیں کیے انہوں نے ابتدا تاریخی نوعیت کے ناول لکھنے سے کی جس کی مثال پہلے عربی ادب میں دستیاب نہیں تھی' اس دور میں انہیں "الف لیلیٰ و لیلیٰ" نے بہت متاثر کیا جس کے اثرات ان کی کہانیوں میں لاشعوری طور پر در آئے۔ 1939ء میں نجیب محفوظ کا پہلا ناول "قسمت کا کھیل" شائع ہوا تو اس میں برطانوی استعمار کے خلاف حریت پسندوں کی جدوجہد کو صرف تحسین کی نظر سے دیکھا گیا بلکہ غیر ملکی تسلط کے خلاف بغاوت کے آثار بھی شامل نظر آتے ہیں۔ نجیب محفوظ مصر کے اونچے طبقے کے گریجویٹ نہیں تھے اور سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا رابطہ عوام سے قائم کیا انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں مصر کے گلی کوچوں کی عام زندگی کو حقیقت نگاری سے پیش کیا اور کسانوں' مزدوروں' ترکاری فروشوں' دکانداروں' سرکاری ملازموں' چور اچکوں' طوائفوں اور قدیم روایات میں جکڑی ہوئی مظلوم خواتین کے کرداروں کو اس طرح پیش کیا جس طرح چارلس ڈکنز نے انگلستان کی' ایمیل زولا نے فرانس کی اور دوستوئفسکی نے روس کی عوامی زندگی کو اپنی تخلیقات میں اجاگر کیا تھا۔ قدامت کی تنگ نظری کے برعکس نجیب محفوظ کو ایک کشادہ نظر اور روشن خیال ادیب شمار کیا جاتا ہے.... ایک انٹرویو میں انہوں نے خود اعتراف کیا کہ وہ قرآن حکیم کے ارشادات سے روشنی' رہنمائی اور تحریک حاصل کرتے ہیں' سلمان رشدی نے "شیطانی آیات" شائع کیں تو اس سے قطع تعلق کر لیا حالانکہ وہ اس سے قبل سلمان رشدی کی حمایت کرنے پر مصر کے انتہا پسند طبقے کا نشانہ بن چکے تھے۔ نجیب محفوظ نے سلمان رشدی کے دل آزار ناول کو اسلام کی توہین قرار دیا لیکن امام خمینی نے رشدی کے قتل کا فتویٰ جاری کیا تو اس کی مخالفت کی۔

نجیب محفوظ خود کو دو تہذیبوں کا فرزند کہا کرتے تھے ایک سات ہزار سال پرانی فرعونی تہذیب تھی جس کے آثار مصر میں اہراموں کی صورت میں محفوظ تھے دوسری چودہ سو سال کی اسلامی تہذیب تھی جو مصر کے عوام کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور نجیب محفوظ کی زندگی کے ابتدائی دور میں برطانوی استعمار کے خلاف مصروف جنگ تھی۔ وہ اسلامی تہذیب کی کشادگی اور وسعت کو تسلیم کرتے تھے لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ فرعونی تہذیب کے تعصب' تنگ نظری اور آمریت پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے۔ وہ شاہ فاروق کی شہنشاہیت اور جمال عبدالناصر' انور السادات اور حسنی مبارک کی آمریت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شعور کی رو کی تکنیک میں ان کے لکھے ہوئے ناول "چور" (The Thief)' "کتے" (The Dogs)' "میرامار" (Mira Mar) اور "نیل" (The Nile) آمریت کے خلاف لکھے گئے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ نجیب محفوظ سرکاری عتاب سے محفوظ رہے جبکہ اس قسم کی باغیانہ تخلیقات پیش کرنے پر ان کے متعدد معاصرین کو جیل یا زنداں میں ڈال دیا گیا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ مصر کے مذہبی طبقے جس کی بنیاد پرستی راسخ تھی نجیب محفوظ کی تخلیقات سے چنداں خوش نہیں تھے۔ 1979ء میں صدر سادات نے صحرائے سینا واپس لینے کے لیے اسرائیل کے ساتھ سمجھوتہ کیا تو نجیب محفوظ نے اپنی سرزمین کی واگزاری پر مصری حکومت کے اقدام کی حمایت کی جس پر مصر کے بنیاد پرستوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ اسرائیل کے ساتھ جنگ بندی کے حامی تھے لیکن فلسطین پر اسرائیل کے قبضے کو

امریکی اور برطانوی استعمار کی سازش قرار دیتے ہوئے اپنی سرزمین کو جبری قبضے سے آزاد کرانے کی فلسطینیوں کی جدوجہد کے زبردست حامی تھے۔ چنانچہ انہیں نوبل انعام سے جو ڈالر ملے ان کا معتدبہ حصہ انہوں نے فلسطینی اداروں کو پیش کر دیا۔ نجیب محفوظ نے عراق پر امریکی حملے کی بھی شدید مخالفت کی جبکہ وہ صدام حسین کو ایک ظالم اور جابر آمر قرار دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ نجیب محفوظ لکھے ہوئے ہر حرف کا احترام کرتے تھے خواہ اختلاف کی رائے ہو، غور سے سنتے اور اسے مضبوط دلائل سے رد کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی ایک کہانی اس طوائف کے بارے میں ہے جو اپنا پیشہ چھوڑنا چاہتی ہے لیکن تنگ نظر معاشرہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ ایک اور کہانی میں انہوں نے ایک مظلوم لڑکی کا کردار پیش کیا جسے گھر کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی اجازت بھی نہیں لیکن پھر اس کے بعد میں ایک روشن خیال تعلیم یافتہ لادین لڑکی ابھر کر آ جاتی ہے۔ وہ خواتین کے حقوق کی آواز موثر انداز میں اٹھاتی ہے۔ ان کا ناول "دی کیرو ٹرلوجی" (The Cairo Trilogy) جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، 1956ء میں مکمل ہوا۔ اس ناول میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر 1952 تک کے مصر کے سماجی، تمدنی اور تہذیبی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تین نسلوں کے تناظر میں یہ حالات جو تغیر پیدا کرتے ہیں ان کی نشاندہی کرداروں کے عمل اور ردعمل کے وسیلے سے کی گئی ہے۔ 1500 صفحات کی اس کتاب میں ان کے تین ناول "محل میں چہل قدمی"...."خواہشات کے محل"....اور "شکر گلی" شامل ہیں۔ اس ناول کو عربی زبان کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کی اشاعت کے کوئی تیس 30 برس کے بعد جب نجیب محفوظ کا نام نوبل انعام کے لئے زیر غور لایا گیا تو "دی کیرو ٹرلوجی" نے اہم کردار ادا کیا۔ اور اب متعدد عالمی زبانوں میں اس کا ترجمہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ معاشرتی سطح پر ان کے ناول "جبلاوی کے بچے" (Children of Gebelavi) پر سب سے زیادہ اعتراضات کیے گئے۔ بعض حلقوں نے اس ناول کو مذہبی عقائد کے خلاف قرار دیا۔ چنانچہ اس پر مصر میں پابندی عائد کر دی گئی۔ نجیب محفوظ کتابوں پر پابندیوں کے مخالف تھے۔ وہ کتاب کو مذہبی انتہا پسندی کے تحت نذر آتش کرنے کے حق میں بھی نہیں تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ حکومت اور معاشرے کے اس اقدام سے ممنوعہ کتاب کو بہت زیادہ شہرت مل جاتی ہے اور وہ معمول سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔

نجیب محفوظ پر اکتوبر 1994 میں انتہا پسندوں نے حملہ کر دیا۔ وہ اس وقت قاہرہ میں اپنے محبوب کیفے علی بابا میں اپنے معاصر ادیبوں کے ساتھ گپ شپ کرنے اور کافی نوش جان کرنے کے لیے پیدل آ رہے تھے کہ ان کے نظریاتی مخالفین نے ان پر حملہ کر دیا۔ ان کی گردن پر شدید چوٹیں آئیں۔ حسن اتفاق سے ایک ہسپتال قریب ہی تھا اور ان کے علاج میں معمولی سی تاخیر بھی نہ کی گئی لیکن ان کا اعصابی نظام درہم برہم ہو گیا تھا اور ان کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں قلم پر گرفت سے قاصر ہو گئی تھیں۔ لکھنے کی قوت سلب ہو گئی تھی تاہم انہوں نے حملہ آوروں کی مخالفت کی پروا نہ کی اور اپنی آزادی خیال کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے واضح کیا:

"میں زندگی کا حلیف ہوں نہ ہر چیز میں بائیں بازو کا زبردست ساتھی ہوں اور زندگی... میری گزشتہ صداقت اور روشن خیالی کے ساتھ ہے۔ میں اپنی زندگی بسر کر چکا ہوں۔ جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔ یہ لوگ مجھے مار کر کیا کریں گے جبکہ میری کتابیں اس دنیا میں موجود ہیں۔"

نجیب محفوظ پر حملہ کرنے والے انتہا پسندوں کو گرفتار کر لیا گیا ان پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالت نے انہیں سزا بھی دی۔ بعد میں نجیب محفوظ نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "مجھ جیسے عمر رسیدہ شخص پر عاقبت نااندیشوں نے حملہ کرنے کی بے جا زحمت اٹھائی۔ میں اس دنیا میں مزید کتنے دن زندہ رہ سکتا تھا؟" اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ حملے نے ان کا کچھ نہ بگاڑا۔ انہیں اپنی قوت ارادی اور بروقت علاج سے ان کی انگلیاں اس قابل ہو گئیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے لکھنے لگے تاہم اب وہ کسی محنت سے زیادہ مسلسل تحریری کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس دور میں انہوں نے مختصر کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ دی اور اپنی وفات (30 اگست 2006) سے صرف چھ ماہ پہلے کہانیوں کا ایک نیا مجموعہ "ساتویں جنت" کے نام سے شائع کیا۔ نقصان یہ ہوا کہ اس حملے کے بعد وہ قاہرہ کی گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتے تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر 94 برس تھی۔ ان کی نماز جنازہ مسجد رشدان (قاہرہ) میں الازہر یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ محمد سید طنطاوی نے پڑھائی جس میں مصر کے صدر حسنی مبارک نے بھی شرکت کی۔ اور انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا "نجیب محفوظ تہذیب کی روشنی تھے اور ان کے وسیلے سے عربی زبان کا ادب دنیا کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ انہوں نے روشن خیالی اور تحمل کی قدروں کو فروغ دیا اور تنگ نظری کو یکسر مسترد کیا۔"

مصر کے مفتی اعظم علی جمعہ نے فرمایا کہ نجیب محفوظ کی تحریروں میں عوام کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ صرف عربوں اور مسلمانوں ہی کے ادیب نہیں تھے بلکہ ان کی تحریریں پوری دنیا کے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں۔"

انگریزی کے ایک مشہور مترجم پیٹر تھیروکس جس نے نجیب محفوظ کے ناولوں کا ترجمہ بھی کیا تھا لکھا کہ نجیب محفوظ تراجم میں بھی اپنا اثر قاری کو منتقل کر دیتے ہیں اور قاری ان کی تحریر کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ان کا کہانی کے بیان کا اسلوب و تکنیک، کرداروں کی زبان اور ان کی حرکت و عمل، ان کے مکالمے اور واقعات کی جزئیات نگاری اعلیٰ پائے کی ہے اور وہ عربی ادب کے عظیم ترین مصنفین میں شامل ہیں۔ نجیب محفوظ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عربی زبان کی شاعری کی مرصع روایت میں نثر کو اور نثر میں فکشن کو فروغ دیا۔

نجیب محفوظ بنیادی طور پر عربی زبان کے ادیب تھے لیکن ان کی کتابیں دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور اب انہیں ایک عالمی ادیب کا درجہ بھی حاصل ہے جس کی عظمت کا اعتراف نوبل ایوارڈ کمیٹی نے بھی کیا۔ افسوس کی بات ہے کہ ان کی کتابوں کو اردو زبان میں پیش کرنے کی طرف مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ یہ کام اکادمی ادبیات پاکستان کو کرنا چاہیے تھا۔ تخلیقی ناشر بھی اگر اس طرف متوجہ ہوں تو یہ ان کے لیے بھی نفع بخش کام ثابت ہوگا۔ لیکن اردو کا قاری نجیب محفوظ کے مطالعے سے محروم رکھا جا رہا ہے تو اس پر افسوس کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے۔

نظمِ عصر

کاروکاری[1]

محسن بھوپالی

یہ رشتہ بھی یارب کیسا رشتہ ہے
دشمن سے بدلے کی خاطر
سگی بہن کا بھائی خون بہاتا ہے
کاروکاری کے پردے میں
قاتل ہو کر بھی وہ،
مجرم بننے سے بچ جاتا ہے!

....

یوں بھی اکثر ہوتا ہے
قرض خواہ کے ساتھ ہی،
اپنی بہن یا بھابی یا پھر ماں کو
ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے
جب الزام آئے تو جرگہ
اُس کے حق میں ہوتا ہے
یوں قرضے سے بھی بڑھ کر
بھاری رقم وہ لیتا ہے

.....

کاروکاری کی یہ رسم اکثر
ہاری[2] یا پھر چھوٹے طبقوں میں ہی ہوتی ہے
یہ پہلو بھی حیرت ناک ہے،
سرداروں اور وڈیروں کے بارے میں
خبر کبھی یہ آئی نہیں کہ اُن کے یہاں بھی
کاروکاری رائج ہے

1 غیرت کے نام پر قتل کرنے کی رسم
2 کسان

"یار ڑے دا سانوں تھر چنگا"....ستیہ پال آنند

لوگ یہاں پر لوگ نہیں ہیں
شاید لوگوں کے سائے ہیں
چلتے پھرتے، کورے خاکے
جن میں ایک ہیولے کی سی
خالی خالی
دو ابعاد میں ڈھلی ہوئی اک صورت تو ہے
خاکہ تو ہے
لیکن وہ اک ٹھوس حقیقت
جس کو چھو لیں بات کریں کچھ
اس کے اصلی نام سے جانیں
ایسی کوئی بات نہیں ہے
شاید میں دانتے کی دوزخ
یا اعراف میں گھوم رہا ہوں
جس میں اور بھی چلتے پھرتے
سائے ہیں یا پرچھائیاں ہیں!
کھیڑوں کے اس شہر میں رہتے
بیس برس ہونے کو آئے
میں اس خواب سے کب جاگوں گا؟
چلتے پھرتے
اپنا رستہ بھول گیا ہوں
دو ابعاد سے بنے ہوئے اک خاکے جیسا
میں بھی شاید اک سایہ ہوں
اپنے جیسے
دور دیس سے آئے کورے خاکوں جیسا!
لوٹ چلوں اب؟
اپنے وطن میں کوئی تو اپنا اب بھی ہو گا
واپس جا کر
اس خاکے میں رنگ بھروں گا!
خود کو پھر انسان کہوں گا!!

(امریکا میں بیس برسوں کا قیام پورا کرنے پر لکھی گئی)
اک پورا مصرع یاد آ رہا ہے۔ "یار ڑے دا سانوں تھر چنگا، بھٹھ کھیڑیاں دا رہنا!"
(اشارہ ہیر کی طرف ہے جو کھیڑوں کے قبیلے میں بیاہی گئی تھی)
سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ (سترھویں صدی عیسوی)

کھلونے

امجد اسلام امجد

کھلونوں کی دکانوں میں کھلونے ہی کھلونے ہیں
ہزاروں رنگ ہیں ان کے ہزاروں روپ ہیں ان کے
کبھی ہنستے، کبھی روتے، کبھی نغمے سناتے ہیں۔

چمکتی موٹروں میں آنے والے خوش لباس و خوش نما بچے
جدھر دیکھیں جہاں پر ہاتھ رکھ دیں اُن کھلونوں میں
وہی مالک وہی قابض وہی آقا ٹھہرتے ہیں
وہ چاہیں تو کسی لمحے
جسے چاہیں اٹھائیں اور چکنا چور کر ڈالیں۔

کھلونوں کی دکانوں میں وہ گڈے اور گڑیاں اب نہیں ملتے
کہ جو پھٹتے لحافوں سے نکالی روئی کے گچھوں
پرانی دھجیوں سے مل کے بنتے تھے
محلے بھر کے بچے جن کی شادی میں براتی بن کے آتے تھے۔

تو ایسی مسرت سے بھری دنیا کی باہنوں میں
جوان ہوتے تھے وہ لاکھوں کروڑوں خوش نظر بچے
کہ جو اپنے انہی خودساختہ بھدے نہایت ان گھڑے
سستے کھلونوں کو متاعِ جاں سمجھتے تھے
انہیں اپنے شکستہ گھر کے طاقوں کھڑکیوں الماریوں
میں یوں سجاتے تھے
کہ جیسے ان سے بہتر چیز دنیا میں کہاں ہو گی!!

یہی بچے جواب حسرت بھری دُزدیدہ نظروں سے
کھلونوں کی دکانوں میں کبھی جو جھانکنا چاہیں
تو اُن کو ایسا کرنے کی اجازت ہی نہیں ملتی
کہ شیلفوں میں سجا اک بھی کھلونا اُن کے وارے میں نہیں ہوتا
(یہ دنیا ایسی منڈی ہے
بلا قیمت جہاں انسان بیچے جا تو سکتے ہیں
کھلونوں کا مگر سودا خسارے میں نہیں ہوتا)
زمانے بھر کے بچوں کا یہ مشترکہ وتیرہ ہے
کھلونے جب ملیں اُن کو تو وہ خوش ہو کے ہنستے ہیں
مگر جب ان کھلونوں سے بھری اونچی دکانوں سے
پلٹتے پھول سے بچے تہی دامان آتے ہیں
نم آنکھوں میں بھرے آنسو بہ صد مشکل چھپاتے ہیں
تو لگتا ہے
کہ اب بچے نہیں ہنستے
کھلونے ان پہ ہنستے ہیں!!

O

نذرِ اقبالؔ

غالب عرفان

اقبالؔ تری فکر دل آویز پہ رقصاں
احساس کے شعلوں میں نئی آگ رواں ہے
اقبال ترے جذبہ ملت کا تقاضا!
جوکل تھاوہی آج بھی رگ رگ میں جواں ہے

اقبال تری فکر وہ جمشید ہے جس نے
تحریر کی قوت کا نیا جام پلایا
سوئی ہوئی اک قوم کی عظمت کو جگا کر
تاریخ کا آئینہ ایام دکھایا

اے فلسفیٔ وحدت اسلام کہ تجھ سے
روشن ہے ابھی عنبر تمنا کی ہر اک راہ
تونے جو دیا ذہن کو تحریک سفر تو
ہم ہوتے رہے سطوتِ ادراک سے آگاہ

تہذیب کا اک سلسلۂ وقت کہ جس میں
اقبال ترا سازِ تکلم ہے کہ ہم ہیں
اک ولولۂ جوشِ جنوں خیز کہ جس میں
گونجا ہوا تقدیس ترنم ہے کہ ہم ہیں

تو ایک صدا، ایک سفر، ایک تمنا
ہم راہِ تمنا کے مسافر ہی رہیں گے
تو نعرہ توثیق ہے عرفانؔ خودی کا
ہم تیری ہر آواز پہ لبیک کہیں گے

خوشحال اورِ اقبال

یونس صابر

علامہ اقبال ہو یا خوشحال خٹک
ہے اُن کے افکار کی شرح تمام خُودی

خُودبینی کی بجائے خُود آگاہی کی
اک تلقین ہے ہر لحہ ہرگام خُودی

اُن کے شعرِ سُخن میں آفاقیت ہے
دونوں کا یکساں ہے فیض عامِ خُودی

جو قومیں غیروں کی دست نگر نہ بنیں
اُنہیں دیا ہے قُدرت نے انعام خُودی

جو ظالم کے آگے نہ جُھکنے پائیں کبھی
یاد انہیں کرتی ہے صبح و شام خُودی

غیرتِ آزادی کے ماتھے کا جُھومر
حق پرچم کو لہرانے کا نام خُودی

سرحد اور پنجاب سے مشرق، مغرب تک
خوشحال و اقبال کا ہے پیغام خُودی

ذکرِ خوشحال و فکرِ اقبال خُودی
خُود ہی اپنا جواب اور آپ سوال خُودی

اک شہباز اور ہے شاہین صفت دُوجا
رُوحِ شاعر میں ہے فقط فعال خودی

اُن کے مسلک کا حرفِ حکمت ہے یہی
روشن ماضی، حال اور استقبال خُودی

بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں
اس دھرتی میں دھڑ کتے دونوں یک دِل ہیں

ردِ عمل

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہؔ (کیلیفورنیا، یو ایس اے)

پھر وہی ہے مسئلۂ درپیش ہے وہ ہی سوال
رقصاں ہے ذہن و دل پر، اُلجھنوں کا ایک جال

دربدری کا عالم، ہو گیا جاں کا وبال
آدمی کے سامنے ہے اُس کے کرموں کا حال

راہِ مفر سے بہتر تھا، کرتا تُو اپنی تلاش
ختم ہو سکتا تھا یہ سلسلۂ ہجر و وصال

اوہام کی صُورت بدلتا ہی رہا تیرا یقیں
اور یہ زعم خود سمجھا، تجھکو حاصل ہے کمال

وقت کی گردش بھی تو ہے اعمال کا ردِ عمل
ناحق ہے تیرے لب پہ شکوۂ دل میں ہے رنج و ملال

اے غمِ دل تُو لے چلا ہے، پھر اُسی دہلیز پہ
وسوسوں کی بھیڑ سے، بھاگا تھا ہو کر نڈھال

زندگی کے زیر و بم کا، خود ہی تو راقم ہے تُو
بانٹے گر پیار تشنہؔ تم بھی ہو جاتے نہال

O

عبدالقدیر خان

(پاکستان کے مایۂ ناز ایٹمی سائنسدان)

دل نواز دِل

بے مثل لاجواب ہے عبدالقدیر خان
کانٹوں میں تر گلاب ہے عبدالقدیر خان

محسن ہے پاک مُلک کا یہ بے عدیل شخص
سچا ہے جو وہ خواب ہے عبدالقدیر خان

ذرّے کے ہر سوال کی عظمت کا اے سلام
اک ایٹمی جواب ہے عبدالقدیر خان

تشنہ لبی ہے جس کی سمندر ہوں شرمسار
ایسا ہی اک سَراب ہے عبدالقدیر خان

جس کا ہر ایک حرف ہے پڑھنے میں شب چراغ
وہ دِن چڑھی کتاب ہے عبدالقدیر خان

روشن ہے جس سے علم کا ماتھا عمل کے ساتھ
وہ زندگی کا باب ہے عبدالقدیر خان

مَت لے حساب اس سے تُو اے عہدِ بے کتاب
اپنے میں احتساب ہے عبدالقدیر خان

ہر حال میں ہو تیری زبان پہ خدا کا ورد
صحت تیری خراب ہے عبدالقدیر خان

مِلّت کے دشمنوں کے لیے اے جہان غیر
دِلؔ جان کا عذاب ہے عبدالقدیر خان

خوشبو کی برات... علیم صبا نویدی (بھارت) (سانیٹ)

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں
بادلوں کی جب قطاریں چل پڑیں
سو گیا پت جھڑ بہاریں چل پڑیں
لے کے آئی تھی ہوا گیتوں کا رنگ
ٹہنیوں پر بج اٹھی اک جل ترنگ
لمحہ لمحہ سرخوشی کی چھاؤں میں
بس گئی دنیا نئی سی گاؤں میں
آ گئی خوشبو بھی برکھا روپ میں

ہر طرف پھولوں کی دیوی کی بہار
دور تک جلوؤں میں مستی آ گئی
وجد میں بستی کی بستی آ گئی
چہرۂ ہستی پہ آیا پھر نکھار

ناچ اٹھی جھوم اٹھی زندگی
لب خوشی کے چوم اٹھی زندگی

کنکال... عادل حیات (دہلی بھارت)

یہ سرحد
دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے
ضرورت ہے
اسے مضبوط کرنے کی
اگر یہ ٹوٹ جائیگی
بہا کر بستیوں کو ساتھ میں اپنے
کہیں غرقاب کر دے گی
پھر اس کے بعد کوئی شخص ہی ہوگا
نہ پھر ہریالیاں آنکھوں میں اتریں گی
زمیں کی سرخ بنجر کوکھ سے جو کچھ بھی جنمے گا
وہ سب "کنکال" ہوگا
نفرتوں کا
صدی کے نصف حصے سے زیادہ
ایک اس کی آبیاری میں
لہو دونوں طرف کتنا بہایا ہے!

یہ نہ سوچنا جاناں

ماجد سرحدی

زیست کے جھمیلوں میں
ہم بچھڑ گئے ہیں گر
آندھیوں کے ریلوں میں

کہکشاں کے دھارے کو
ہم سمجھ نہیں پائے
رات کے ستارے کو

پور پور گھائل ہیں
کیا بتائیں ہم تم کو
کس قدر مائل ہیں

یہ سوال کرنا ہے
مل گئے اگر تم پھر
زیست کیا معما ہے

رات کو سحر کرنا
آ گیا ہے کیا تم کو
زیست کو بسر کرنا

چاہے ہو کوئی موسم
ہم تجھی سے رہتے ہیں
چاندنی ہو یا رم جھم

تم بہت ستاتے ہو
شام جونہی ڈھلتی ہے
تم ہی یاد آتے ہو

یہ نہ سوچنا جاناں
ہم تمھیں بھلا بیٹھے

رب نواز مائل

ایک تصویر زندگی کی یہ بھی

بس ذرا پہلے تک
زندگی کتنی ہی اور تھی
خوشیوں سے بھی بھری؛ خوابوں سے بھی بھری
اور پھر
قِصّوں سے بھی بھری
پر یہ اُس
پَل کے جاتے ہی اب
جانے کیا، ایسا پیش آیا ہے
(کچھ پسِ پردہ ہی؛ چیزیں بھی مان کر)
جو ہے اب
کیا نجر جنگ ہائے عجب
زندگی کی اُسی
نرم و شیریں سی بنتی ہوئی گود میں

عجب آن ہے یہ

عجب آن ہے یہ
جو میں ہی
تھکاوٹ کچھ ایسی
یہ خود پر سو وُہ طور طاری
سی دیکھوں
کہ کیا یاد آئے کہ کیا خوب ٹھہرے
کہ کس سے تھی نسبت
بڑی اِک
کہ کس دم تھا کیا میں جواں سا
کہ اب بھی تو بنتا ہے کیا یُوں

o

جانے کیوں آئے ہیں

ہم کہ خوابوں ہی کے
ہیں عجب سو طرح سے یہاں
اِن سے ہی
پاشاں
گہ بہت کامراں گہ بہت بازیاں
جانے کیوں آئے ہیں
جانے کیا
اِس جگہ پھر یہی ہے بہت

ایسا ہے کہ....

وفا چشتی

ایسا ہے کہ خواب زمانے خواب ہُوئے
ایسا ہے کہ عہدِ خزاں کا خُونی لمحہ ٹھہر گیا ہے
ایسا ہے کہ بادِ صبا کے صرصر جھونکے
برق گرانے آتے ہیں
ایسا ہے کہ حبس زدہ سنائے زرد فضاؤں میں
تیز تپک سے آگ لگانے آتے ہیں
ایسا ہے کہ خُون آشام سی حبس رُتوں کے آنگن میں
سُرخ سنہری دلآویز رُوپہلی صُبحیں قتل ہوئیں
ایسا ہے کہ خواب زمانے خواب ہوئے
ایسا ہے کہ دلآویز رُوپہلی صُبحیں قتل ہوئیں
ایسا ہے کہ رنگ سرا کو جانے والے سب رستے
لمحہ لمحہ تیرگیوں میں اوجھل ہوتے جاتے ہیں
ایسا ہے کہ راہروانِ منزل رستہ بھول گئے ہیں
ایسا ہے کہ بھولے بھٹکے بے سامان مسافر لوگ
ذات صفات کا درک دراک اُٹھائے تنہا تنہا سے
دشتِ وُجود کی پہنائی میں بھٹک رہے ہیں
ایسا ہے کہ خواب زمانے خواب ہُوئے
ایسا ہے کہ راہروانِ منزل رستہ بھول گئے
ایسا ہے کہ بکھر چکے اس قافلے کا ہر تنہا شخص
دریائے انوار کا مُستہلک قطرہ
زخموں کے انبار اُٹھائے پھرتا ہے
اور اثنائے وحشت میں
ظلمتِ محض کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے
ایسا ہے کہ خواب زمانے خواب ہُوئے!!!
ایسا ہے کہ نُور سویرے قہر شبوں کی قید میں ہیں
ایسا ہے کہ آج بھی قاتل زرد رُتیں
اپنے آپ کو سانجھ سویرا کہتی ہیں
ایسا ہے کہ یہ چمکیلی سبز فضائے زہر آلود
فطرت کو، تاریخ کو، وقت کو، ہستی کو
سبز دلاسوں دھوکہ دیتی رہتی ہے
ایسا ہے کہ قاتل زرد رُتوں کا زعم
فطرت فکر زمانوں وقت کی ضربت سے
ریزہ ریزہ ہو کر گرنے ماضی ہونے والا ہے
ایسا ہے کہ عہدِ خزاں تحلیلِ وفا کی زد پہ ہے
ایسا ہے کہ خواب حویلی نُور نہانے والی ہے
ایسا ہے کہ خواب زمانے لوٹ کے آنے والے ہیں

O

قطعات

بیادِ احمد ندیم قاسمی

تصیر نوری

رشکِ نجم و کہکشاں احمد ندیم
آفتاب ضوفشاں احمد ندیم
ہیں پسِ تخلیقِ فن وہ جاوداں
ہیں عیاں ہو کر نہاں احمد ندیم

آنکھوں میں انقلاب کا منظر لئے ہوئے
اور دل میں ایک شورشِ محشر لئے ہوئے
ہر تشنہ لب کی پیاس بجھاتے رہے ندیم
فکر و نظر کا ایک سمندر لئے ہوئے

ہوائے مرگ نے آخر بجھا دیا وہ چراغ
دکھائی کچھ نہیں دیتا مجھے اندھیرے میں
بغیر اس کے مجھے ہو رہا ہے یہ محسوس
کسی کو جیسے کوئی چھوڑ جائے رستے میں

نہ ل کے تجھ سے بھی لگتا ہے تو تھا اپنا وجود
جو تو نہیں تو محبت میں چاشنی ہے کہاں
گلہ کریں تو کیا روشنی بکھرنے کا
خدا کے بعد کوئی چیز دائمی ہے کہاں

O

ادب کا بطلِ جلیل

(احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے چند رباعیات)

مشتاق شبنم

دل رنج کی جانب ہوا مائل دیکھو
در پیش ہوئی اک نئی مشکل دیکھو
اس درجہ ہے تخلیق کے حرفوں کو ملال
رونے لگے اوراقِ رسائل دیکھو

تسلیم ہے ہم سب کو بڑائی اس کی
ثبت ہے ہر اک شعلہ نوائی اس کی
ہر جذبے میں ہے اس کے تیقن کی فضا
ہر فکر ہے واللہ رجائی اس کی

بھولیں گے سخنور نہ محبت اس کی
تھی باعثِ صد فخر روایت اس کی
اے دوست ادب کا تھا وہ اک بطلِ جلیل
چھوٹوں کو بڑا کر گئی شفقت اس کی

گزرے ہوئے وقتوں کی ہے شاہد ساعت
تکلیف سے گزرا ہے وہ کیسی راحت
ہر چند تھا اس رہ میں دل و جاں کا زیاں
ہر حال میں کی اس نے ادب کی خدمت

انصاف و محبت کا دیا اس نے پیام
ہر حرفِ وفا اس کا ہے روشن سرِ عام
افعال میں کردار میں یکساں تھا وہ
اس شخص کی عظمت کو میں کرتا ہوں سلام

نذرِ مُعین

(ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر لکھی گئی)

شگفتہ نازلی

دھرتی پہ علم روشنی کو بانٹتے رہے
تدریسی فضاؤں کے بھی وہ آسمان تھے
سب کو عزیز رکھتے اور سب کے لئے کوشاں
کیونکہ وہ تھے معین اور وہ مہربان تھے!
ترتیب اور تالیف کی شمعیں جلا گئے
سو آگہی کی روشنی ذہنوں کے پاس ہے
ہر ایک یہی سوچتا عجلت تھی ایسی کیا
وہ کیا گئے کہ شعبۂ اُردو اُداس ہے!
پلکِ کتب کے کھولتے احساس ہوتا تھا
کیسا ہے منفرد سا یہ پہلو جمال کا
پھر ایسے زاویے بھی تھے سرورکن کہ جب
سنجیدگی کے ساتھ مزاح بھی کمال کا!
تحقیق اور تدوین کا پھیلاؤ ایسا تھا
کہ بیشتر اوقات خود کو محو پاتے تھے
اس گوناگوں معمول کا گھیراؤ ایسا تھا
کہ ادبی تقریب میں کم کم ہی جاتے تھے!
آنا اور جانا تو لگا رہتا اِداروں میں
وی سی اِتنا خوش نصیب کہ اُن سا کوئی کہاں
حُسنِ سلوک میں رہے اپنی مثال آپ
تحریم تھے تعلیم کی تدریس کا جہاں!

1 ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب ۳۲ برس تک گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں بطور صدر شعبۂ اردو تدریسی علمی و ادبی خدمات بطریق احسن انجام دیتے رہے۔

گیت

ناصر شہزاد

راجہ جی کا باغ
جس کے ہرے کُنج میں کھیلا ہم نے مِل کر پھاگ..... راجہ جی کا باغ
ندی.... نرمل گھاٹ
تھرکے تھرکے پاٹ
بجرے سُرخ انار
چھاؤں ٹھنڈی ٹھار
رُت سادھے بیراگ....... راجہ جی کا باغ
کویل کُوہوکو
اندر..... باہرتُو
برہا۔بُعد۔الاؤ....
بجریں نرول کے گھاؤ
جیون آگ سہاگ....... راجہ جی کا باغ
ساگر بن کیلاش
تُو۔تیرے بیر کاش
دھرتی گگن سے دُور
بیچ میں دل مجبور
گلے پڑا کھڑ اگ....... راجہ جی کا باغ
من مالا پر جاپ
جیسے تیز الاپ
میں تُو کی تکرار
بخشے بھی بیکار
آبردے میں جاگ..... راجہ جی کا باغ

تخلیق عصر

عطیہ سکندر علی

اُردو کی نئی بستیاں

ساہتیہ اکادمی دہلی بھارت کے زیر اہتمام 18 تا 20 مارچ 2005 میں "اردو کی نئی بستیاں" کے عنوان سے عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں بھارت کے کونے کونے سے اہل قلم کی شرکت کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، کناڈا، جرمنی، چین، روس، ماریشس، مشرق وسطیٰ اور پاکستان سے کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے اہل قلم شریک تھے۔ اس تین روزہ کانفرنس میں اردو زبان کے مسائل، اردو ادب کا ارتقا، اردو رسم الخط کی دشواریاں اور اردو صحافت کے حوالے سے اخبارات، رسائل وجرائد کو درپیش مسائل کا عرق ریزی سے جائزہ لیتے ہوئے درپیش مسائل سے نپٹنے کی تدابیر پر مشتمل کم و بیش پچاس مقالے پیش کئے گئے۔ ساہتیہ اکادمی دہلی بھارت کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خیال افروز صدارتی خطاب، محترمہ منیرہ جہاں کا افتتاحی خطبہ، ڈاکٹر سید تقی عابدی کے کلیدی خطبے اور جناب شین کاف نظام کے کلمات تشکر کے علاوہ پروفیسر وارث علوی، جناب قیصر تمکین، جناب رضا علی عابدی، جناب نظام صدیقی، ڈاکٹر سیفی سرونجی، جناب ف۔س۔ اعجاز، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، جناب ستی نجم، ڈاکٹر عبدالرحمن عبد، جناب حیدر قریشی، جناب مرتضیٰ کریم، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، جناب ناصر بغدادی، جناب افتخار امام، جناب برج کول، جناب وکیل انصاری، جناب خلیل الرحمن، جناب آفاق احمد، محترمہ عالیہ امام، محترمہ یاسمین لودھی، گلزار جاوید، محترمہ شکیلہ رفیق، جناب اطہر رضوی، جناب عبدالمنان طرزی، جناب فرحت شہزاد، جناب ہمایوں ظفر زیدی، جناب مسعود منور اور جناب امجد اسلام امجد نے اردو زبان و ادب اور صحافت کو اردو کی نئی بستیوں میں درپیش مسائل پر بے پناہ نئے زاویوں سے نہ صرف روشنی ڈالی بلکہ جدید دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اردو زبان، اردو ادب، اردو کا رسم الخط اور ادبی رسائل وجرائد کو اپنے عصر کے ساتھ مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے نبرد آزما ہونے اور اردو زبان و ادب کو ترقی کی جانب مائل رکھنے پر ماہرانہ انداز میں زور بھی دیا اور اردو دنیا کی باہم یکجائی اور یکسوئی کو بھی وقت کی اہم ضرورت گردانا۔ ہمارے خیال میں اردو زبان اور اردو ادب سے کم سے کم واقفیت اور تعلق کے حامل فرد کے لئے بھی "اردو کی نئی بستیاں" ایسا انسائیکلوپیڈیا ہے جس کے مطالعے سے معلومات کے بہت سے نئے گوشے اور ترقی کے بہت سے نئے راستے تراشے جا سکتے ہیں۔ "اردو کی نئی بستیاں" چار سو چھیاسی صفحات مجلد پر مشتمل ہے عمدہ کاغذ اور بہترین چھپائی کی حامل یادگار ادبی دستاویز فقط تین صد ہندوستانی روپوں کے عوض رویندر بھون 35 فیروز شاہ روڈ دہلی، سواتی مندر مارگ نئی دہلی، جیون تارا بھون، 23/A، 44 ایکس ڈائمنڈ ہاربر روڈ کولکتہ، ممبئی مراٹھی سنگرہالے مارگ دادر ممبئی، سینٹرل کالج کیمپس ڈاکٹر بی آر امبیڈکر ویدھی بنگلور اور سن بلڈنگ کا مپلکس (دوسری منزل) انا سلائی تینام پیٹ چنئی پر دستیاب ہے۔

سیمیں کرن

☆

ستاروں کو بدلنا چاہتے ہیں
ترے ہم راہ چلنا چاہتے ہیں
بہت برق کئی ہستی ہماری
مگر اب ہم سنبھلنا چاہتے ہیں
سحر جیسی بھی ہو پھر بھی سحر ہے
شب غم سے نکلنا چاہتے ہیں
پھولوں سے برف رخصت ہو رہی ہے
یہ موسم اب بدلنا چاہتے ہیں
مہکتے شوخ جذبوں کی طرح ہم
ترے دل میں اترنا چاہتے ہیں
نہیں زندگی سے کی تھی آدمی
دیے تو کب سے جلنا چاہتے ہیں

شکرانہ

یہ جو بینائی کی نعمت ہے میسر ہم کو
اس کی توصیف کا پیمانہ نہیں ہو سکتا
کسی بھولے کو اندھیرے میں دکھائیں راستہ
اس سے بہتر کوئی "شکرانہ" نہیں ہو سکتا

ملیا!

کیسا ہے دستور
وہ نہیں لیکن
ہر کوئی منصور

بھلا کون بدذوق ہوگا جو اس قدر اجلی نکھری ستھری روشن دستور شاعری کی بابت کسی طرح کی تعریف، توصیف یا تحسین کے جملے رقم کرکے مخل ہونے کی آمیزش کا مرتکب ہوگا۔ زندگی اور اس کی حقیقتوں پر مہر ثبت کرتی "سیمیں کرن" کی سیدھی سادی شاعری جس طرح اپنے قاری سے ہم آواز و ہم ساز ہونے کو بے تاب ہے ایسی قدروں کا تخلیق کار بھی آپ سے گفتگو کو بے چین ہے۔
"اب جو میں ہُو کے "برزخ" کی روحانی نظموں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل ان تجربات و محسوسات کی خوشبو سے مہک تو اٹھتا ہے لیکن جب میں اس خوشبو کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرے چاروں طرف گلہ ہوئے آئینے مجھے کچھ

اور ہی منظر دکھانے لگتے ہیں۔ حسن کا بہروپ مجھے آج بھی اچھا لگتا ہے لیکن اب میری آنکھیں اس سے آگے اس کے پار اور اس سے ماورا بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں آج بھی خواب دیکھتا ہوں مگر اب وہ سب کے سب صرف میری ذات کے آئینہ دار نہیں ہوتے اب ان میں میرے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات بھی جلوہ گر ہوتی ہے ظلم کے خلاف اور انسانی حقوق کی حمایت میں میں نے ہمیشہ لکھا ہے لیکن اب شاید میں ان موضوعات کو نسبتاً زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھ سکتا ہوں۔ اپنی ہی اور قومی تاریخ پہلے بھی مجھے بے چین رکھتی تھی اور اب بھی مجھے منظر اور پس منظر دونوں بیک وقت پریشان اور حوصلہ مند رکھتے ہیں“ ..... امجد اسلام امجد۔ جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور کے زیر اشاعت کتب قابل اعتبار اور دیدہ زیب ہوا کرتی ہیں مگر جب یہی ادارہ جناب امجد اسلام امجد کی شاعری کو زیورِ طبع سے آراستہ کرتا ہے تو اس کا رنگ روپ ہی انوکھا اور نرالا ہوا کرتا ہے۔ ہمارے دعویٰ کی تصدیق 225 روپے کے عوض جہانگیر بک ڈپو لاہور، کراچی، ملتان، حیدرآباد، فیصل آباد، راولپنڈی سے بآسانی کی جاسکتی ہے۔

جوش ملیح آبادی

حضرت جوش ملیح آبادی جس قدر بلند آہنگ شاعر تھے اسی قدر توانا شخصیت کے مالک بھی تھے۔ ان کی شخصیت و فن جس خصوصی توجہ کے مستحق گردانے جاتے ہیں ناقدینِ ادب نے جوش صاحب کو ان کے استحقاق کے مطابق توجہ نہ دے کر ایک طرح سے تساہل کا مظاہرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب نے ”جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ“ میں اس محرومی کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کافی محنت لگن و توجہ کے ساتھ زیر نظر کتاب کا مواد ترتیب دیتے ہوئے اسے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ”حرفِ چند“ ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب نے اس باب میں ابتدائیات کے علاوہ جوش صاحب کے فکر و فن پر چار مضامین سپردِ قلم کئے ہیں۔ (۱) جوش کی فکری اور شعری روایات (۲) جوش کی رومانوی شاعری کا پس منظر (۳) جوش۔ اردو شاعری کا نیا موڑ (۴) جوش اور عظمتِ انسان۔ دوسرا باب جوش ایک مطالعہ پر مشتمل ہے جس میں روحِ ادب سے عروجِ مبارک میں جوش صاحب کی ولادت سے لے کر پرورش، تعلیم، حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری کے فنی ادوار پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ طلوعِ فکر سے نجوم و جواہر تک میں جوش صاحب کی شخصیت و فن کے اس دور پر گفتگو کی گئی ہے جو قیام پاکستان سے منسوب ہے۔ اس مضمون میں بہت سے مقام آہ و فغاں بھی آتے ہیں مگر ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے نہایت توازن، تدبر اور احتیاط سے ان مقامات کو عبور کیا ہے۔ پس مرگ مجموعہ ”محراب و مضراب“ پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی فرماتے ہیں: ”محراب و مضراب“ کے جوش ملیح آبادی کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے ہر مجموعہ کی طرح یہ مجموعہ جوش کے تعلّی پسند مزاج کا مظہر ہے۔ وہ خود کو شاعرِ آخر الزماں سمجھتے تھے اور اس لئے اس مجموعہ کا ایک حصہ جوش کی آخری محبوبہ بہ لقب ”فتنۂ آخر الزماں“ کے نام ہے“ تیسرا باب نہایت اہم ہے جس میں ”ہمارے جوش صاحب“ کے عنوان سے فرمایا ہے ”مقامِ مسرت ہے کہ جوش ملیح آبادی کے سلسلے میں ضروری نگارشات کی ابتدا ہو چکی ہے گذشتہ چند برسوں میں پاکستان، ہندوستان میں متعدد تصانیف و تالیفات شائع ہوئی ہیں جن سے جوش فہمی میں اضافہ ہونے کی اُمید ہے“ اس کے علاوہ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے غالب، جوش اور فیض ”تین آوازیں تین لہجے“ کے عنوان سے تینوں اہم اور قابل احترام شعراء کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اسی باب میں ”جوش تیزرو جوانی کا ہدف“ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب محترم نے جوش صاحب کے آبا کی ہجرت اور ادوار میں ان کی علمی اور ادبی خدمات و فتوحات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چوتھے باب میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب نے جوش صاحب کے حالاتِ زندگی مربوط طریقے پر بیان کرنے کے ساتھ جناب شاہد احمد دہلوی اور حضرت جوش ملیح آبادی کے تاریخی مضامین شامل کر کے زیر نظر کتاب کو سطر بالا کے ساتھ مطالعاتی اور دلچسپ کتاب بنا کر کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی وسعت مطالعہ اور دقتِ نظر کے قائل وہ بھی احباب ہوں گے جو ”جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ“ سے مستفید ہوں گے۔ اردو ادب سے وابستہ کون شخص ہوگا جو اس مفید اور معلوماتی کتاب کی بابت جستجو، اشتیاق اور لگن نہ رکھتا ہو۔ آپ کی تمام کیفیات کا حل، مکتبہ دانیال صدر کراچی، ویلکم بک اردو بازار کراچی، اوقاف مطبوعات گلشن اقبال کراچی سے فقط دو صد روپے کے عوض ممکن ہے۔

جاگتی تنہائیاں

کبھی اگر اردو زبان و ادب اور شاعری کی بابت غیر جانبدارانہ بے لاگ جستجو، تحقیق اور تجزیہ کیا گیا تو یہ بات روشن تر ہو کر سامنے آئے گی کہ جب کی اس زبان جسے ایک عالم ”اردو“ کے نام سے جانتی اور مانتی ہے اس کی ترقی اور تابانی میں اہلِ زبان کے ساتھ ان لوگوں کی کاوشات بھی برابر کی حصہ دار ہیں جنہیں اس زبان اور اس کے علمی ماخذ سے کسی طرح کا جذباتی لگاؤ، عقیدت اور کسی طرح کا کوئی مادی فائدہ ہرگز نہ تھا۔ ایک ایسا ہی آسودہ اور خوشحال، معتبر و نہال نام جناب بابا سری واستو عرف بد ساغری صاحب کا بھی ہے جنہیں پروردگار نے اس جہانِ فانی میں قدم رکھتے ہی ایسی نعمت سے سرفراز کیا جس کی کوئی بھی فانی شخص خواہش کرسکتا ہے تمام تر اعتبار اور احتیاط، عزت و حشمت کی موجودگی میں جناب بد ساغری اردو زبان، اردو شاعری اور اردو ادب کے عشق میں اس درجہ گرفتار ہیں جس کا بیان کسی کی زبانی زیادہ بھلا اور زیادہ متاثر کن لگتا:

ہر نفس تار تار چاہتا ہوں
زندگی سے فرار چاہتا ہوں
ہو رہی ہے خلوص کی توہین
پھر تا کا سنگار چاہتا ہوں

☆

میں تنہا ہوں کوئی لشکر نہیں ہے
میرے کاندھوں پہ سر میرا نہیں ہے
یہ کس معمار نے دیوار چن دی
عجب ہے کہ اس میں در نہیں ہے

☆

زخم اوڑھے ہوئے تھی تیرہ شبی
کیسے امکان نیا دیکھا میں
اپنے اسلاف کی حویلی کو
کتنے حصوں میں بٹا دیکھا میں

مد ساغری کے تازہ شعری مجموعے سے انتخاب یا چیدہ اشعار پیش کرنا نہایت دقت طلب امر ہے۔ ہر غزل اور غزل کا ہر شعر اس قدر توانائی اور معنویت کا حامل ہے کہ تفصیل میں جائے بغیر بات کسی طور بنتی نہیں۔ ایک صورت مد ساغری صاحب سے تفصیلی تعارف اور ملاقات کی یہ بھی ہے کہ انہیں اور ان کے کلام کو ان کے احباب کی عینک سے جانچا اور پرکھا جائے۔

مد صاحب کی قادرالکلامی مسلّمات کے بکھراؤ اور انجذاب کا کرارا پن اور عجز سے بکی اولاانگیزی کی دلیل ہے.....ڈاکٹر ظفر حنفی

مد ساغری کا انداز بیاں انوکھا، اسلوب سچا اور انوکھی لفظیات ہمارے شب و روز کی سچی تصویریں ہیں.....ڈاکٹر ملک زادہ منظور

جناب مد کی شاعری میں مختلف تمثال اور سلکی منفردیت حقیقی شاعرانہ وحدت کی صورت میں رونما ہوتی ہیں......ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

مد صاحب کے یہاں خیال اور اسلوبِ بیان کا بڑا خوبصورت سنگم جابجا ملتا ہے۔ ان کے شعروں میں ایک بہاؤ ہے، شگفتگی ہے اور ہلکا ہلکا درد ہے.....قیصر الجعفری

مد میرے لئے واقعی اعتنا اس طور ہیں کہ یہ اس روایت کے پروردہ ہیں جس نے باوجود جنیج کے اپنی شکستہ شناخت کو کچھ نہ کچھ ضرور باقی رکھا ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں تہذیب و شائستگی اور لطافت و نفاست کسی نہ کسی انچ سے وابستہ ہے.....ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

جناب مد غزل کے آئین و آداب سے واقف ہیں۔ ان کو مضامین نو کی تلاش رہتی ہے۔ وہ اپنی فکر کو بڑی مہمیز دے رہے ہیں۔ زمانہ حال کی تلخیوں، مایوسیوں اور امیدوں و تمناؤں کو اپنی غزل میں بیان کرتے ہیں اور فنی حدود میں رہ کر.....شمس الرحمٰن فاروقی

مد صاحب کی شخصیت اور شاعری ہماری تہذیبی زندگی کو منور کر رہی ہے.....مظہر امام

مد صاحب کی غزل پڑھ کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ میں اتنے عرصہ شاعر سے اب تک ناواقف تھا.....احمد ندیم قاسمی

رخصت سے قبل مد ساغری کے دو شعر آپ کی نذر ہیں:

آج پھر زخم ہو گئے روشن
آج پھر جیت چارہ گر کی ہوئی
کیسی اداسی کا عالم تھا
دھوپ دیوار کی زرد کی ہوئی

"جاگتی تنہائیاں" ایک سو ہندوستانی روپوں کے عوض نرالی دنیا پبلی کیشنز، بازار دہلی گیٹ، سوان پبلشنگ ہاؤس کولا مارکیٹ دریا گنج دہلی اور براہ راست مصنف سے R-16 سیکٹر XI نوئیڈا بھارت سے طلب کی جا سکتی ہے۔

حسرتِ تعمیر

جناب اکرام بریلوی ناول نگاری کے فن میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ "حسرتِ تعمیر" سے قبل جناب اکرام بریلوی کے چھ ناول "نیا افق"، "گردش"، "لاوا"، "پل صراط"، "آشوب سرا"، "جمع تفریق تقسیم" اور تنقید کی چار کتابیں "آئینہ"، "جوش شخص و شاعر"، "عشرت آفریں کی شاعری"، "حکیم مومن خان مومن" علمی اور ادبی حلقوں میں اپنے حصے سے زیادہ داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ عنقریب تنقید کے حوالے سے ان کی پانچویں کتاب "بین السطور" بھی منظر عام پر آنے والی ہے۔ بات در حقیقت بھر کتابوں یا فن کے متنوع موضوعات تک محدود نہیں رکھی جا سکتی۔ قصہ مختصر ہے چھ دہائیوں پہ محیط جناب اکرام بریلوی کا پہلا ناول 1946ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر جناب اکرام بریلوی کی صلاحیتوں کا اعتراف کر چکا ہے۔ چار سو صفحات پر محیط کسی بھی تحریر کو متعارف کرانے کے لئے چار الفاظ، چار لائنیں یا چار صفحات کسی طور پر مصنف کے قلم نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی تو قبا قصہ مطالعہ یا ابراز انداز نے ہی اتنے بڑے اور منفرد قلم کی خدمات کا اعتراف درست طور پر کر سکتی ہیں۔

"اکرام بریلوی کے ناول تاریخ کے تناظر سے ابھرتے ہیں۔ اب وہ ماضی سے عصری تاریخ کی طرف آ چکے ہیں اور انہوں نے زمانی اعتبار سے بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ ادھر کئی برسوں سے وہ شمالی امریکہ میں مقیم ہیں لیکن انہوں نے وطن سے اس دوری کو بھی کارِ خیر میں بدل دیا ہے۔ ان کے ناولوں میں وہ مسائل بھی جگہ پا رہے ہیں جو مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے میل ملاپ سے پیدا ہوتے ہیں یا جو اس میل ملاپ کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ انہوں نے مختلف ناولوں میں مختلف جغرافیائی خطوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کے زندہ مسائل کو برتا ہے۔ "حسرتِ تعمیر" بھی ہمیں ایک بحران زدہ خطے میں لے جاتا ہے جہاں مستقبل کی فکر گری ہو رہی ہے اور ساتھ ہی زندگی نت نئے مسائل اور تضادات سے ہم آغوش ہوتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پچھلے ناولوں کی طرح اکرام بریلوی نے "حسرتِ تعمیر" میں بھی کوئی پیغام نہیں دیا مگر ان سب ناولوں میں پیغام ہے بھی جو پڑھنے والے خود اخذ کرتے ہیں۔ زندگی کے تسلسل

اور اُس کے اپنا راستہ نکالنے کا پیغام۔ اکرام بریلوی صاحب اس سخن شوق پر گامزن رہنے کے لئے بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں"..... ڈاکٹر سید جعفر احمد

مختصر افسانہ، نظم، غزل وغیرہ سے نوعاتی پیشکش کی اعتبار سے مستحسن ہوا کرتی ہے۔ چار سو صفحات اور تین ابواب جن میں جستجو، لگن، تحریر و تحقیق، معلومات اور تلخ حقائق پوشیدہ ہیں مختصراً بیان کیا جائے تو کار دشوار ہے۔ اس دشوار عمل کی نسبت جناب اکرام بریلوی کی تازہ علمی کاوش کی دستیابی اور مطالعہ جو فقط چار سو پاکستانی روپے اور پندرہ امریکی ڈالر کے عوض "اختیار" اکادمی گلشن اقبال سے مشروط ہے، بنا دو آسان ہے۔ آپ کی سہولت کے پیش نظر فاضل مصنف کا پتہ بھی درج کیا جا رہا ہے 5700, Prairi circle,
Mississuaga, On LSN 6B6, Canada

حیا کے آنسو

"ہما کا کلام دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ان کے اندر ایک اچھا شاعر چھپا بیٹھا ہے اور ان سے نکالنے کے لئے بے چین ہے۔ کلام پڑھ کر یہ بھی محسوس ہوا کہ اگر وہ اسی طرح جم کر شاعری کرتی اور مشق و مطالعہ سے اپنے فن کو نکھارتی رہیں تو ایک دن نامور شاعرہ بن کر افقِ ادب پر نمایاں و ممتاز ہوں گی"..... ڈاکٹر جمیل جالبی

میں نے ان کے اندر ایک نہ ختم ہونے والی لگن دیکھی ہے۔ وہ اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے ادب کی آبیاری میں اپنا حصہ ضرور شامل کریں۔ ہما نے مسلسل کاوش کے ذریعے وہ منزل تلاش کر لی ہے جو انہیں مطلوب تھی۔ مجھے یقین ہے کہ "حیا کے آنسو" رائیگاں نہیں جائیں گے اور یہ آنسو ایک دن گلشنِ ادب میں پھولوں کی طرح مہکیں گے"..... پروفیسر سحر انصاری

ہما انجم کا آبائی وطن اعظم گڑھ، جائے پیدائش کراچی، تعلیم بی ایس سی اور ایم اے اردو کے علاوہ مطالعۂ مشاہدے کے ساتھ امور خانہ داری احسن طریقے پر نبھا رہی ہیں۔ شاعری میں رہنمائی کے لئے اب تک جناب نثار احمد، جناب غالب عرفان اور پروفیسر سحر انصاری سے تلمذ حاصل کر چکی ہیں۔ ذرا دیکھئے تو سہی ڈاکٹر جمیل جالبی اور پروفیسر سحر انصاری جیسے علمی ادبی کوہساروں سے سند تعریف حاصل کرنے والی شاعرہ کا شعری رنگ کس طرز اور کس ادا کا ہے:

اس شہر کے لوگوں میں محبت کی کمی ہے
تنہائی کا منظر ہے کہ آنکھوں میں نمی ہے
بادل کو مرے درد کا احساس نہیں کچھ
بارش مری آہوں کی شدت سے تھمی ہے
یہ آج کی عورت کہ ڈرامے کا ہے کردار
فرعون کی کہانی ہوئی تازہ گی ہے
ہم دیکھا کئے اور یہاں اڑتی رہی دھول
اس بار کتابوں پہ بہت گرد جمی ہے
حیرت ہے کہ ہی صورت ہے جنگل بھی سڑک بھی
کمتی ہو ہما پھر بھی کہ زیادہ کی کمی ہے

"حیا کے آنسو" سے ہم نے کئی منتخب غزلوں کے چیدہ اشعار نشان زد کیے تھے مگر اس ایک ہی غزل نے ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اب "حیا کے آنسو" سے ایک نظم "دعا" ملاحظہ فرمائیے۔

مرے ہاتھوں کی ریکھائیں/ جو تیری ہیں/ تو اشکوں سے ان ہاتھوں میں/ لہو کی نہر/ خونِ دل سے میں جس دم نکالوں گی/ اشق دیکھے گی/ آبِ سحر میں سے میں وضو کر کے/ کروں گی جب سے دل سے/ اور دعائیں بھی یہ مانگوں گی/ کہ اسے تو پالنے والے/ دعاؤں کی سب صدائیں سن رہا ہے/ اور دعائیں قبول کرتا ہے/ تو پھر/ اگر دے وہ قلم میرے لکیروں میں/ محبت کو/ کسی کا نام لکھ کر/ میرے ہاتھوں میں امر کر دے

ادب کی دو عظیم اور قابلِ احترام ہستیاں اور تخلیق کار کے دو منتخب شہ پارے تعارف اور اشتیاق کو مہمیز دینے کے لئے اتنے ہی کافی ہیں جتنے محبوب کا ایک جلوہ، صبح کی ایک کرن، شام کی ایک شفق اور حیا کا ایک آنسو ہوا کرتا ہے۔ "حیا کے آنسو" بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان کے تعاون سے مبلغ ایک سو پچاس روپے کے عوض پوسٹ بکس نمبر 17667 کراچی 75300 سے با آسانی دستیاب ہو سکتی ہے۔

نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے

"نعت اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک صنف ہے ہیئت کے لحاظ سے نہیں۔ اسی طرح حمد بھی ایک صنف ہے موضوع کے اعتبار سے اس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں۔ لہٰذا حمد و نعت معنوی طور پر اپنی شناخت رکھتی ہیں اور یہ ایک سیلِ بے پناہ کی صورت ہمہ گیر ہے۔ نعت غزل کی ہیئت میں بھی ہے اور رباعی کے پیمانے میں بھی۔ نعت قصیدے کی شکل میں بھی ہے اور مثنوی نیز طویل نظموں کی صورت میں بھی۔ مگر ان کا تعلق روایتی اور کلاسیکی ادب سے ہے۔ اب جو عالمی سطح پر ادبیات میں ایک انقلاب سا آ گیا ہے اور تغیرات و تجربات نے سر نکالے ہیں تو وہ بھی حمد و نعت کے نفوذ و تسلط سے بری نہیں۔ اردو فارسی اور عربی کے مسلمہ اصناف کے ساتھ انگریزی، فرانسیسی، جاپانی، چینی اور ہندی ادب کے معروف اور غیر معروف، مانوس و غیر مانوس ہیئتوں (صنفوں) میں شعراء نے خامہ فرسائی شروع کر دی ہے اور نعت کی فیوض و برکات کا سلسلہ ان کم دیدہ و کم شنیدہ ہیئتوں تک دراز کر دیا ہے۔ ادبی سطح پر یہ امیاتی عمل ایک حقیقت ہے، اس سے انکار ممکن نہیں"....... پروفیسر طلحہ رضوی

درج بالا اقتباس جناب علیم صبا نویدی کی تازہ کاوش "نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے" کی بابت پروفیسر طلحہ رضوی کے پر مغز پیش لفظ سے آپ کی نذر کیا گیا ہے جس کی روشنی میں آپ آسانی سے نعت میں، حمد میں اور دیگر شعری اصناف میں ہیئتی تجربوں کی بابت مفید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ جناب علیم صبا نویدی

نے اپنی ژرف نگاہ، جستجو اور کاوش سے "نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے" میں شاعری کی بے شمار
اصناف مثلاً نعتیہ مرثیہ، نعتیہ قصیدہ، نعتیہ ترکیب، نعتیہ مناجات، نعتیہ نوحہ، نعتیہ
مسدس، نعتیہ مخمس، نعتیہ سلام، نعتیہ رباعی، نعتیہ قطعہ، نعتیہ آزاد اور پابند نظم، نعتیہ
نثری نظم، نعتیہ سانیٹ، نعتیہ ترائیلے، نعتیہ ہائیکو، نعتیہ واکا، نعتیہ آزاد غزل، نعتیہ ماہیا،
نعتیہ دوہا، نعتیہ گیت، نعتیہ لوری، نعتیہ ڈوہڑہ، نعتیہ کہہ مکرنیاں، نعتیہ چوبولے، نعتیہ
ثلاثی، نعتیہ کجری، عنوانات میں اس قدر وسعت اور گہرائی ہے کہ متن میں کس قدر
معنی آفرینی اور معلومات کے خزانے پوشیدہ ہوں گے۔ آپ کی توجہ خاص کے
لئے ڈاکٹر فدا رھی کے دستخط قلم سے مختصر اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جو ڈاکٹر
صاحب محترم نے "نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے" کی بابت رقم کئے ہیں۔

"عظیم صبا نویدی صاحب نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ نعتیہ
شاعری میں جس قدر بھی ہیئتی تجربے کئے گئے ہیں، چاہے وہ تجربے متقدمین شعرا
کے رہین منت ہوں یا متاخرین کے قلم کی دین ہوں، موصوف نے انہیں بڑی
تلاش و تجسس کے بعد نہ صرف یکجا بلکہ ان کے سیاق سباق، پس منظر اور پیش منظر کا
بھی تفصیلی جائزہ لیا۔ چنانچہ اس کتاب میں عظیم صبا نویدی نے مثنوی، مخمس، مسدس،
قصیدہ، سلام، رباعی، آزاد غزل، نظم آزاد، نظم دوہے، ماہیے، ثلاثی، سانیٹ، ترائیلے،
ہائیکو، واکا، گیت، لوری، کجری، کہہ مکرنیاں جیسی سطری نعتیہ نظمیں پیش کرتے ہوئے
اردو ادب پر یہ احسان کیا ہے کہ انہوں نے نعتیہ شاعری کے عاشقان اور شعر و سخن
کے شائقان کو عموماً ذات مصطفوی سے والہانہ عقیدت رکھنے والوں کو خصوصاً اس
قدر مواد فراہم کر دیا ہے جس سے قاری کے ذوق سلیم کی ایک طرف تسکین ہو کر
دوسری طرف تحقیقی خزانے میں گراں بہا اضافہ بھی ہو جائے۔ آپ کا ماہرانہ
اُسلوب اور محققانہ طرز تحریر کا کمال اس امر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے ہر صنف
اور ہیئت کی تعریف اور تعارف کراتے ہوئے اپنے زریں خیالات اور باوقار آرا
کو بھی برملا ظاہر کیا ہے جس سے سخن فہمی اور ادب شناسی کے نئے دروازے وا
ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔"

"نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے" ایک سو چھتیس صفحات پر محیط ہے،
کاغذ اور چھپائی کا معیار بھی اعلیٰ ہے۔ قیمت تین صد روپے ہندوستانی اور دستیابی
کے پتے مندرجہ ذیل ہیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، علی گڑھ، ممبئی، مکتبہ کوکما راجہ گلی،
بگن پور 111، بھاگل پور (بہار)، شگوفہ پبلی کیشنز، معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد۔
مکتبہ ماہنامہ ادب، محمد علی لائن لکھنؤ، مکتبہ ماہنامہ سباق، پٹنہ، مکتبہ ماہنامہ رنگ
کولکتہ بھارت۔

ارتقا ۴۱

"ارتقا" کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات سے اردو ادب کا
قاری بخوبی آگاہ ہے۔ "ارتقا ۴۱" اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس بار
"ارتقا" نے قریباً پانچ صد صفحات کی اشاعت کلی طور پر برصغیر کے ادبی، سیاسی،
سماجی اور فکری لیجنڈ جناب سجاد ظہیر سے منسوب کیا ہے۔ ممکن ہے بہت سے
احباب جناب سجاد ظہیر کی فکر و خدمات سے اختلاف بھی رکھتے ہوں مگر ان کی بلند
قامتی سے انکار کرنا ایک طرح سے علم و ہنر سے انکار کے مترادف تصور کیا جائے
گا۔ "ارتقا" نے اس اہم اشاعت میں برصغیر کے کونے کونے سے اہم اور بلند
قامت اہل قلم کی نگارشات کو یکجا کر کے ترقی پسند تحریک، جناب سجاد ظہیر اور ان
کے ہمراہیوں کے کردار کی بابت بہت معلوماتی اور پر مغز مواد مہیا کیا ہے۔ ادارہ
"ارتقا" نے ہمارا موقف کے عنوان سے ابتدائیہ میں صورت حال کی وضاحت اس
طرح کرنا مناسب سمجھا ہے "اس صداقت میں کوئی کلام نہیں رہتا کہ سجاد ظہیر
ایک فرد سے زیادہ ایک نظریہ حیات کا نام بن چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب صورت
حال یہ ہو جائے تو پھر سجاد ظہیر کے نظریہ حیات کی استقامت صرف ان کی فکر سے
متفق لوگوں کی غیر تنقیدی روش نہیں رہ پاتی بلکہ اسے اس نظریے کے مخالفین کو سخت
تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا خیال ہے گلوبلائزیشن کے دقیانوسی نظام نے
جسے نیو لبرل ازم کا فریب نام دیا گیا ہے، دنیا بھر میں محنت کشوں کی زندگی اس
درجہ ویران بنا دی ہے کہ پورے یورپ اور امریکہ میں بطور خاص وینزویلا اور
بولیویا میں یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ اب ہماری دو دنیاؤں میں سے کسی ایک کا
انتخاب کرنا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں معیشتوں پر قابض طاقتور سیاسی گروہ عام
لوگوں کی بہبود کی اسکیموں کو معاشی طور پر غیر سودمند خیال کرتے ہیں اور ایک ایسی
دنیا جو کمزور اور ناتواں طبقات کی بہبود کے لئے موثر انداز میں حکمت عملیاں وضع
کرنے کو مقدم سمجھتی ہے۔"

ارتقا کی اس اہم اشاعت کا احاطہ کسی مختصر تحریر و تبصرہ میں کرنا نہایت
دشوار عمل ہے۔ آپ متذکرہ محترم اہل قلم کے اسمائے گرامی پر نظر دوڑائیے جو اس اہم
اشاعت کو اعتبار بخش رہے ہیں تو آپ کو "ارتقا" کی اس باوقار اشاعت کی
افادیت کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ پروفیسر محمد حسن صاحب، پروفیسر قمر رئیس
صاحب، ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب، جناب اشفاق سلیم مرزا، ڈاکٹر شارب ردولوی
صاحب، جناب صدیق الرحمن قدوائی، جناب حمید اختر، ڈاکٹر انوار احمد صاحب،
جناب حسن عابدی، جناب عابد حسن منٹو، ڈاکٹر علی احمد فاطمی صاحب، جناب مغنی تبسم،
جناب محمد ابوالفضل، پروفیسر سحر انصاری صاحب، جناب عابد سہیل، ڈاکٹر سید جعفر
احمد صاحب، جناب مجیب جمال، جناب انوار حسن، جناب نیر رضوی، جناب اقبال
مجید، جناب یونس اگاسکر، جناب علی باقر، جناب عارف نقوی، جناب آفاق صدیقی،
جناب شفیق احمد شفیق، ڈاکٹر اسلم الہ آبادی، جناب صبا اکرام، جناب جمال نقوی،
جناب ایم خالد فیاض، جناب سجاد ظہیر، محترمہ حمیرا اشتیاق، محترمہ انور شاہین، جناب
قیصر تمکین، محترمہ علیہ خان، جناب احمد الیاس، جناب احمد حسین مجاہد، جناب کرامت
بخاری، مرزا حامد بیگ صاحب، جناب لاڑکل، جناب ضیا کشمی، جناب عبدالحمید ساز
اور جناب احمد سعید ملتانی۔ اردو ادب کی یہ نادر و نایاب دستاویز ارتقا مطبوعات
گکسو ہیر روڈ کراچی کے علاوہ خیابان آباد، نمبر 140 پر چار صد پاکستانی روپے میں
دستیاب ہے۔

رس رابطے

جمع و ترتیب و تدوین

اعجاز کھوکھر

برادرم جناب گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

آپ سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ بات کیا تھی بس شکریہ ادا کیا۔ آپ کے موقر جریدہ نے مجھے شرف پذیرائی بخشا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کے علم میں ہے کہ مرحوم ضمیر جعفری صاحب نے غالباً سب سے پہلے جو چند خطوط رسالہ کے گوشہ کے لئے تحریر کئے ہوں گے ان میں سے ایک مجھے بھی لکھا تھا۔ وہ مجھے بہت مان دیتے تھے یہ اُن کا کرم تھا۔ اُن کے مضمون کا ایک ایک لفظ اس دعوٰی کی دلیل ہے۔

میں نے آپ کے جریدہ کے تقریباً تمام گوشے دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ اور قرۃ العین حیدر سمیت تقریباً تمام اہم ادیبوں نے "چہارسُو" میں شائع ہونے والے گوشوں کو اپنے لئے اہم سمجھا ہے اور واقعتاً یہ دعوٰی درست ہے۔ آپ کا سوالنامہ خاصے کی چیز ہوتا ہے۔ مجھے یوں لگا کہ آپ نے میری تحریروں کو بہت زیادہ توجہ سے پڑھا ہے اور بعض بہت غیر متوقع نتائج اخذ کئے ہیں۔ یقین فرمایئے کہ میں آپ کے خیالات پر غور و خوض کے بغیر نہیں رہ سکا اور یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ لوگ چپکے سے اپنے رویوں میں لچک یا تبدیلی پیدا کر لیتے ہیں اور پھر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کس دوست کے "اشارہ" نے نئی راہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

آپ کے گوشہ کی اشاعت سے ذرا قبل ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر انوار احمد، پروفیسر حمید لغاری (سندھ ایجوکیشن سروس) اور ناصر عباس صاحب کے مضامین آئے۔ حیران ہوں کہ حکایات کی یہ بارش شاید اسی لئے ہوئی کہ آپ نے اس کی بنیاد رکھی تھی اور پھر یہ ہے کہ "ارتقا" نے بھی میرے بارے میں ایک گوشہ نکالنے کا اعلان کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ "چہارسُو" کا گوشہ اپنے سوالنامہ کے باعث میرے سلسلہ میں ضروری حوالہ ٹھہرے گا۔

(ڈاکٹر محمد علی صدیقی)

برادرم گلزار جاوید صاحب السلام مسنون۔

میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ میری غفلت، تساہل اور کم کوشی کا خیال نہیں کرتے اور مجھے "چہارسُو" مطالعہ کرنے کا باقاعدگی سے موقع دیتے رہتے ہیں۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب کی جو خدمت ان غیر سرکاری نجی پرچوں (رسائل) نے کی ہے جو مدیران کے ذوق و شوق، ادب کے فروغ اور اردو زبان کی محبت کے تحت چھپتے ہیں۔ ان رسائل کی اشاعت میں ان کی آمدنی کا کثیر حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ مدیران نقصان مالی ہی نہیں بعض اوقات شماتت ہمسایہ بھی اٹھاتے ہیں۔ اس زاویہ سے "چہارسُو" کی بے لوث خدمات پر نظر ڈالتا ہوں تو میں آپ کو غائبانہ طور پر ایک ہزار "سلیوٹ" کرتا ہوں اور "چہارسُو" کی ان خدمات کا اعتراف بھی کرتا ہوں جو مختلف ادیبوں پر گوشے چھاپ کر انجام دی جا رہی ہیں۔ خدا آپ کے رزق میں برکت دے۔ خدا اس پرچے کو زندہ رکھے۔ یہ ایک درویش کی دعا ہے جسے یقین ہے کہ اس کی دعا ضرور مستجاب ہوگی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی پر "چہارسُو" نے بڑا بھرپور گوشہ پیش کیا ہے۔ صدیقی صاحب بلاشبہ ایک سخت گیر ترقی پسند نقاد ہیں لیکن وہ متعدد ترقی پسندوں کی طرح تنگ نظر نہیں، وہ اختلاف برملا کرتے ہیں لیکن اختلاف کو قبول بھی کرتے ہیں، ان کا اپنا اختلاف شائستہ اور مدلل ہوتا ہے جس سے غیر متعلق لوگ بھی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ میں خود کو ان کے نیازمندوں میں شامل سمجھتا ہوں اور ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ یہاں ان کی عالی ظرفی کا ایک واقعہ اقتباس کرنا چاہتا ہوں۔ دو تین سال قبل انہوں نے از خود محسوس کیا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب اور وزیر آغا اور ان دونوں کو محسن تسلیم کرنے والے اس عاجز انور سدید کے درمیان جو فاصلے پیدا ہو چکے ہیں، وہ اب پاٹ دینے چاہئیں۔ انہوں نے مجھے اپنی اس خواہش کی اطلاع ایک خط سے دی۔ میں نے انہیں فوراً جواب دیا کہ آپ پیش قدمی کیجئے اور احمد ندیم قاسمی صاحب کو یہ قصۂ زمین برسرِ زمین ختم کرنے پر آمادہ کیجئے۔ میں اپنے تمام اختیارات غیر مشروط طور پر آپ کو پیش کرتا ہوں۔ وزیر آغا صاحب کی طرف سے بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ اسے قبول کریں گے۔ اب مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ محمد علی صدیقی صاحب نے اگر قاسمی صاحب کی طرف پیش قدمی کی تو انہوں نے کیا جواب دیا۔ لیکن میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ قاسمی صاحب کو ان کے قرب و جوار کے احباب نے "ضبطِ عظمت" کا شکار بنا دیا تھا اور وہ خود بھی عرصے سے "سیکھو سونیا" کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ ہرگز وزیر آغا سے اور اس عاجز انور سدید سے صلح پر آمادہ نہ ہوں گے نہ ہوئے۔ اور آخری عمر میں تو وہ اظہر جاوید جیسے نیازمند سے جس نے ایک بھرے جلسے میں کھڑے ہو کر ان سے عقیدت کا اظہار کیا تھا، اتنے ناراض ہو گئے کہ معاملہ عدالت میں لے گئے اور اس کے خلاف "اہانتِ عرفی" کی پچاس لاکھ کی ڈگری حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے جس کے خلاف انہوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کر رکھی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ابو اسلام انجم کے ایک مطبوعہ بیان کے مطابق جو انہوں نے قاسمی صاحب کی دختر نیک اختر ڈاکٹر ناہید قاسمی کی موجودگی میں صحافی تنویر قیصر شاہد کے سامنے دیا، قاسمی صاحب اپنی زندگی میں اظہر جاوید کو معاف کر دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں اظہر جاوید تو اس جرم کا عشر عشیر بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ بات دوسری طرف چلی گئی۔ میں یہاں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے اعلیٰ ظرف اور بلند کردار کا ذکر کر رہا تھا کہ انہوں نے از خود یہ چالیس برس کا تنازعہ ختم

کرانے اور ادب کا مطلع صاف کرنے کی کوشش کی۔ اب احمد ندیم قاسمی اس دنیا میں نہیں رہے، ان کا "سرگودھو نیا" بھی قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ صدیقی صاحب کو چاہیے کہ اپنی کوششوں کا باب بھی "چہارسُو" کے وسیلے سے تاریخ کے حوالے کر دیں۔ اس قسم کی ایک کوشش ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے بھی کی تھی۔ انہوں نے اچھا کیا کہ میری عرضداشت پر احمد ندیم قاسمی کا جواب مکتوب "ادب دوست" میں ان کے قلم کی تحریر میں چھاپ دیا۔ احمد ندیم قاسمی اردو کے نامور ادیب تھے۔ انہوں نے ادب کی سروں میں کم و بیش ستر برس صرف کئے۔ میں نے ان کی وفات پر اخبارات میں اور ان کے چالیسویں پر "نوائے وقت" میں مضمون لکھا اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا۔ میں نے ان کے ادبی کارناموں کا تذکرہ "اردو ادب کی تحریکیں" اور "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں بھی بہت اچھے الفاظ میں کیا جو سند کے طور پر موجود ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی پر گوشہ چھاپنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور انہیں "چہارسُو" کے "تمغۂ امتیاز" کی مبارکباد، یہ اعزاز سرکاری اعزازات سے زیادہ گراں قیمت ہے۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے صدیقی صاحب پر میرا ایک گم شدہ مضمون بھی تلاش کر لیا۔ میں اسے اپنی نئی کتاب میں شامل کروں گا۔ انشاءاللہ

زیرِ نظر پرچے میں انور زاہدی، عذرا اصغر اور گلزار جاوید کے افسانے زندگی کی چند حقیقی قاشوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔ ان تینوں احباب نے نہایت لطیف اشاروں کو ادبی اسلوب میں اس طرح پیش کر دیا ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔ پروفیسر قیصر نجفی نے پروفیسر ستیہ پال آنند کی کتاب "مجھے یاد کرو اے" کا خیال انگیز تجزیہ کیا ہے۔ غالباً اردو کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اردو کے ایک اور بڑے افسانہ نگار کیول دھیر کو خراجِ تحسین ادا کرنے میں بڑی کشادہ نظری ظاہر کی ہے۔ ان دونوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شہرت کا تعاقب نہیں کرتے۔ شہرت خود ان کے پیچھے دوڑتی چلی آتی ہے۔ جب قریب آتی ہے تو دیکھتی ہے کہ یہ دونوں اس کا استقبال کھلی بانہوں سے کرنے اور اس پر نثار ہونے کی بجائے نیا افسانہ لکھ رہے ہیں اور اپنے فن کا قدم آگے بڑھا رہے ہیں جو ان کے فن کی بنیاد ہے۔ ناز مصنفین پر علیمہ سکندر نے بہت اچھے تبصرے لکھ دئیے ہیں۔ ان تبصروں سے مطالعے کی روشنی چھن چھن کر آتی ہے۔ جامعت علی شاعر کے ہائیکو، ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی نظم "تجربے کیا اب نہیں ہوتے"۔ خیال آفاقی کی نظم "لاپتہ"..... کرامت بخاری کی "محبت" اور صدیقی شاہد، غالب عرفان، مشکور حسین یاد، اکبر حمیدی، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ، ای ضیاری، ڈاکٹر صابر آفاقی اور مظہر بخاری کی غزلیں اچھی لگیں۔ مجموعی طور پر "چہارسُو" گلدستۂ غزل ہے۔ میری 80 برس کی ضعیفی کا حال اصغر مہدی نے یوں پیش کر دیا ہے:

نہ کسی جسم میں طاقت مگر اصغر مہدی
لذتِ زیست کو لفظوں سے ابھارا جائے

انور سدید

برادرِ عزیز گلزار جاوید۔

جولائی اگست کا شمارہ موصول ہوا۔ محمد علی صدیقی ہمارے عہد کے ان چند اہم نقادوں میں شامل ہیں جن کی تنقیدی بصیرت قابلِ رشک ہے۔ انہیں اہلِ قلم کا اعتبار حاصل ہے۔ محمد علی صدیقی کا گوشہ ایک عرصے سے Due تھا۔ ان پر بھرپور گوشہ شائع کرنے پر آپ اور رفقا کے کار لائقِ مبارکباد ہیں۔

برادرم محمد علی صدیقی سے تقریباً چار دہائی پہلے تعارف ہوا تھا۔ ایک زمانہ تھا "افکار" کا دفتر ادیبوں اور شاعروں کا Meeting Point بھی ہوا کرتا تھا اور ادبی افکار کے تبادلے کا مرکز بھی۔ اسی دفتر میں متعدد کامیاب ادبی تقاریب کے منصوبے تکمیل تک پہنچے اور ادبی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ یہاں مستقل آنے والوں میں راقم کے علاوہ انجم اعظمی، قمر ہاشمی، سحر انصاری اور محمد علی صدیقی بھی شامل تھے۔ دفتر افکار میں ہی جب محمد علی صدیقی نے اپنے مضامین کے پہلے مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں اس کا نام تجویز کرنے کے لئے احباب سے کہا تو صہبا لکھنوی، سحر انصاری اور انجم اعظمی نے مختلف نام تجویز کئے لیکن میرا تجویز کیا ہوا نام "توازن" سب کو پسند آیا چنانچہ مجموعہ شائع ہونے کے بعد محمد علی صدیقی نے ایک جلد مجھے یہ لکھ کر دی کہ اس کا نام محسن بھوپالی کا تجویز کردہ ہے۔ "توازن" کو ادبی حلقوں میں قابلِ رشک پذیرائی حاصل ہوئی اور وہ جدید تنقید کا اہم مجموعہ قرار پایا۔

یادش بخیر 1969-70ء میں جب مرزا ظفر الحسن نے ادارۂ یادگارِ غالب میں ادبی تنقیدی نشستوں کا آغاز کیا تو سحر انصاری اور میں نے بحیثیت نائب معتمد ہمارے ساتھ محمد علی صدیقی نے بھی عملی حصہ لیا۔ شروع شروع میں وہ نشست میں اپنا مضمون پڑھتے ہوئے ہچکچاتے تھے چنانچہ میں نے متعدد بار ادبی نشستوں میں ان کے مضامین پڑھے تھے۔ گوشہ پڑھ کر محمد علی صدیقی سے متعلق کئی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں اور چند ایک قلم برداشتہ رقم کر دیں۔

"تاثرات" پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا اور فن و شخصیت پر قمر جمیل کا مضمون گوشے کا حاصل ہیں۔ براہِ راست میں آپ کے سوالات اور ان کے جوابات کے ذریعے محمد علی صدیقی سے قارئین کی تفصیلی ملاقات کی صورت نکل آئی ہے۔ دیگر مندرجات کے سلسلے میں عرض ہے کہ عذرا اصغر کا افسانہ "زندگی جاگتی ہے" نہایت دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے لیکن نہ جانے کیوں افسانہ اچانک ختم ہو جاتا ہے اور وہ بھی Punch Line کے بغیر۔ آپ کا افسانہ "مشتاق قاتیں" کی میرے نزدیک سب سے بڑی خوبی مختلف ملبوسات، کھانوں، برتنوں اور پکوانوں خصوصاً دیسی پھلوں اور پانی کے برتنوں کا باتفصیل ذکر ہے۔ آپ نے جس باریک بینی اور جزئیات کے ساتھ مشاہدات قلم بند کئے ہیں وہ قابلِ داد ہیں۔ اس افسانے کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ختم ہونے کے بعد دوبارہ شروع سے پڑھنا پڑا۔ کرامت بخاری، قیصر نجفی، قاش کاشمی، خیال آفاقی اور فیصل عظیم کی نظمیں متنوع موضوعات پر کہی گئی ہیں اسی لئے جاذبِ توجہ ہیں۔ قاش نے اپنے ایک مصرعے میں "سوئی جوڑو" کو سوئی جوڑ اور نظم کیا ہے۔ کاش یہ باپ کڑھی کے

دوہے اس کے اصل اور روایتی وزن میں لکھے گئے ہیں مضامین کے لحاظ سے بھی متاثر کن ہیں۔ سجاد مرزا کے دوہے دراصل ہندی کے "مطلع" ہیں مضامین یقیناً دوہے کے ہیں اور قابلِ تعریف ہیں انھیں وزن کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ محسن احسان، امانی انصاری، مرتضیٰ برلاس اور جاوید شاہین کی غزلیں میرے نزدیک حصہ غزلیات کی جان ہیں۔

محسن بھوپالی

عزیز محترم گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم۔

بیرون ملک سے واپس گھر پہنچا تو ڈاک میں پہلی نظر چہارسو پر پڑی۔ چلئے آپ نے محمد علی صدیقی صاحب پر بھی اپنا کام کر ڈالا۔ میں نے بھی پوری طرح چہارسو نہیں پڑھا۔ کسی زمانے میں ان حضرت کے مضامین پڑھے تھے تو یہ تاثر ہوا تھا کہ صدیقی صاحب بھی دوسرے نقادوں کی طرح مغربی تنقید پڑھ کر ہمارے اہلِ قلم کی تحریروں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ اتفاق سے "تکار" کے حوالے سے مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو ان محترم سے ملاقات بھی ہو گئی۔ جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے وہیں میرے ساتھ رشید حسن خان بھی تھے۔ آپ میری عادت سے واقف ہیں میں تکلف سے بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ رشید حسن مرحوم سے کھل کر بات کی تو بے چارے ہل گئے اسی شام کو "تکار" کے ضمن میں میری تقریر تھی وہاں مرحوم سید حسن مرحوم کی صدارت تھی ان کے منہ سے دورانِ تقریر عاقبت کا لفظ نکل گیا۔ بس میں نے اُن سے پوچھا حضرت آپ کو عاقبت سے کیا نسبت ہے پھر ان کی خوب خبر لی۔ اسی زمانے میں میری نثری نظموں کا مجموعہ آیا تھا جس میں تجربے کے طور پر میں نے خاص عوامی زبان استعمال کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ محمد علی صدیقی مجھے اس کی داد دیں گے تو یہ بے چارے داد کیا دیتے نہ چاہیے بھی ہمارے عام لکھنے والوں کی طرح ہجو دل آدی ہیں۔ بہر حال گلزار جاوید صاحب آپ ماشاء اللہ کام کر رہے ہیں کرتے جائیے اللہ آپ کو برکت دے۔ آمین۔

مشکور حسین یاد

میرے بھائی گلزار۔ خوش رہو۔

اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر محمد علی صدیقی بہت اچھا ہے۔ اُن پر لکھے مضامین 'ادب کا محمد علی پاشا' اور دیگر پسند آئے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا مضمون 'نیا عالمی معاشی نظام اور تیسری دنیا' کافی دلچسپ ہے اور معلوماتی بھی۔ اور جگہ جگہ پر حقائق کو کھول کر رکھ دیتا ہے کوئی چاہتا ہے کہ کس قدر بے خوف تبصرہ ہے کہ جو ملک بھی ان میں سے کسی ایک پر لب کشائی کرے اُس کا شمار ناہنجار اور بدمعاش ممالک میں ہوگا۔

غزلیات اور منظوم بھی اچھی ہیں۔ اکبر حمیدی کی غزل کے اشعار پسند آئے۔ ہر حد تک وجہ نہیں ہوتی / پیار میں کوئی حد نہیں ہوتی۔ اور خاص طور سے یہ شعر عشق میں خودی کیا ہے سب کچھا اس میں کوئی مد نہیں ہوتی۔ قیصر نجفی کی غزل کا مطلع مشکوک جب ہو جائے فضا حدِ نظر تک / اجنبی کو بھی لوگ آنے نہیں دیتے ہیں ڈر تک۔ سید خورشید انور رضوی کی غزل پسند آئی تو بھی اپنے درد کی بپتا سنا / آج اپنا دل بھی ہے ڈوبا ہوا۔ قیصر نوری کی غزل میں کم و بیش سارے اشعار اچھے لگے۔ اسی طرح علی آذر کی غزل ہم نے آیا اسے شمع فروزاں جھلوا گئے پروانے تیری روشنی پانے کو چلے / آنکھ سے بہتے کو اشکوں کا سمندر بچا مصلحت کہتی ہے کہ ایک نہ آنسو نکلے۔ مجھے تو یہ غزل اچھی لگی۔ نقاش کاظمی کا Disaster زلزلے سے متاثر ہو کر نے متاثر کیا۔ جوگیندر پال جی کا افسانہ 'سٹریپ ٹیز' عذرا اصغر کا 'زندگی جاگتی ہے' اور فرزانہ روحی کی بنا کسی کی کہانی نے متاثر کیا۔ اور عابدہ تقی کی ایلڈر لی لیڈی نے طوالت کے باوجود لطف دے دیا۔ اور آپ کی مشتاق نگاہیں بن دیکھے آپ نے میلے کی خوب سیر کرائی۔ اور جگہ جگہ پرانے فلمی گیت کا کچھ اپنی سوار اور پھر ٹھہر ٹھہر کر کیا خوب داد تحسین دی۔ سمیر پرویز جہاں کہیں بھی ہوں نذیر حلوہ پر شاہ والے کی دکان پر پہنچ جائیں اُن کے محترم زاہد صدیقی انتظار کر رہے ہیں اور پھر.... دل جو نہ کہہ سکا... اور جیتے کھیلتے ماحول میں دوشیزہ مشتاق نگاہیں۔ اور اسی طرح شاعرہ ایک دعا کے کی آواز نے... کس خوبصورتی سے آپ نے Climax پر لا کر بم پھینک دیا۔

اس مرتبہ آپ کا مشتاق نگاہیں چہارسو کی جان ہے آپ کا افسانہ پڑھ کر دل یقیناً دہل گیا۔ غزلیں، نظمیں، افسانے، مضامین پڑھ کر جو مزہ آیا وہ تو سب آپ کے افسانے کے بم نے دہلا دیا.... آپ اچھا لکھتے ہیں نا.... مگر ایسی جگہ پر آ کر بم پھینکنا کوئی اچھی بات نہیں۔

یوگیندر بہل تشنہ

محترم بھائی گلزار جاوید۔ السلام علیکم

تازہ "چہارسو" جولائی/اگست ۲۰۰۹ء نظر نواز ہوا۔ جس میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے نام قرطاسِ اعزاز دیکھ کر خوشی ہوئی اور مشاہیرِ علم و ادب کی گراں قدر آرا اُن کے حوالے سے پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ موصوف بلاشبہ ہمارے عہد کے ایک ایسے نقاد ہیں جو ہماری اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو اب آہستہ آہستہ ہم سے بچھڑتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی تحریر "اردو تنقید میں نئی ہیئت" یقیناً تمام تحریروں پر (میرے ذاتی خیال میں) بھاری پڑی۔ پھر خود ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی پر مضمون "حقیقت یا افسانہ" معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی رہا۔ ظاہر ہے یہ تمام محنت آپ کے خلوص کا عکس تھی جس کی مبارکباد پیش ہے۔

اس مرتبہ افسانوں میں مجھے دو ہی افسانے پسند آئے۔ ایک عذرا اصغر کا افسانہ 'زندگی جاگتی ہے' اور دوسرا گلزار جاوید کا 'مشتاق نگاہیں'۔ عذرا اصغر نے اپنے افسانے کی بنت کچھ اس ڈھنگ سے کی کہ آخر تک یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں اور ظاہر ہے یہ اُن کا مخصوص اور منفرد ڈھنگ ہی ہے جس نے قاری کے لئے اختتام تک اپنی دلچسپی برقرار رکھی۔ ایک ماحول کو تخلیق کرنا اور پھر اُسے ایک فطری انجام تک پہنچانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ فنِ افسانہ نویسی پر ان کو کتنی دسترس حاصل ہے۔ ایک خوش امیدی ہے جو ابتدا سے آخر تک افسانے میں ایک زیریں لہر کا کام دے رہی ہے اور شاید یہ خوش امیدی اسی ساتویں نسل کے ساتھ دفن ہو جائے گی۔ "مشتاق نگاہیں" یقیناً گلزار جاوید کے اُن افسانوں میں ایک بلند پایہ افسانہ مانا جائے گا جو انہوں نے دو ملکوں کے درمیان بٹی ہوئی ثقافت کی فضا کو بڑھاوا دیتے

کے لیے حقیقی بنیاد پر لکھے ہیں۔ اس افسانے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ خواب
کے بعد حقیقت اور پھر حقیقت کے بعد آرزو کے پیکر نے برصغیر کے کروڑوں عوام
کی تمناؤں کا روپ دھار لیا ہے کیونکہ تو وہ پڑوسی ملک کا ماحول ہے لیکن خود ہمارے
ماحول اور ہمارے روز و شب میں لرزتے گرجتے دھماکوں سے کس قدر یکسانیت
لئے ہوئے ہے "کب تک بے بہا بے ملبے اجڑتے رہیں گے؟ کب تک؟ آخر
کب تک؟؟" یہ سوال میرے دل میں کسی تیر کی طرح کھب گیا ہے۔

محترم حمایت علی شاعر صاحب کے خط کے حوالے سے میں صرف
اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ صرف لفظ "سچ" میں نے جن معنوں میں استعمال کیا
تھا اس کی بنیاد شاعروں میں جاری تقدیم و تاخیر کی روایت کی طرح معیاری ادبی
جریدوں میں تخلیق نثر اور شاعری کی طباعت میں بھی حسبی ترتیب کا رواج ہے
اور "چہارسُو" حتی الامکان اس کا اہتمام شروع ہی سے کرتا چلا آیا ہے کیونکہ کسی
بھی شعری تخلیق کو چھاپنے سے پہلے اس کی شاعری کی عمر، شاعر کی علمی عمر، شاعری
کا معیار، شاعری کی تعداد اور شاعری کی رفتار بھی مدنظر رکھی جاتی ہے۔ جناب
ملک زادہ جاوید کی غزل اس شمارے میں چونکہ مجھ سے پہلے شائع ہوئی تھی اس
لئے میں نے اس اصول کی جانب مدیر کی توجہ مبذول کروائی تھی ویسے میں بھی
جانتا ہوں کہ بہتر اور کمتر کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا اور میرے متذکرہ
فقرے سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ میں نے اپنے آپ کو موصوف سے بہتر
ثابت کیا ہے ہاں حمایت بھائی چاہیں تو میری شاعری کی تین کتابیں اور میری
45 سالہ شاعری کی عمر بھی ملک زادہ جاوید کی شاعری پر قربان کر دیں۔ "سر
تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے"

غالب عرفان

برادرم گلزار جاوید صاحب! آداب و سلام۔

مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ آپ اتنے کنجوس ہیں۔ میں ڈھیر سارے افسانے
لیے اس انتظار میں رہا کہ "چہارسُو" کی بہت ساری کاپیاں آئیں گی اور ان کو
بروقت مجھے بھارت کے مختلف مقامات پر مختلف لوگوں کو روانہ کرنی ہیں۔ آپ کا
بنڈل بھی ملا وقت پر لیکن گرو اور سے میرے بھائی۔ اس میں "چہارسُو" کی صرف
ایک کاپی تھی جو مجھے عالی جناب ا۔ ک۔ ا صاحب کو بھیجنی تھی۔ بہت بہت شکریہ
آپ نے بڑا دل کر کے مجھے خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ اب جناب یہ بھی بتا دیں
کہ بچے ہوئے افسانے آپ کی خدمت میں ارسال کروں یا آپ اگلی مرتبہ
"چہارسُو" کی زیادہ کاپیاں بھیج رہے ہیں۔

آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر لائلپور گھومے۔ میں نے آپ کی
آنکھوں سے میرے پیارے شہر کو دیکھا اور رو دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اشک
کے چند قطرے سرحدی لکیر کو دھو نہیں سکیں گے مگر رونا نہیں رہا میرے بس میں
نہیں تھا۔ انشاء اللہ وہ وقت بھی آئے گا جب یہ لکیر دھندلا جائے گی مگر اس وقت اس
دھرتی کو رونے والے نہیں ہوں گے۔ اس مٹی پر سجدہ کر کے بوسہ لینے والے اس
جہاں سے اٹھ گئے ہوں گے اور نئی نسلیں اسے صرف پڑوسی ملک ہی سمجھیں گی۔

"چہارسُو" کے تازہ شمارے میں دیگر منشورات اور شائع افسانے
پڑھے۔ سب افسانے اچھے لگے خاص طور پر جناب افروز عابدی صاحب کا افسانہ
"بکائین کی کہانی" اور آپ کا افسانہ "مشتاق قاتل" بہت پسند آئے۔ امید کہ مزاج
گرامی بخیر ہوں گے۔ رمضان شریف کی ساعتوں میں ہمیں یاد رکھیں۔

انل ٹھکر

برادرم گلزار جاوید۔

آپ کی شخصیت سدا بہار گلزار بلکہ سراپا بہار ہے کہ ہر موسم میں شعر و
ادب کے پھول کھلاتے ہیں آپ نے برصغیر کے سینکڑوں قلم کاروں اور تخلیق
شعاروں کو قرطاس اعزاز سے نوازا اور بدستور نوازتے چلے جاتے ہیں لیکن ثقہ
ادب نواز نہیں پڑی تو خطۂ مظلوم کشمیر پر نہیں پڑی۔ یہ شکایت نہیں حکایت ہے اور
زمینی حقیقت بھی۔ کشمیر کے حسن و جمال کی تعریف بھی کرتے آئے ہیں مگر کشمیری
کو بھی در خور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ایک مغل شہنشاہ نے تو یہاں تک لکھا کہ در کشمیر
ہیچ عیب نیست بجز کشمیریاں۔ کشمیریوں کو ہر عہد میں ایک عیب سمجھا گیا اور آج
بھی سمجھا جاتا ہے بہر حال ہم بے حال اور پامال لوگ حافظ کی اس بشارت پر
زندہ ہیں: "کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور" اس تمنی کے بعد اب ادب کی
تیرگی کی بات ہو جائے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ہمارے عہد کے عظیم عالم نقاد اور لبرل ادیب ہیں
انہوں نے دہشت گرد قلم کاروں کو راہ اعتدال اور روشن توازن دکھائی ہے۔ ان کے
تنقیدی مضامین کے مجموعہ کا نام ہی توازن ہے اور وہ خود بھی ایک متوازن شخصیت
ہیں سوانحات کے بعد ان کا اہم کارنامہ وہ تصنیف ہے جو سر سید احمد خان اور جدت
پسندی کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ سر سید احمد خان ترکی کے اتاترک پاشا اور مصر کے
محمد عبدہ سے متاثر تھے اور خود یہ دونوں بہائی دین کے مداح اور بہائی تعلیمات سے
خوشہ چین تھے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے سر سید کے ساتھ ساتھ جوش اور غالب اور
اقبال کے افکار کی ترجمانی کی ہے اور اسی طرح انہوں نے شعوری طور پر یہ سعی کی
ہے کہ پاکستانی معاشرہ اعتدال، رواداری، محبت اور توازن کو اپنا کر امن و خوشحالی کا
گہوارہ بنے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو سید حسن، حکیم سعید، ڈاکٹر مبارک علی، مولانا
عامدی، ڈاکٹر جاوید اقبال، قاضی جاوید اور احمد سلیم کی صف میں شمار کرتا ہوں۔ آپ کو
اور ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے اس نمبر کے ذریعے ڈاکٹر محمد
علی صدیقی کی پوری تصویر اور مکمل شخصیت دکھا دی ہے اور یہ کارنامہ آپ ہی کر سکتے
ہیں۔ "ہر کسے را بہر کارے ساختند"

صابر آفاقی

برادر محترم گلزار جاوید صاحب۔

اس مرتبہ آپ نے اردو اور انگریزی کے معروف ادیب اور دانشور
جناب محمد علی صدیقی کے فن اور شخصیت سے متعلق "چہارسُو" کا گوشہ مختص کر کے
اردو ادب میں گراں بہا اور قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کا فن اور شخصیت ہشت
پہلو ہے ان کی کس کس تصنیف کا تذکرہ کیا جائے وہ ایک انتھک اور مخلص ادبی
کارکن ہیں جو ایک طویل عرصے سے ادب کی وادی میں گل بوٹے کھلا رہے ہیں۔
آپ نے ان سے اردو داں طبقہ کو متعارف کرا کے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا
ہے بلکہ وہ قرض ادا کیا ہے جو ایک طویل عرصے سے ادبی دنیا پر واجب تھا۔

آپ نے ان کا بھرپور تعارف کرایا ہے علاوہ بریں ارواست میں ان سے بعض بڑے تیکھے سوال بھی کئے ہیں جن کا جواب انہوں نے بڑی تفصیل سے دیا ہے لیکن بعض چبھتے ہوئے سوالوں کو وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گئے ہیں یہ بھی ایک بڑے لکھاری کا ایک انداز ہوتا ہے۔ بہرحال ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ نے ان کو اردو ادب و زبان کی خدمت کے لئے تادیر زندہ و سلامت رکھے (آمین)۔

مضامین نظم و نثر بھی فکر انگیز اور خوبصورت ہیں۔ آپ نے "مشتاق شاہین" لکھ کر مندمل زخموں کو پھر سے ہرا کر دیا ہے یہ افسانہ اتنا بھرپور جامع اور تاثر آفریں ہے کہ کبھی آنکھیں نم ہو گئیں اور کبھی مختلف زاویوں کی سیر کرتے ہوئے دہی بڑے، پانی کے بڑے، فروٹ چاٹ، مٹر چاٹ، چنا چاٹ، لوبیا چاٹ، بھیل پوری، گول گپے، کچے پکے امرود، کیلے، مرونڈا، شیانی اور ایسی ان گنت اشیا کا ذکر کر کے ملا واحدی کی "میرے زمانے کی دلی" شاہد احمد دہلوی کی تصنیف "اجڑا دیار" اور عشرت رحمانی کی "عالم میں انتخاب دلی کی یاد" تازہ کر دی اور کیوں نہ ہو آخر دلی کے پڑوس میں رہنے والے ہو تاریخی کو چاوڑی، حوض قاضی، چوک سعداللہ خان، دوپٹہ کلاں، لال کنواں گھماتے گھماتے تمام بھولی بسری یادیں تازہ کر دیں۔ اتنی خوبصورت اور تاثراتی تحریر لکھ کر آپ نے ماضی کے دریچوں سے وہ سب دکھا دیا ہے جو ہماری تہذیب کا ایک حصہ تھا اور اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور ہر بار نیا لطف آتا ہے اور نادر کاکوروی کی مشہور نظم "گزرے زمانے کی یاد" سامنے آجاتی ہے: اکثر شب تنہائی میں/ کچھ دیر پہلے نیند سے/ گزری ہوئی دلچسپیاں/ بیتے ہوئے دن عیش کے/ بنتے ہیں شمع زندگی/ اور ڈالتے ہیں روشنی/ میرے دل صد چاک پر۔

سرور انبالوی

عزیزی گلزار ادب گلزار جاوید! السلام علیکم۔

چہار سُو کی سیر کی، اچھا لگا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی ایک اچھے محقق ہیں، کسی بھی فن پارے پر بڑی تحقیق اور صحیح رائے پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اچھا کیا، چہار سُو میں ان کے لئے گوشہ آباد کر دیا۔ محسن احسان صاحب کی غزل کا مطلع: "زخم سجدہ کو جبیں پر رکھا/ اپنی دہلیز پر بھی سر رکھا" خوب ہے لیکن سجدہ زخم نہیں، اظہار عقیدت کا انتہائی عمل ہے، زخم تو محض نمائش اور دکھاوے کی چیز کا نام ہے جبکہ سجدہ پورے شعور اور دل و دماغ کی پوری کیفیتوں اور ہوش مندی سے ادا کیا جاتا ہے۔ ساغر انصاری کا یہ شعر: بے یقینی کی دھوپ تھی سر پر/ اور تک سایۂ شجر نہ ملا۔ اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ لوگ جو بے یقینی اور بدگمانی کا شکار رہتے ہیں انہیں دنیا میں کہیں بھی پناہ نہیں ملتی۔ حصول مقصد کے لئے یقین اور اعتماد شرط اول ہے جیسا کہ آتش کہتے ہیں۔ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے/ ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔

مرتضیٰ برلاس صاحب کا یہ شعر برحق ہے کہ "قرب کچھ اعتماد چاہتا ہے/ ورنہ بڑھ جائیں فاصلے کہیں"۔ بقول شاعر "کچھ تم کچھ کچھ تم رہے کچھ ہم کچھ کچھ/ اسی کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا"۔ یا پھر حفیظ ہوشیار پوری صاحب کے بقول "دلوں کی رنجشیں بڑھتی رہیں گی/ اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے"

قاش کاظمی صاحب نے شاعری کے نام پر تجربہ کاری کی ہے۔ غزل میں ردیف کا وزن اٹکا ہے، کاش شعر کی شکل میں کوئی چھوٹا سا پل بھی اُگ آتا۔ محترم عبدالعزیز خالد حسب عادت ثقیلات کا جال بچھاتے ہوئے ہیں۔ کرشن کمار طور کا یہ شعر عصر حاضر کی عمرانی زبوں حالی کا مرثیہ ہے: "مرے زوال کا اس سے بڑا ثبوت ہے کیا/ ہوں اپنے آپ سے بیگانہ اپنے گھر میں نہیں" لیکن ردیف کی میں میں نے گائے کی بکری یاد دلا دی۔ جاوید شاہین صاحب کو انسانی مسائل سے بھری دنیا میں کچھ اور دکھائی نہ دیا، آنکھیں بند کئے سیدھے اس بازار کی طرف نکل گئے۔ جہاں آبرو باختہ فلم ایکٹریس کی طرح کوئی صاحبہ اپنے "جوبن" کی دکان سجائے بیٹھی تھی۔ اور وہاں موجود ہر تماشائی ان کے سینہ عریاں کو عزیز عریاں دیکھنے کے لئے مدعیوں کی طرح ان کے چاک گریباں میں جھانک رہا تھا۔ شعر ملاحظہ کیجئے:

قبا وہ عجب اس کے گریباں کی طرف تھا
ہر آنکھ کا رخ سینہ عریاں کی طرف تھا

حیرت ہوتی ہے اس نوع کے شاعروں پر، آخر کب تک وہ اس مظلوم عورت کو بے لباس کرتے رہیں گے۔ ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ کی غزل صاف ستھری اور گہری اعتبار سے معنی خیز بھی ہے۔ اکبر حمیدی نے مختصر بحر میں اچھے شعر نکالے ہیں۔ "عشق میں خودی کیا ہے سب کچھ/ اس میں کوئی مدعا نہیں ہوتی"۔

قیصر نجفی صاحب کی غزل کا پانچواں شعر ایک اچھا مضمون پیش کرتا نظر آیا۔ یہ اور غالب عرفان کے شعروں میں عام طور پر بڑی فکر اور مثالی پائی جاتی ہے۔ زیر نظر غزل کا مقطع بھی اسی وسعت فکر کا عکاس ہے: "حروف و صوت کے پیکر فراز عرفاں سے/ اُٹھے زمانے لگتے ہیں درمیان میں لب تک" ماجد سرحدی کی غزل میں نظم کا سا تاثر اور ایک عزم الدین کا احساس پایا جاتا ہے۔ مجھ ان کی غزل کے چوتھے شعر میں کمپوزر صاحب نے سمت کو صحت سے بدل کر دلچسپ صورت حال پیدا کر دی ہے: "کوئی تو آئے مری سمت زمانہ دیکھے/ صورت دشت کا تصویر گلستاں ہونا" اس اچھے بھلے شعر کا حلیہ اس طرح بگاڑ گیا ہے: "کوئی تو آئے مری 'صحت' زمانہ دیکھے/ اب اس کے بعد زمانہ میری صحت کو کیا دیکھے گا" میں خود اپنے شعر کا حشر تک رہا ہوں۔

شاہد واسطی کی غزل سراپا عمدہ خیالات کا مرقع ہے۔ سیف الرحمن سیفی بہت عمدہ شعر لکھتے ہیں۔ ان کا یہ شعر پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے: "مجھ کو مسمار کر رہا ہے مگر درمیان رہ گئے کتنے ہیں پیوست جو میری بنیاد کے ساتھ" امتیاز احمد دانش کا یہ شعر فکر و فلسفہ کا آئینہ دار ہے: "کتنے خانوں میں بٹ گیا چہرہ/ آئینہ توڑ کر بہت روئے" پرویز ساحر کی نازک خیالی کیا خوب ہے: "ہم چراغوں کو فضائے حبس میں/ سانس لینے کو ہوا درکار ہے"

جوگیندر پال اپنے افسانے کی تعمیر کے لئے وہی فرسودہ اور گھسا پٹا مال مسالہ لے کر آئے ہیں، جس سے کرشن چندر اور منٹو اپنی عمارتیں کھڑی کر چکے ہیں۔ یعنی کلب، ڈسکو، ناچ رنگ اور جسم کا جغرافیہ۔ نہ معلوم کیوں ہمارے لکھنے

والے بدن کا طواف کرتے نہیں تھکتے اب تک اِن کی فکر و نظر کا محور عورت کے جسم
اور اس کے کپڑوں میں ہی الجھا ہوا ہے۔ پوری نفسانیت بازو کے ڈھیر پر بیٹھی ہے
اور ان حضرات کی نظر میں سب سے اہم مسئلہ شگفتہ بن مانسوں اور بدبو دار گھوڑوں
سے پیدا ہونے والی جنسی جذباتیت کا قصہ ہے۔ انور زاہدی کا افسانہ 'بکائن کی
کہانی' عمدہ ہے۔ شاید اس لیے بھی پسند آیا کہ عنوان دیکھ کر ہی آبدیدہ ہو گیا کہ
میرا ایک افسانہ تھا "بکائن کا سانپ"۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آتش جوان
تھا.... اور اب؟ اب بھی جوان ہیں۔ حفیظ جالندھری کی طرح ناچتے کاپتے
گنگناتے رہتے ہیں "ابھی تو میں جوان ہوں......"

اور خود آپ! گلزار میاں آپ نے تو حد کر دی۔ "مشتاق قافلے ہیں"
پڑھتے وقت سانس پھول گیا۔ لگتا ہے ہزار آنکھیں لے کر میلے میں گئے تھے
اور ہر آنکھ گویا وڈیو کیمرہ ہوئی تھی۔ جس تفصیل سے آپ نے میلے میں موجود
انواع و اقسام چیزوں کا ذکر کیا ہے لگتا ہے ہماری خود آپ کے ہم سفر ہے اور اپنی
آنکھوں سے ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے میں تو یہی محسوس کرتا رہا کہ آپ کے ساتھ
ہی میلے میں گھوم رہا ہوں۔ البتہ ایک عجب جھنجھلاہٹ سی ہوتی رہی کہ سینکڑوں
چیزوں میں بہت سی ایسی تھیں جی میں آتا ابھی اور اسی وقت خرید لیں لیکن ایسا
ممکن کہاں تھا؟ حقیقت میں تھوڑی ہم وہاں پہنچ گئے تھے اور پھر ایسا ہوتا بھی تو
جیب میں اتنے ٹکے کہاں تھے کہ اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالتے۔ ابھی بھی
افسوس کافی تھا ہمارے لیے کہ آپ نے دعا کا کر ڈالا "ساری خوشیاں اور امنگیں
بھک سے اُڑ گئیں۔ کہانی کا اختتام جس انداز سے کیا گیا "اس کے بارے میں کیا
کہوں "بس جی جانے ہے۔ اللہ کرے زورِ "ستم" اور زیادہ۔ نظمیں اپنے اپنے
عنوان سے سب ہی اچھی ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ صاحب کا شکریہ انہوں نے میرے
دو اشعار پسند فرمائے لیکن ہائے رے کمپوزر انہیں ہماری تعریف ایک آنکھ نہ
بھائی۔ دونوں اشعار کا حلیہ بگاڑ دیا۔ آمیر کی غزل میں بنا خود کو رضا کار.... اس
مصرعہ میں "آمیر" کو "آخر" سے بدل دیا ہے اور مقطع کے مصرعہ "رہنے دے
خیال اپنی خبر لے تو کہاں ہے" میں سے "ہے" کاٹ کر مصرعہ کو بے رنگ بنا دیا
ہے "خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را" — پروفیسر خیال آفاقی

مرکزِ فکر گلزار جاوید۔ السلام علیکم

مزاج بخیر۔ چہارسو ملا۔ ماشاءاللہ وہی سج دھج لیے ہوئے تھا۔ اس
اعزاز ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا حق تھا جو انہیں ملا۔ براہِ راست اچھا رہا مگر "شاعری
سے عشق اور بے کاگی کی بابت کچھ کہیے" کے جواب نے بہت سی جیبوں کو
آشکارا کیا۔ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ حمد، نظم، نثر مجموعی طور پر صحت افزا ہے۔ کیول
دھیر صاحب پشاور آتے تو کچھ اور محبتیں پاتے۔ محترم ستیہ پال آنند پر اللہ ضرور
کرم کرے۔ تمام اہلِ قلم اور احباب کو آداب۔ پاکستان پائندہ باد۔

ماجد سرحدی

برادرم گلزار جاوید صاحب۔

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ "چہارسو" کا جولائی، اگست ۲۰۰۱ء
کا شمارہ موصول ہوا۔ جس کی پہلی نظر سے یہ شمارہ مزین ہوا ہے وہ قابلِ صد مبارکباد
ہے۔ تقریباً جملہ شمولات ایک خاص معیار سے نیچے نہیں آئے۔ اس حوالے سے
آپ کا معیارِ نظر بھی لائقِ صد تحسین ہے۔ مجھے ذاتی طور پر شاملِ اشاعت ادب
پاروں میں محترم مرغوب العصر کا افسانہ 'زندگی جاگتی ہے' اور محترم ڈاکٹر انور زاہدی
کا افسانہ 'بکائن کی کہانی' بہت خوش آئے۔ ہر دو تخلیق کاروں کو مبارکباد دیجیے۔
حصۂ نظم و غزل میں محترم ماہ عزمی مہدی کی غزل تازہ کاری کا احساس لیے ہوئے تھی
بہت پسند آئی۔ انھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ وفا چشتی

مدیرِ محترم۔ سلام مسنون

'چہارسو' کا موجودہ شمارہ نہایت ہی دلربا رنگوں کی دھنک سے
مزین ہے اور مثبت رویوں کے امکانات روشن کرتا ہے۔

اُردو زبان و ادب خوش بخت ہے کہ اُسے ڈاکٹر محمد علی صدیقی
صاحب جیسا بلند پایہ وسیع المطالعہ و روشن خیال نقاد میسر آیا اور اُن کے معاصرین
رفقائے کار دانشور و تخلیق کار بھی جو اُن سے پابندِ روزگار کو اپنے درمیان پاتے
ہیں اور گہرائی و گیرائی سے مملو نظریات و افکار سے مستفید ہوتے ہیں.....!

براہِ راست کے لیے آپ کے کیے گئے سوالات کی تعریف نہ بھی
کریں تو میری رائے دیگر.... قارئین 'چہارسو' کی طرح بہتر ہے مگر جوابات
کے لیے چونکہ ہر مرتبہ شخصیات متنوع علمی ادبی جہتوں پر فائز ہوتی ہیں اس لیے
اس تناظر میں مشرقی اقدار و مغربی رجحانات کے حوالے سے بحیثیت نقاد صدیقی
صاحب کی رائے بہت ڈاؤن ٹو ارتھ محسوس ہوئی۔ تصویر کی بے زبانی میں اپنی
زبان رکھ دینے کی کیفیت کو اپنی ہی سوچ کے محور و فکر اور دنیا مختلف علوم و فنون
لطیفہ کو خوبصورتی سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

محترم ضمیر جعفری صاحب نے جس شگفتہ و شاداب اسلوب میں
اُردو ادب کا محمد علی پاشا' کے زیرِ عنوان اُن سے متعلق اپنے احساسات و تاثرات
کو گہرے مطالعے و مشاہدے سے بیان کیا اور شخصی اوصاف کا تنقیدی تجزیاتی
شعور کے ساتھ احاطہ کیا وہ اپنی نوع کے اعتبار سے جداگانہ و خوشگوار رہا۔ ادبی
معیارات کی چھان پھٹک' کے سلسلے میں پال جی نے اُن کے یہاں جدا جدا
جہات پر سائنسی رویوں کی پاسداری' شعری پیش روی' ذہنی تربیت کے لیے
انگریزیت کا تذکرہ کیا اور مستقبل کے تخلیق کاروں کے لیے اُن کی فکری و تنقیدی
جستجو تخلیقی سطح سے مدغم ہونے کا روشن امکان دیا۔ 'ادبی جہاد' میں زمانی اعتبار سے
جس طرح ترتیب وار ڈاکٹر صاحب کی عمر کے الآرا تخلیقات کا [illegible]
و مواد تعارف پیش کیا گیا وہ ادب کے کسی بھی قاری کے لیے استفادے سے کم
نہیں پھر پروفیسر کرار حسین صاحب پر کتاب تصنیف کرنے کی خواہش بھی اُن کے
بین الاقوامی تحرِ علمی کے پس منظر میں بڑی صائب محسوس ہوئی۔

'عکسِ نقاداں' کا کتاب اور اس کے مطالعے سے گئی جوہری جستجو کا
مخلصانہ رابطہ بشرا نہیں دیگر نقادوں سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ عصمت چغتائی حقیقت

یا افسانہ میں صدیقی صاحب نے اُن کے فن و شخصیت کو نہایت غیر جانبدارانہ انداز
کے ساتھ حقیقت پسندانہ نہج پر وسیع القلبی سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔
پہلے تین افسانوں میں سے ہو تو لطف لے کر رہے، آخری دو میں
عابدہ تقی صاحبہ میرے لئے کہانی کاروں میں نیا نام تھا اس لئے اُن کی "آئیڈیل
لیڈی" کو تجسس و اشتیاق سے پڑھا اور کہانی کی ضرورت و کرداروں کی ڈیمانڈ کے
مطابق طرزِ گفتگو، جدید لب و لہجہ یا مروجہ معیار کے ساتھ پُر لطف رہا۔ "مشتاق
نگاہیں" پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ اس میں کسے کلام کہ یکا رنگا رنگ جہات میلے کی
طرح سجا اور نمائش کی طرح آراستہ ہے جس میں انواع و اقسام کے لوگ مختلف
نوع کی تفریحات، بھانت بھانت کی آوازیں طرح طرح کے سحر نے رنگ
برنگے مناظر، خوش ذائقہ و خوشنما پکوان سبھی طرح کے لوگ باگ کے منتظر رہتے
ہیں استقبالیہ سج دھج کے ساتھ پھر رنگ و خوشبو کے بے پناہ ہجوم میں مسلسل
مشتاق نگاہیں جو کہیں ہوا ہوا وہ بھی ہو جانے کے مترادف ٹھہرتی ہیں۔
جزئیات نگاری کے کمالات کی رَو میں بہتے بہتے یکدم ہوا کے ساتھ قاری کا
تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور ساتھ ہی مشتاق نگاہوں کی سحر آفرینی بھی جبکہ ذہن
سوچتا رہ جاتا ہے "خوب تھا، خیال تھا" کیا تھا.....!!
"اعترافِ ہنر میں" کیول دھیر کی کہانیاں، دلچسپی اور تلطف سے
پڑھا گیا کریا د صاحب نے ڈاکٹر کیول دھیر سے اپنا تخلیقی و تہذیبی انٹرویو بہت
ہی اخلاص آمیز سطح پر مگر حقیقت انداز میں کیا ہے تازہ تخلیقات کی جانب
قاری کے انہماک کو نذر کرنے میں، تبصرہ کرنے کے فن کا بھی بڑا عمل دخل
محسوس ہوتا ہے باوجود یکہ زیرِ تبصرہ کتب اپنے نثری اوصاف و شعری محاسن
بھی لئے ہوتی ہیں۔ رس راجوں میں محترم حمایت علی شاعر نے لسانی رموز و
امر و حشرِ شعری نزاکتوں کی بہت شستہ و شائستہ توضیح فرمائی۔ کیول دھیر صاحب کا
مکتوب سراسر اخلاص کا مرقع ہے وہ حسنِ جذباتی وارادت و کیفیاتِ قلبی سے دوچار
ہوئے اُن محسوسات کو اسی خلوص سے سپردِ قلم بھی کرتے چلے گئے۔ "چہار سُو" کا
بیک ٹائٹل محترم قاسمی صاحب کی رحلت کے حوالے سے قرطاسِ اعزاز کی تجدید
کے ساتھ خوبصورت شعر کے جلو میں تنوع مفاہیم کے نذر کھولتا چلا گیا۔
شگفتہ نازلی

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم
ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب مستند علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ اُن کی
تحریر کے موضوعات میں تنوع ہوتا ہے قمر جمیل مرحوم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،
ڈاکٹر انور سدید اور ابوالمعانی عصری صاحب کی تحریریں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی
شخصیت کی دلکشی اور فن کی پرتیں کھولنے اور سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔ "رُوبرو
راست" میں ڈاکٹر صاحب کچھ جلدی میں نظر آئے، گفتگو کا ایک مربوط تاثر نہیں
بن سکا آپ کے سوالات اہم تھے۔ بہت سے سوالات ضائع ہوتے ہوئے
محسوس ہوئے۔ مجموعی طور پر گوشہ متاثر کن ہے۔ قاری شا نے ڈاکٹر صاحب کا
سوانحی خاکے کو بڑی ترتیب سے پیش کیا۔

غزلیات کا حصہ بہت جاندار ہے۔ محسن احسان، مرتضیٰ برلاس،
خاور کاشمی، سیف الرحمٰن سیفی کی غزلیں انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ ان اشعار
نے تو بہت ہی لطف دیا:

ہم تو وہ راہ رو ہے محسن
جس نے شانوں پہ اپنا گھر رکھا

محسن احسان

میں جب بھی لوٹتا ہوں پرندوں کے ساتھ ساتھ
حیرت سے دیکھتا ہے مجھے شام کا درخت

خاور کاشمی

عبدالعزیز خالد صاحب اپنی مشکل پسندی کی روش پر کامیابی سے
گامزن ہیں۔ منظور حسین یاد صاحب نئی بحر اور مشکل قوافی و ردیف کے
تجربات کر رہے ہیں۔ عبدالعزیز خالد اور رفعت سروش کی رباعیات نئی فکر کی
آئینہ دار ہیں۔ ستیہ پال آنند، دل نواز دل، کرامت بخاری، فیصل عظیم کی نظموں
میں نیا پن محسوس ہوا۔ شگفتہ نازلی نے احمد ندیم قاسمی صاحب کے لیے "عہد تھا
ایک سو تمام ہوا" میں خوب صورتی سے خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا ہے۔
جوگندر پال جیسے لکھاری کی عظمت میں افسانہ "حرفِ تر" سے کوئی اضافہ نہیں
ہو گا ہاں اُن کے افسانوں میں اضافہ ضرور ہو گا۔ "بڑا کینی کی کہانی" انور زاہدی
کی بہترین کوشش ہے۔ روانی بلا کی ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر احساس ہوا کہ افسانہ
اس طرح بھی لکھا جاتا ہے۔ عذرا اصغر اور عابدہ تقی کی کہانیاں اپنا تاثر قائم کرنے
میں کامیاب رہیں۔ آپ کا افسانہ "مشتاق نگاہیں" افسانہ کیا ہے ایک جہان آباد
ہے۔ افسانہ پڑھ کر آپ کے مطالعے اور مشاہدے کی داد دینا پڑتی ہے۔
آپ نے افسانے میں میلے کا جو نقشہ کھینچا ہے اشیاء کی ترتیب، دانا سموں اُن کی
تحسین بیان کی ہیں وہ حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ کہانی کا اختتام چونکا دینے والا
اس لیے ہے کہ تخیل شاعرہ میں بدل کے کہانی ایک نئی سمت مڑ گئی ہے۔
"تخلیقی عصر" میں علیم سکندر علی کتب کا تعارف خاصی محنت اور قرینے سے پیش
کرتی ہیں۔ "رس راجے" میں حمایت علی شاعر، ستیہ پال آنند، محسن بھوپالی اور
کیول دھیر کے خطوط صرف دلچسپ بلکہ فکری نوعیت کے ہیں۔
نوید سروش

محترم گلزار جاوید صاحب۔
عشق تو "آگ" کو گلزار بنا دیتا ہے اور گلزار جاوید ہو تو دائمی عشق
کیوں نہ ہو۔ محترم سید ضمیر جعفری صاحب مرحوم و مغفور کے ایک شعری مجموعے کو
کباڑی کے ٹھیلے سے خرید لیا گیا۔ "ابوالاثر حفیظ جالندھری کے کما ہارے ڈرتے
احترام کے ساتھ "تاباں" "جگہ تنگ" رقم کے پاس "مشاہیر" کو "مشاہیر" کی
ردی کی ایسی گالیاں" ہمالی محترم آپ قول معمولی سے دام چکا کے آتی ہیں اور
شیلف کی زینت بن جاتی ہیں۔
محمد علی صدیقی پر خصوصی گوشہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔

"چہارسُو" نام کا اثر دیکھا کہ لفافہ کھولتے ہی نائب مدیر نے اُچک لیا وہاں سے اسکالر کی میز پر پہنچا پھر پروف ریڈر نے پڑھ کر دیا کیا خوب سوغات زیرِ مطالعہ ہے

انور جاوید ہاشمی

محترم و مکرم گلزار جاوید صاحب سلام و رحمت

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے نام کرکے آپ نے بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔ تنقید و تحقیق کی دنیا میں آپ کی گراں قدر خدمات سے کوئی بھی صاحبِ انصاف ادب کا طالبِ علم انکار نہیں کر سکتا۔ فی الحال موجودہ شمارے کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس شمارے کے حوالے سے خصوصاً آپ کو اپنی رائے سے آگاہ کروں گا۔ میری جانب سے بار دِگر قرطاسِ اعزاز کے منفرد سلسلہ پر حرفِ تحسین قبول فرمایئے۔ "چہارسُو" کی یہ انفرادیت اس کا اعزاز ہے جو اسے تاریخِ ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب

"چہارسُو" بہت انتظار کرواتا ہے۔ انتظار اس لئے کہ اسلام آباد راولپنڈی کی محفلیں اور گزرے ہوئے دن یاد آجاتے ہیں۔ دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر آپ کی خوشبو سے تنہائی مہک اٹھتی ہے۔ آپ چونکہ خود بھی آرٹسٹ ہیں، تخلیق کار ہیں اس لئے اس جذبے سے بخوبی آگاہ ہیں کہ احساس ہوا اور تنہا ہونا کتنا مشکل مرحلہ ہے۔

کرامت بخاری

جناب گلزار جاوید۔

"چہارسُو" نہایت باقاعدگی سے مل رہا ہے کہ اس میں جو وقفہ ہے وہ بھی باقاعدہ ہے۔ جس کے لئے آپ کے پاس باقاعدہ جواز ہوگی لیکن جس خوبصورتی سے آپ پرچہ نکال رہے ہیں، وہ ہر عہد کا جواز پیدا کر جاتی ہے۔ خدا کرے آپ "چہارسُو" کو اسی طرح دنیا کے چاروں کونوں میں پھیلاتے رہیں۔ جو کام آپ کر رہے ہیں وہ ہر کسی کے بس کا نہیں۔ آپ کی ہمت کی داد نہ دینا نا انصافی ہوگی۔

دل نواز دل

مکرم بندہ گلزار جاوید صاحب!

"چہارسُو" کا شمارہ تو اپنی جداگانہ شان کے ساتھ ملا۔ حسبِ سابق حالیہ شمارہ اپنے اندر بہت سی معیاری تخلیقات لیے ہوئے ہے۔ اس بار آپ نے محمد علی صدیقی جیسے رئیس المطالعہ محقق اور دانش ور بے نظیر کے علمی کمالات کے اعتراف میں خصوصی گوشہ شائع کرکے قرطاسِ اعزاز کو اعزاز بخشا۔ صدیقی صاحب کے حوالے سے صاحبانِ رائے نے اپنی اپنی عالمانہ وفاضلانہ رائے کا کھل کر اظہار کیا یقیناً یہ گوشہ خاص یادگار ثابت ہوگا۔

شعری نا زمیں محسن احسان، نامی انصاری، اکبر حمیدی، جاوید شاہین، محمود الحسن، کرشن کمار طور، حسن عباسی، امتیاز احمد دانش اور نوید سروش کی غزلیں کے بعض اشعار اپنے اندر تازگی لیے ہوئے تھے۔ نظم عصر میں دو ایک نظمیں متاثر کن تھیں۔ یوں ہی بات زبان پر آ گئی اس شمارے میں موجود نظموں اور غزلوں کے بیشتر مصرعے اور اشعار عروضی وفنی سقم کا شکار نظر آئے اور کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی ملاحظے سے گزریں۔ اس باب میں عبدالعزیز خالد جیسے صاحبانِ علم اور ماہرینِ عروض بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔ خالد صاحب کی رباعیاں پسند خاطر ہوئیں۔ سیدی تقی عابدی کا انشائیہ اور قیصر تمکین کے تحقیقی و علمی مضامین بہت علم افروز ہیں۔ تخلیقی عصر کے باب میں تازہ تصانیف پر عمدگی کے ساتھ تبصرے کیے گئے۔ رسں رابطے میں مختلف الخیال اہلِ قلم کی خط بجتی نے بہت لطف دیا۔ افسانے تقریباً سبھی معیاری تھے مگر جوگیندر پال، گلزار جاوید اور عابدہ تقی کے افسانوں نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

پرویز ساحر

بھائی گلزار جاوید۔ سلام مسنون

آپ نے دیویندر اسر کا گوشہ پڑھوا کر میرے علم میں اضافہ کیا ہے میں نے کبھی کچھ کہانیاں پڑھی تھیں جن کا کوئی تاثر ذہن میں موجود نہیں تھا لیکن آپ نے گوشہ ترتیب دے کر اس بھولے بسرے تاثر کو از سرِ نو تازہ کر دیا۔ خاص طور سے آپ کے بے لاگ سوالات نے اس تاثر کو زیادہ اہم اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

دیویندر اسر نے اپنے مضمون "زمانہ بیت گیا" میں اپنے آپ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ادب اور سیاست کے تعلق سے یہ کہنا بے حد اہمیت کا حامل سہی لیکن اس میں اختلافِ رائے کی گنجائش موجود ہے۔ دیویندر اسر کہتے ہیں کہ: "جب ادب سیاست کا وسیلہ بن جاتا ہے تو وہ اپنی تخلیقی توانائی کھو دیتا ہے"

جبکہ دیگر سیاست کو ادب سے خارج نہیں کرتا بلکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ اقتصادی، معاشی اور سیاسی احوال ادب میں جس قدر زیرِ پردہ ہوں گے ادب اتنا ہی لطیف ہوگا۔ بہر حال "خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی"۔

اس شمارہ میں منظوم حصہ خوب سے خوب تر ہے لیکن شگفتہ نازلی کی نظم "ساتویں کربلا" میں بعض مصرعے وزن کے اعتبار سے قابلِ غور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض الفاظ اپنے صحیح تلفظ کے ساتھ نظم نہیں ہو سکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اسباب کیا ہیں، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ یا خود شگفتہ نازلی اس کی ذمہ دار ہیں۔ بہر حال کہیں نہ کہیں کوئی کوتاہی واقع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ "چہارسُو" جولائی اگست کا شمارہ حسبِ روایت گوشے کی عالمانہ ترتیب اور صاحبِ گوشہ کے تبحرِ علمی کے استفادے کے مواقع فراہم ہوئے۔ میں آپ کی بے لوث ادبی خدمات پر تبریک پیش کرتا ہوں۔ آپ کا سفر بہتر سے بہترین کی طرف مائل ہے اور یہ ایک ایسی خوبی ہے کہ جس کو برقرار رکھنے میں پتہ پانی ہو جاتا ہے لیکن آپ کی سخت جانی قابلِ ستائش ہے کہ چہارسُو کا ہر شمارہ دستاویزی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ میں آپ کی اولوالعزمی کا صدقِ دل سے قائل ہوں۔

مشتاق شبنم